پاکستانی زبان وادب

مسائل و مناظر

ڈاکٹر معین الدین عقیل

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

پاکستانی زبان و ادب

مسائل و مناظر

اقبال مجددی صاحب کے لیے
منجانب : معین الدین عقیل
دسمبر ۱۹۹۸

ڈاکٹر معین الدین عقیل

الوقار پبلی کیشنز
۵۰- لوئر مال لاہور

جملہ حقوق محفوظ

131111

سالِ اشاعت : ۱۹۹۹ء

ناشر : سید وقار معین

طابع : گنج شکر پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت : ۳۲۵/- روپے

ترتیب:

معروضہ

زبان

(۱) قومی زبان کی صورت حال- ادارتی معروضات 15

۱- اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال

۲- نسخ یا نستعلیق

۳- مادری زبان

۴- ایک بڑا المیہ

۵- انگریزی زبان کی تدریس

۶- نفاذ اردو

۷- ہماری ذمے داری

۸- زبان کا مزاج' ہماری بے احتیاطی

۹- ذرائع ابلاغ کا منفی کردار

۱۰- ہم نے کیا کھویا

۱۱- ۱۴ - اگست کے تقاضے

۱۲- شہری ترقیاتی اداروں کا فرض

۱۳- شہروں' سڑکوں' عمارتوں کے انگریزی نام

۱۴- نوشتہ دیوار

۱۵- تازہ غلامی

(۲) قومی زبان کا نفاذ ----- ہم کہاں رہ گئے ؟ 87

(۳) روزنامہ "جنگ" : زبان و ادب کا محل نظر رویہ 95

(۴) فطری سائنس کی اصطلاحات کے مسائل ۱۰۳
(۵) فروغ لسانیات کی ضرورت ۱۱۹
(۶) ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی لسانی خدمات ۱۲۵

ادب

(۷) پاکستان میں اردو ادب : محرکات و مسائل ۱۳۵
(۸) نثری نظم ----- جواز اور عدم جواز ۱۴۴
(۹) "دست تہ سنگ" کی غزلیں ۱۵۱
(۱۰) طنز و مزاح کے دس سال ۱۶۳
(۱۱) فروغ بادہ اقبال --- ماہر القادری ۱۸۷
(۱۲) شوقی کا آئینہ اعتبار ۱۹۷
(۱۳) وطن کا قرض : اردو افسانہ اور پاکستانیت ۲۳۷
(۱۴) علم و ادب کی موجودہ کساد بازاری ۲۴۶
(۱۵) مطالعے : ۲۵۴

۱- پندار غزل
۲- منجدھار
۳- نمود
۴- مضراب
۵- نظمانے
۶- کاکولیات
۷- بلوچی ادب
۸- حرف حرف تیشہ
۹- گندم نما
۱۰- تاریخ اور کائنات --- میرا نظریہ

تحقیق

(۱۶) پاکستان میں اردو تحقیق ---ایک سرسری جائزہ ۲۹۷
(۱۷) جامعاتی تحقیق : چند مسائل اور تجاویز ۳۱۱
(۱۸) مصنفین اردو کالج، کراچی ۳۴۲
(۱۹) جائزے : ۳۶۷

۱- تعلیقات خطبات گارساں دتاسی
۲- تحقیقی مجلہ : "تحقیق"
۳- اشتیاق حسین قریشی یادگاری مجلدہ
۴- خفتگان کراچی
۵- تاریخ تناولیاں
۶- سیدان بادشاہ گر
۷- تذکرہ مصنفین درس نظامی
۸- انتخاب گنج شریف
۹- کتاب شناسی
۱۰- تاریخ مشغلہ
۱۱- اسلامی کتب خانے
۱۲- غالب اور عصر غالب
۱۳- اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ
۱۴- اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر
۱۵- حیات اقبال کے چند مخفی گوشے
۱۶- اقبالیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معروضہ

زیر نظر کتاب میری ان تحریروں کے ایک انتخاب پر مشتمل ہے، جو گزشتہ تین دہائیوں کے عرصے میں شائع ہوئیں۔

ان تحریروں کے موضوعات و مباحث کا تعلق :

(۱) پاکستان میں اردو زبان کی صورت حال اور بطور قومی زبان اس کو پیش آنے والے مسائل

(۲) پاکستان میں تخلیق پانے والے ادب، اور

(۳) پاکستان میں تحقیق کی صورت حال اور اس کے مسائل

سے ہے ----- اور اس لحاظ سے یہ تحریریں پاکستان کی لسانی صورت حال، ادبی تخلیقات اور تحقیقی کاوشوں کے مطالعے و جائزے پر مشتمل ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت برادر مکرم ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کی محبتوں اور عزیزی وقار معین سلمہ، کی محنت و مستعدی کے باعث ممکن ہو رہی ہے۔ میں ان کرم فرماؤں کا بے حد ممنون ہوں۔

عقیل

ٹوکیو

۹ نومبر ۱۹۹۸ء

پروفیسر اسادا یوتاکا' پروفیسر سوزو کی تاکیشی' پروفیسر کتاؤ کا ہیرو جی اور فو کا ماچی ہیرو کی

کے نام

جو جاپان میں اردو اور پاکستان کے وسیع تر تعارف کا وسیلہ ہیں' اور جن سے ان تین دہائیوں پر مشتمل اپنے روابط میں ----- اردو اور پاکستان سے نسبت و محبت کو میں نے ان کے وجود کے اضافی عناصر کے طور پر پایا۔

معین الدین عقیل

قومی زبان کی صورت حال

مقتدرہ قومی زبان کا قیام ---- پاکستان میں قومی زبان کے نفاذ کی رفتار کو تیز تر کرنے اور اسے تمام ضروری سہولتوں کے ساتھ رائج کرنے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ اپنے قیام کے آغاز میں اس ادارہ نے پورے خلوص کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے ہیں اور اس کے قیام نے قوم کے ان درد مند افراد کو، جو ملک میں قومی زبان کے نفاذ کے خواہش مند رہے ہیں، امید کی نئی روشنی دی تھی۔ ایسے افراد اس ادارہ کی کارگزاریوں اور ان کے نتائج کے بارے میں جاننے کے مشتاق بھی رہے ہیں۔ یہ دراصل اس بات کا مظہر تھا کہ ہماری قوم کا حساس اور باشعور طبقہ قومی زبان کے نفاذ سے کس قدر دلچسپی رکھتا ہے۔ مقتدرہ کو بھی قومی زبان کے تعلق سے قوم کی امنگوں اور دلچسپیوں کا مکمل احساس رہا ہے۔ "اخبار اردو" کا اجرا دراصل اسی احساس کے ماتحت تھا کہ اس کے ذریعے نہ صرف قوم کے سامنے مقتدرہ کی کارگزاریوں اور نتائج کو پیش کیا جائے، بلکہ اس طرح رابطہ کا ایک وسیلہ بھی پیدا کیا جائے اور مقتدرہ قوم کے باشعور طبقے سے تجاویز اور مشوروں کی صورت میں رہنمائی حاصل کر سکے اور ان افراد اور اداروں کے لیے، جو قومی زبان کے نفاذ اور اس کے رواج کے لیے کوشاں ہیں، ممکنہ تعاون فراہم کر سکے۔

اپنے مقاصد کے تحت اس جریدہ نے قومی زبان کے نفاذ سے دلچسپی رکھنے اور اس

کے لیے تدابیر اختیار کرنے والوں کے درمیان رابطے کا ایک مفید کام بھی انجام دیا اور اس کے ذریعے نفاذ اردو کی راہ میں متعدد آسانیاں بھی پیدا ہوئیں۔ اس نے اگر ایک طرف عوام، حکومت اور مقتدرہ کے درمیان رابطہ کو استوار کیا' دوسری طرح قومی زندگی اور امور مملکت میں قومی زبان کی اہمیت' اس کے رواج اور استعمال میں وسعت کی موثر کوششیں بھی کیں۔ اس طرح اس کے اثرات قومی زبان کے نفاذ کے نقطہ نظر سے اپنے آغاز میں نہایت مفید اور بار آور ثابت ہوئے۔ قومی زبان کے نفاذ' اس کے مسائل ' لسانی مباحث اور دیگر متعلقہ موضوعات پر اس میں جو مفید' پر مغز اور فکر انگیز تحریریں شائع ہوئیں' ان کی وجہ سے اس جریدے نے ملک میں ایک بڑے خلا کو پر کیا۔ اس اعتبار سے اردو میں اس کی حیثیت تاریخی اور افادی ہے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے اس جریدے کے آغاز سے اپریل ۱۹۸۳ء تک، جب تک کہ یہ کراچی سے شائع ہوتا رہا' مدیر (اعزازی) کے فرائض انجام دیے۔ اس عرصہ میں مجھے ---- خصوصاً ادارتی معروضات لکھنے میں' اکابر مقتدرہ کا مکمل اعتماد حاصل رہا۔ اس زمانہ ادارت میں جو ادارتی "معروضات" شائع ہوئے' یہاں ان کا ایک انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال

اردو ایک ایسی کشادہ دل زبان ہے، جس کی فطرت اور جس کا مزاج اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی تشکیل میں مختلف زبانوں کا حصہ ہے۔ اس میں ہمیشہ مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہے ہیں اور ان الفاظ نے وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان میں اپنی ایک مستقل جگہ بنا لی ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کی یہ آمیزش اس میں اس حد تک ہوئی ہے کہ اگر ایسے تمام الفاظ کو اس میں سے نکال دیا جائے تو باقی شاید کچھ نہ رہے۔ گو اس زبان کی بنیاد اور اس کے حروف و افعال تو ہندی الاصل ہیں لیکن اس نے فارسی زبان کی عظیم الشان روایتوں کے زیرِ اثر ترقی کر کے اپنے مخصوص مزاج اور رنگ و آہنگ کی تشکیل کی ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی ایک فطری زبان ہے کہ اس نے زبان کے ارتقائی اور تاریخی تقاضوں کو بھی کما حقہ' پورا کیا ہے۔ یعنی گزشتہ کئی صدیوں میں اس نے ان تمام اثرات کو، جو برعظیم پاک و ہند میں رونما ہوتے رہے ہیں، قبول کیا ہے اور ان کے زیرِ اثر اپنا رنگ و آہنگ کچھ اس طرح تبدیل کیا ہے کہ ہندی اور بھاشا کا اثر اس میں کم نظر آتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اپنے ارتقائی مراحل میں اس نے فارسی، عربی، ترکی، انگریزی اور

بعض یورپی زبانوں کے بے شمار الفاظ کو اپنے اندر شامل کیا اور ان کی مخصوص صورتوں کو اپنے مخصوص آہنگ میں اس طرح ڈھال لیا کہ ان میں سے اکثر اب اجنبی اور نامانوس اور دوسری زبانوں کے الفاظ محسوس نہیں ہوتے۔

اردو زبان میں دوسرے الفاظ کی آمیزش کے پس منظر میں وہ طویل ارتقائی اور تاریخی عمل کار فرما ہے، جس میں سے خود برعظیم پاک و ہند اور اس زبان کے بولنے والوں کو گزرنا پڑا ہے۔ مسلمانوں کے زیر اثر خصوصاً فارسی اور عربی نے اس کی تشکیل اور توسیع میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اسی طرح ایک طویل عرصہ سے انگریزوں اور انگریزی زبان کے زیر اثر رہنے کی بنا پر اس نے انگریزی زبان سے بھی واضح اثرات قبول کیے ہیں۔ اثر اندازی کا یہ عمل جہاں فطری لحاظ سے ہوتا رہا، وہاں اس کے لیے کچھ ارادی اور غیر فطری کوششیں بھی کی گئیں۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خاں اور ان کے بعض رفقاء نے انگریزی الفاظ کو جس طریقہ سے مصلحتہً استعمال کرنا شروع کیا تھا، وہ زبان کے مزاج کے اعتبار سے غیر فطری تھا۔ اس لیے انھیں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ ان الفاظ کے یا تو متبادل اردو الفاظ موجود تھے یا وہ الفاظ اردو کے صوتی آہنگ سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ جب کہ اسی دور میں انگریزی زبان کے بعض الفاظ اردو میں اس طرح رائج ہوئے کہ اب وہ اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔

وہ الفاظ جو معنی اور صوتی آہنگ کے لحاظ سے قبولیت عام حاصل کر لیں، زبان کا ایک مستقل حصہ بن جاتے ہیں اور ان کی اجنبیت کا تاثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ یہ فطری عمل آج بھی جاری ہے ---- لیکن کچھ عرصہ سے ہماری تہذیب و معاشرت میں مغربیت کی شدید بھرمار کے ساتھ ساتھ اس عمل میں بڑی ناگوار حد تک اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس عمل نے جو اب

سراسر غیر فطری حدود اختیار کر رہا ہے' اردو کے خدوخال ہی بدل کر رکھ دیے ہیں۔ اگر زبان میں اخذ و قبول کا رجحان فطری اصول کے تحت انجام پائے تو زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہی رجحان غیر فطری اصول اختیار کرلے تو اس سے نہ صرف زبان بگڑ جاتی ہے' بلکہ اس کا فطری حسن' مزاج اور تشخص متاثر ہوتے ہیں۔ اردو کے ساتھ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ معاشرے پر اس تہذیب کا غلبہ ہے جس کو انگریزی زبان سے خاص نسبت حاصل ہے۔ یہی زبان ہمارے معاشرے میں بلند سماجی مرتبہ کا تعین کرتی ہے' سرکاری اور دفتری زبان بھی یہی ہے' تعلیم میں بھی اسی کی بالادستی قائم ہے اور ہمارے سارے ماحول پر بھی اسی کی جلوہ نمائی ہے۔ اس صورت حال میں ہم ہر لمحہ انگریزی زبان اور اس کے الفاظ کے زیر اثر رہتے ہیں۔ اس کا کوئی لفظ استعمال کیے بغیر نہ گفتگو میں ہمارا کوئی جملہ مکمل ہوتا ہے نہ ہم کوئی عبارت لکھ سکتے ہیں۔ یہ المیہ تقریباً سب ہی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر لفظ کا اپنا ایک تہذیبی پس منظر ہوتا ہے۔ جب ہم کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے ذریعہ ہم ایک تہذیب کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اس طرح انگریزی الفاظ کے استعمال سے ہمارا تہذیبی تشخص بھی متاثر ہو رہا ہے۔ اگر انگریزی زبان کی اثر اندازی اور ہماری غلامانہ ذہنیت کا یہ رویہ برقرار رہا تو اندیشہ ہے کہ انگریزی الفاظ کو اس طرح استعمال کرنے کی روش سے اردو اپنے تمام فطری محاسن سے عاری ہو جائے گی اور اس کے ساتھ پاکستان اور مسلمانوں کا جو تشخص وابستہ ہے' وہ معدوم ہو جائے گا۔

آج ہماری زبان میں جس طرح انگریزی زبان کے الفاظ داخل ہو رہے ہیں اور ہم انھیں بے محابہ گفتگو اور تحریر میں استعمال کر رہے ہیں' اس کی ایک بڑی وجہ ہمارا احساس کمتری ہے۔ یہی احساس کمتری ہمیں نقالی (فیشن) پر آمادہ کرتا ہے' جس کی ابتدا سہل پسندی سے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں کسی

انگریزی لفظ کے ہم پلہ اور متبادل اردو کا کوئی لفظ تلاش کرنے میں دشواری پیش آتی ہے اور بحالت مجبوری مکمل ابلاغ کے لیے ہم انگریزی لفظ ہی استعمل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم چاہیں تو جملے کی ساخت اور ترتیب میں تبدیلی پیدا کرکے دوسری طرح مفہوم ادا کرسکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ کسی انگریزی لفظ کا کوئی اردو متبادل لفظ دستیاب نہیں ہے' سراسر کم علمی پر مبنی ہے۔ جس انگریزی لفظ کو ہم مکمل ابلاغ کے لیے ضوری سمجھتے ہیں' اسے ضوری اور مناسب دراصل ہمارے ہی استعمل نے بنایا ہے۔ اسے بار بار استعمل کرکے ہم اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی ذہنی اور جذباتی وابستگی پیدا کر لیتے ہیں' چنانچہ اس کی جگہ اگر اردو کا کوئی عین متبادل لفظ بھی ملتا ہے تو انگریزی لفظ سے سابقہ ذہنی وابستگی وہاں آڑے آتی ہے۔ اس کا صرف یہی علاج ہو سکتا ہے کہ ہم انگریزی لفظ کا متبادل اردو لفظ استعمل کرنا شروع کردیں تو وہ بھی ایک دن مکمل ابلاغ کا حامل بن جائے گا۔

انگریزی الفاظ کے بلا روک ٹوک استعمل سے اردو کے لیے جو نازک اور ناگوار صورت حل پیدا ہو گئی ہے اس کا تدارک ذرا بھی مشکل نہیں۔ ہم اگر یہ طے کرلیں کہ کوئی ایسا انگریزی لفظ' جس کا متبادل اردو لفظ موجود ہے' استعمل نہیں کریں گے' چاہے اس کے لیے ہمیں اپنا جملہ ہی تبدیل کردینا پڑے یا اردو لفظ وضع کرنا پڑے۔ کیونکہ ہم بعض اوقات غیرارادی طور پر بھی انگریزی الفاظ استعمل کرجاتے ہیں۔ ہم انگریزی الفاظ سے پاک اردو ہی استعمل کریں گے' تو یہ ایک ایسا کام ہے جو انفرادی سطح پر بڑی آسانی کے ساتھ انجام پا سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی تحریک' تنظیم اور سہارے یا عرصاد ردت کی مطلق ضورت نہیں۔

(۲)

زندگی کے عام معمولات اور گفتگو کے ساتھ ساتھ ہماری علمی اور ادبی تحریروں میں بھی انگریزی کے متعدد الفاظ' فقرے بلکہ جملے نظر آنے لگے ہیں۔ یہ صورت حال اگرچہ ہمارے علوم اور ہمارے ادب میں گزشتہ نصف صدی سے نمایاں ہے لیکن اب صاف نظر آتا ہے کہ اس میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ انگریزی زبان کی علمی اور ادبی اہمیت اور مغربی علوم کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' لیکن اگر ہمارے لکھنے والے انگریزی زبان سے اتنے مرعوب رہیں کہ انگریزی کے خیالات اور انگریزی کی اصطلاحات تک کو معیار سمجھ کر اپنے ادب اور اپنی تصانیف میں استعمال کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ خیالات اور اسلوب کی دلکشی برقرار نہیں رہ سکتی اور اس طرح اردو زبان کے خصائص و امتیاز متاثر ہوں گے۔

اردو زبان میں ادب اور علوم کی متعدد اصطلاحات ایسی استعمال ہونے لگی ہیں جن کی متبادل اصطلاحات اردو میں موجود ہیں لیکن کچھ لکھنے والوں کو ان سے رغبت معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے مقابلے میں انگریزی کے الفاظ اور اصطلاحات بڑے ناگوار طریقے سے استعمال کی جارہی ہیں۔ دراصل انگریزی ہمارے مزاجوں پر اس حد تک مسلط ہوگئی ہے کہ ہم غیرشعوری طور پر بعض ایسے الفاظ روانی کے ساتھ استعمال کرتے چلے جاتے ہیں' جن کا استعمال اگر محسوس کیا جائے تو خود استعمال کرنے والوں کو بے ہنگم اور بھونڈا معلوم ہوگا۔ وہ محسوس نہیں کرتے کہ اس سے ہمارا قومی تشخص اور زبان و اسلوب کس طرح مجروح ہوتے ہیں۔ اردو نے دیگر زبانوں کے ساتھ اپنے فطری تصادم اور اتصال کے نتیجہ میں جو الفاظ اخذ کیے' انھوں نے اپنی شکل کچھ ایسی

بدلی کہ وہ اردو زبان کے الفاظ بن گئے۔ اس صورت حال نے اردو زبان میں یہ روایت مستحکم کر دی کہ وہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے سانچے میں ڈھالے اور اپنے مخصوص رنگ میں رنگ کر ان کی شکل تبدیل کر دے۔ اردو کے اس مزاج کو دیکھتے ہوئے اگر ہم قمیض کی جگہ "شرٹ" استعمال کریں تو ظاہر ہے کہ یہ اردو سے اپنے صوت و آہنگ کے لحاظ سے مختلف نظر آتا ہے۔ حالانکہ "شرٹ" کی طرح قمیض بھی اردو کا لفظ نہیں ہے' یہ پرتگالی زبان کا لفظ کہا جاتا ہے۔ کوٹھی اور عمارت کی جگہ بلڈنگ کا لفظ اب بہت استعمال ہو رہا ہے لیکن ہے یہ اردو میں جذب ہونے والا نہیں ہے۔ حالانکہ کوٹھی بھی اردو زبان کا لفظ نہیں ہے' لیکن اس نے اپنے آپ کو اردو میں اس طرح شامل کر لیا ہے کہ اب وہ غیر زبان کا لفظ ہی معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسے الفاظ جو اردو کے آہنگ اور تلفظ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے' انھیں استعمال کرنا غیر فطری اصول کے تحت ہے۔ اسی طرح جب اردو میں بامعنی اور بھرپور الفاظ جیسے سڑک اور گلی موجود ہیں تو ان کے بجائے انگریزی الفاظ روڈ اور اسٹریٹ استعمال کرنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ اس طرح علمی اور ادبی تحریروں میں انگریزی الفاظ کو داخل کرنے کی کوئی غیر معقول کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ سرسید احمد خاں' حالی' نذیر احمد' شبلی وغیرہ کی تخلیقات میں انگریزی کے الفاظ اکثر مقامات پر ناگوار ہی محسوس ہوتے ہیں۔ تخلیقی اصناف میں سے ناول اور افسانہ میں بعض جدید مصنفین نے اس رویہ کو عام کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے اسلوب کو قبولیت عام حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ ایسے بعض مصنفین کے اسلوب میں خوش گوار تبدیلی کا اظہار بھی ہوا ہے۔ اصناف شاعری میں خصوصاً جدید نظم میں بھی انگریزی الفاظ کو استعمال کرنے کی روش عام ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ یہ سب باتیں خیالات کی اثر پذیری کے ساتھ ساتھ اظہار میں "فیشن" پرستی کے رویہ

131111

کو ظاہر کرتی ہیں۔

نقالی یا "فیشن" کی یہ رو اہل علم و ادب کے احساس کمتری اور ان کی سہل پسندی کی وجہ سے عام ہوئی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی زبان سے ایک حد تک واقف ہے۔ نیز بین الاقوامی حیثیت کی مالک ہونے کی وجہ سے انگریزی زبان میں دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے تراجم بھی مل جاتے ہیں' ہمارے اہل علم جب ان سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ بالعموم اصطلاحات' مرکبات اور محاورات وغیرکو اردو میں ڈھالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اکثر انھیں انگریزی الفاظ ہی میں لکھ دیا جاتا ہے۔ پھر اس رویہ میں سہل پسندی کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنی علمیت اور مطالعہ کی وسعت سے مرعوب کرنے کی کوشش بھی صاف نظر آتی ہے۔ نئے لکھنے والے جب اس صورت حال کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی اس رویہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گفتگو کی طرح اب ہماری تحریر بھی انگریزی الفاظ کی بلا روک ٹوک آمیزش سے آلودہ ہوتی جا رہی ہے اور اس کا فطری حسن آہنگ اور اسلوب بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ اس طرح اردو زبان و ادب کے لیے ایک ناگوار صورت حال پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

یہاں اس بات کا تو منطقی جواز ہو سکتا ہے کہ زبان کی فطری نشوونما اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لیے نئے الفاظ کی تلاش اور اخذ و قبول کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے لیکن اس طرح کے الفاظ زبان میں یوں مدغم ہو جانے چاہئیں کہ وہ زبان کے بنیادی مزاج سے الگ محسوس نہ ہوں' لیکن اس بات کا کوئی منطقی جواز نہیں ہو سکتا کہ محض سہل پسندی اور رسم نقالی (فیشن) کے تحت اپنی زبان کو غیر فطری آلودگی سے ناگوار بنا لیا جائے۔

اب جب کہ یہ صورت حال عام نظر آتی ہے' اس کا تدارک کئی

صورتوں میں ممکن ہے:

ایک تو یہ کہ اردو میں انگریزی الفاظ کے اندھا دھند استعمال کو روکنے کی صلاحیت میں اضافہ کریں۔ اردو میں الفاظ کا ذخیرہ کسی بھی بڑی سے بڑی اور علمی زبان سے کم نہیں ہے۔ نئے الفاظ اور اصطلاحات ضرور اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ انھیں اردو کے قالب میں ڈھالا جائے۔ یہ اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم انھیں اردو کا قالب عطا کرتے ہیں یا انھیں بعینہٖ استعمال کر لیتے ہیں۔ یا تو اردو میں کوئی نہ کوئی مناسب لفظ یا الفاظ پہلے ہی سے موجود ہوں گے یا پھر انھیں نئی صورتیں دے کر مفہوم پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ابتداء میں انفرادی سطح پر اس طرح کے استعمال سے اختلاف رائے تو ممکن ہے لیکن مکمل ابلاغ کی صلاحیت رکھنے والے لفظ کو یقیناً قبول عام حاصل ہو جائے گا۔

دوسرے یہ کہ ادب کی تخلیقی اصناف میں انگریزی جملوں اور فقروں کو نقل کرتے ہوئے مصنف حضرات کی یہ دلیل کہ اس طرح صورت حال اور کرداروں کی صحیح عکاسی ہوتی ہے' محض ایک تاویل اور غلط فہمی ہے۔ اسے دور ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک قلمکار زندگی کا محض عکاسی ہی نہیں ہوتا' نقاد اور مدیر و مصلح بھی ہوتا ہے۔ اس کا منصب واقعات اور کرداروں کو ان کے مختلف پہلوؤں اور مختلف مسائل کے ساتھ دیکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ان واقعات اور کرداروں اور قاری کے درمیان ایک وسیلہ بھی ہوتا ہے اور زبان اس کا وسیلہ اظہار ہوتی ہے۔ واقعات اور کردار قاری سے بلا واسطہ گفتگو نہیں کرتے اور نہ وہ خود قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اہل قلم انھیں جس طرح چاہے پیش کر سکتا ہے۔ جس طرح ایک قلمکار زندگی کے منتخب

موضوعات میں نئی توانائی پیدا کرنے کے لیے مختلف عناصر سے کام لیتا ہے اور ان میں فنی لحاظ سے ضروری نظم و ترتیب اور حسن و سلیقہ پیدا کرتا ہے ---- یہی کام وہ زبان کے ساتھ بھی انجام دے سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اردو میں انگریزی الفاظ کا بے محابہ استعمال جس صورت حال کے نتیجہ میں ہو رہا ہے اس کا سد باب ہونا چاہیے۔ ہماری قومیت، ہماری تہذیب اور ہماری زبان کے تشخص کا تقاضہ ہے کہ ہم تعلیم میں اور معاشرہ میں انگریزی زبان کی بالادستی اور جلوہ فرمائی کے گرد ایسی دیواریں تعمیر کر دیں کہ اس سے محض ایک جائز حد تک استفادہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ تعلیم اور تمام سرکاری اور معاشرتی شعبوں میں اردو کو مکمل طور پر رواج دیا جائے۔ صورت حال کی اس تبدیلی کا اثر زبان پر بہت واضح ہو گا اور زبان اپنے فطری حسن و آہنگ سے عاری نہیں ہو سکے گی۔

ذرائع ابلاغ اس بارے میں نہایت موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کی غیر فطری آمیزش پچھلے چند سالوں میں ناگوار حد تک اخباری سطح پر رواج پانے لگی ہے۔ بعض اخبارات، جن انگریزی الفاظ کے مترادفات اردو میں مقبول ہو چکے ہیں، انھیں قبول کر لینے کے باوجود ان کے انگریزی متبادل استعمال کیے بغیر نہیں رہتے۔ حکومت بھی روزانہ ہزاروں الفاظ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے وسیلہ سے عوام تک پہنچاتی ہے، یہ الفاظ چونکہ عوام کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے اثر و قبول کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ حکومت اگر خود صرف اردو الفاظ کو استعمال کرے اور اپنے ماتحت ذرائع ابلاغ کو ہدایت کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ عوامی سطح پر اردو

مترادفات کو نہ صرف جلد قبولِ عام حاصل ہو جائے، بلکہ انگریزی کے غیر ضروری الفاظ کا استعمال بھی بند ہو جائے۔

("اخبار اردو" اگست تا ستمبر، ۱۹۸۱ء)

نسخ و نستعلیق

اردو کے نفاذ اور نصابی کتب کے تعلق سے ہمارے ہاں مختلف وقتوں میں خط نسخ اور نستعلیق میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے بارے میں اکثر بحث چلتی رہی ہے' جو ظاہر ہے ایک سعی لا حاصل ہے۔ اس لیے کہ نسخ اور نستعلیق دونوں اپنے رسم الخط ہیں اور دونوں اپنا اپنا مقام اور اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں نسخ مشین کاری میں آسانی سے استعمال ہو سکتا ہے وہاں نستعلیق اپنی سادگی اور حسن کاری میں جواب نہیں رکھتا۔ یہ بحث وہ لوگ کرتے ہیں جو قومی زبان کی تیز تر ترویج اور اشاعت میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ہر طرح کے حربے کو جائز اور کار آمد سمجھتے ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے مسلمان بحیثیت مجموعی نسخ اور نستعلیق دونوں سے واقف ہیں اور بقدر ضرورت و سہولت دونوں کو مسلسل استعمال کرتے رہے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارا بچہ جب پڑھنا شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اسے کسی عربی قاعدے سے بسم اللہ کرائی جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں اس کام کے لیے بغدادی قاعدہ مشہور تھا اور آج کل بہت سے جدید قسم کے قاعدے استعمال ہوتے ہیں جس سے بچہ قرآن پاک کی ابتدا کرتا ہے اور عم پارہ پورا ہوتے اسے اردو رسم

الخط سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے اور ان زائد حروف سے وہ واقف ہو جاتا ہے جو عربی میں نہیں ہیں اور اس طرح نہ صرف یہ کہ وہ اردو حروف سے واقف ہوتا ہے بلکہ اس طرز تحریر سے بھی متعارف ہو جاتا ہے جسے نستعلیق کہتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی خوش خطی کے سبق میں نستعلیق ہی پر چلتا ہے۔ جب تختیوں کا رواج تھا تو مشق بھی نستعلیق کی انھی تختیوں پر کرائی جاتی تھی۔ اس طرح بچہ بغیر ارادہ و ہدایت دونوں خطوط سے واقف ہو جاتا تھا اور اسے محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ نسخ اور نستعلیق ایسے رسم الخط ہیں جن کو بنانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ گویا ہمارے ملک میں صرف دو رسم الخط ہیں جو اس وقت سارا کام کر رہے ہیں۔ تحریر میں اور طباعت میں نسخ و نستعلیق دونوں سہولت اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔ یہ مسئلہ اگر ہے تو صرف ان لوگوں کا ہے جو اسے مسئلہ بنانا چاہتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کہ بوجوہ چند نصابی کتب کو نسخ رسم الخط میں لکھا جانا ضروری سمجھا گیا اور صاحبان حل و عقد نے یہ غور نہیں فرمایا کہ نسخ تحریری ہاتھ سے معمولی خط و کتابت کے لیے آسان تحریر نہیں ہے۔ ہاتھ سے تحریر عمدگی کے ساتھ نستعلیق کے ذریعہ ممکن ہے جس میں روانی بھی ہے اور آسانی بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں کے والدین نے شکایت شروع کی اور اس پر ہنگامہ ہوا اور بجا ہنگامہ ہوا کہ بچوں کی تحریر برباد ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب تبدیلی کا ذکر سننے میں آ رہا ہے تو جو بھی تبدیلی ہو اس پر اس طرح غور ہو کہ اردو کے عمومی نفاذ میں' اس سے تیزی ہو' رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

شروع میں کسی خاص خط کو مستقلاً" نہیں اپنایا گیا۔ کبھی نسخ کا انتخاب کیا گیا اور کبھی نستعلیق کا۔ کبھی ایک ہی نصابی کتاب نصف ستعلیق میں چھاپی گئی اور نصف نسخ میں۔ اس ضمن میں یکسانیت کے نہ ہونے کا یہ نتیجہ نکلا

کہ نہ تو طلباء کسی خط پر عبور حاصل کر سکے نہ طباعت کا کام فروغ پا سکا۔ بلکہ یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ نسخ اور نستعلیق کے انتخاب کے مسئلے نے اردو کی اشاعت میں ایک حد تک رکاوٹ بھی ڈالی ہے اور اسی بنیاد پر اس طبقہ کو جو اردو کا نفاذ نہیں چاہتا' حیل و حجت اور رکاوٹیں پیدا کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ حالاں کہ یہ مسئلہ نہ اردو کے نفاذ کے راستے میں اور نہ نصابی کتابوں کے تعلق سے کوئی اہمیت رکھتا ہے۔

جہاں تک طباعت کا تعلق ہے ---- ہم نسخ اور نستعلیق دونوں کے ساتھ مختلف مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں نے کبھی نستعلیق کو اور کبھی نسخ کو ترجیح دی ہے۔ لیتھو' آفسٹ یا بلاک کی طباعت میں نستعلیق ہی کا رواج زیادہ ہے۔ ٹائپ کے لیے نسخ زیادہ مناسب اور سہولتوں کا باعث ہے' اس لیے یہی مقبول ہوا۔ دستی کمپوزنگ کے لیے نستعلیق ٹائپ بھی ایجاد ہوا تھا اور ایک زمانہ میں نستعلیق ٹائپ کی کتابیں شامل نصاب بھی ہوتی تھیں' لیکن یہ زیادہ وقت لیتا تھا اور جگہ بھی زیادہ گھیرتا تھا اور اس کے الگ الگ جوڑ بھی بدنما نظر آتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ٹائپ جس شکل میں بھی تیار کیا گیا' یعنی نسخ کی جو بھی شکل تھی اسے وہ مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جو نستعلیق کی تھی' کیونکہ نستعلیق فن خطاطی کا شاہکار ہے' اس لیے یہ کوشش ہمیشہ ہوتی رہی کہ نستعلیق ٹائپ بھی ایجاد کیا جائے اور یہ ٹائپ ایجاد ہوا اور متعدد کتابیں اس میں شائع ہوئیں اور مقبول بھی ہوئیں۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ اس میں تقریباً چار سو ٹکڑے حروف کے تھے تب کہیں نستعلیق کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس طرح ریاست حیدر آباد میں نستعلیق کی دلچسپی کے سبب ایک ٹائپ رائٹر بھی نستعلیق کا بنوایا گیا جس کا نام "سلیم حداد" تھا۔ سلیم حداد میں نستعلیق جیسے حروف تو تھے' لیکن اس حسن کو پیدا کرنے کے

لیے دو کی جگہ تین کھٹکے دبانے پڑے تھے۔ گویا اس میں حروف کے لیے تین کرسیاں تھیں جس سے ظاہر ہے کہ تیز کام نہیں ہو سکتا تھا' چنانچہ اسے بھی ترک کرنا پڑا' اور یہی خاص سبب تھا نسخ کی مقبولیت اور ضرورت و اہمیت کا۔

پاکستان میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اگر اردو کو حروف نسخ میں لکھا جائے تو اس کو سندھی' پشتو اور عربی وغیرہ سے قربت حاصل ہو جائے گی اور ملک میں یک جہتی کا آغاز ہو گا۔ یہ شاید اس وقت ہو جاتا اگر خاص اردو کے حروف مثلاً پ' ڈ' چ وغیرہ کی شکلیں صوبائی زبانوں میں بھی ایسی ہی ہوتیں' جو نہیں ہیں۔ اس لیے وہ مراد تو پوری نہیں ہوئی لیکن اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ برقیاتی دور نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ نستعلیق اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ مشینوں سے چھاپا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ نوری نستعلیق اب طباعت میں استعمال ہونے لگا ہے اور یہ زمانہ ہی بتا سکے گا کہ لوگ کس رسم الخط کو ترجیح دیں گے ۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ایران اور افغانستان میں بھی اس عمل کی پذیرائی ہو جائے۔

نسخ ٹائپ کو اردو والوں نے محض اس لیے قبول نہیں کیا کہ ان کا جمالیاتی مزاج اور ان کی حسن پرستی نستعلیق کی دلکشی اور خوبصورتی کی طرف زیادہ مائل تھی ۔ بلکہ نسخ ٹائپ اور اس کی طباعت کے لیے نہایت سہل اور مناسب ہے۔ نستعلیق حروف ٹائپ رائٹر کی کلید کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ وہ طباعت کی جدید مشینوں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے۔ اس کے دائرے' شوشے' کرسی اور نشست قائم رکھنے کے لیے ٹائپ کے اتنے جوڑوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ تیز رفتاری پیدا نہیں ہوتی' پھر اس کے شوشے اور دائرے مشین میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر نستعلیق معمولی مشینوں کے بس سے باہر ہے۔ طباعت میں نستعلیق ایک زمانہ میں اس لیے زیادہ کامیاب رہا کہ

لیتھو کی طباعت کا رواج تھا اور کاتب عبارت کو قلم سے لکھتا تھا مشینی دور میں لیتھو کی چھپائی عام طباعت کے لیے اختیار نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو آج کے لحاظ سے طباعت میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے' دوسرے بڑی تعداد میں اس سے طباعت نہیں ہو سکتی۔ حرف اڑنے لگتے ہیں اور غلطیوں کی اصلاح میں دقت پیش آتی ہے۔ موسم کا اثر بھی پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نستعلیق کے مقابلہ میں نسخ طباعت کے لیے زیادہ سہل اور افادی ثابت ہوا ہے۔

نسخ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہے۔ قرآن کے توسط سے سب مسلمان اس سے آشنا ہیں۔ عربی و فارسی ہی میں نہیں خود اردو میں نسخ کے کامیاب تجربے کیے جا چکے ہیں۔ سید احمد خاں' اپنے مجلّے "اخبار سائنٹی فک سوسائٹی" اور "رسالہ تہذیب الاخلاق" نسخ ٹائپ میں شائع کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا مجلہ "الہلال" اور مولانا محمد علی کا "ہمدرد" جو اپنے زمانہ کے نہایت مقبول جریدے تھے' نسخ ٹائپ میں شائع ہوتے تھے۔ آج کل ایک عرصہ سے متعدد علمی و ادبی ادارے اپنی مطبوعات مستقلاً نسخ ہی میں شائع کرتے ہیں۔ اردو والے دونوں خطوط سے خوب شناسا ہیں۔ دونوں کا لکھنا پڑھنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ لیکن تحریر کی حد تک متفقہ طور پر خط نستعلیق عام ہے۔ نسخ کا تعلق عام تحریر سے ہرگز نہیں۔ بچہ شروع میں نستعلیق سیکھتا ہے اور استعمال کرتا ہے۔ ٹائپ سے بعد میں سابقہ پڑتا ہے اور وہ اسے صرف مطالعہ تک محدود رکھتا ہے۔ قلم نستعلیق کا عادی ہوتا جاتا ہے۔ اور نظریں نسخ کو پڑھتی رہتی ہیں۔ کوئی الجھن اور دقت پیدا نہیں ہوتی۔ یوں کہہ لیں کہ اردو میں نسخ کا تعلق مشین کے ساتھ وابستہ ہے اور نستعلیق کا تعلق قلم سے ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق اسی طرح برقرار رہے گا۔ یہ دونوں خط اردو والوں کے کام آتے رہیں گے۔ بچہ نستعلیق سیکھے گا اور پھر اسی کو اپنے قلم سے لکھتا

رہے گا کہ لکھنے میں یہ رواں اور سہل ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گا کہ سب سے پہلے نستعلیق کی روش سے اسے آشنا کیا جائے۔ بعد میں وہ ٹائپ اور نسخ کی تحریریں بھی پڑھتا رہے گا، جو مشینی تقاضوں کے تحت اس کو پڑھنی ہوں گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح انگریزی والے تحریر اور ٹائپ میں دو الگ الگ خط استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ محال ہے کہ وہ تحریر اور ٹائپ میں ایک ہی طرح کے حروف استعمال کریں۔ اس طرح نہ آسانی رہتی ہے اور نہ روانی۔

ممکن ہے آئندہ وقتوں میں طباعت میں نسخ کی اجارہ داری ہو جائے مگر قلم کی تحریریں نستعلیق ہی میں لکھی جاتی رہیں گی کیونکہ یہ سینکڑوں سال سے ہمارے مزاج میں رچ بس گیا ہے اور یہ رائج اور مقبول عام خط روانی اور سہولتوں کا حامل بھی ہے۔ کچھ عرصہ قبل "نوری نستعلیق کمپوٹری مشین" کی تخلیق سے نستعلیق کے مستقبل کے بارے میں مزید بہتر امکانات نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس مشین کے ذریعہ اخبارات، کتب و رسائل اور تجارتی نوعیت کی طباعت و اشاعت کا کام مہینوں کے بجائے دنوں میں ہو سکے گا۔ اگر یہ مشین عام ہو جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ یہ برقی نستعلیق کتابت خط کے حسن اور تیز رفتاری کے پیش نظر اردو زبان کو فروغ دینے میں مفید اور موثر کردار ادا کرے گی۔

نسخ اور نستعلیق دونوں ہی ہمارے اپنے خط ہیں۔ ان دونوں سے ہمارے گہرے تاریخی اور تہذیبی رشتے استوار ہیں۔ یہ دونوں ہی ہمارے مزاج اور ہمارے جمالیاتی احساس سے عین مطابقت رکھتے ہیں۔ نسخ قرآنی رسم الخط ہونے کی وجہ سے ہمیں عزیز بھی ہے اور ہم بچپن سے اس سے بخوبی آشنا بھی ہوتے ہیں۔ نستعلیق ہمارے سینکڑوں سالہ تاریخی و تہذیبی ورثے اور سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہمارے مزاج سے اس حد تک وابستہ ہے کہ ہماری

عادت بن گیا ہے۔ ہم کسی لحاظ سے ان دونوں خطوں سے خود کو الگ نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی ایک کے ہو کر رہ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے کسی کو اختیار کرنے اور کسی کو اختیار نہ کرنے کی بحث غیر ضروری اور غیر فطری ہے۔

"اخبار اردو" (دسمبر ۱۹۸۱ء)

مادری زبان

زبان فی الحقیقت ایک تہذیبی، معاشرتی اور اکتسابی وسیلہ، اظہار ہے۔ اس کے موروثی اور مادری (عام مفہوم میں) ہونے کے تمام نظریات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کی تشکیل اور اس کا ارتقاء معاشرتی اور تہذیبی عوامل پر منحصر ہوتا ہے۔ معاشرتی عمل ہونے کے لحاظ سے ایک بچہ سب سے زیادہ اس زبان کو سیکھتا ہے جو اس کے ماحول کی عام زبان ہوتی ہے اور جس سے اس کا مستقل واسطہ ہوتا ہے۔ ماردی زبان کی اہمیت کا یہی ایک بڑا سبب ہے کہ اس زبان کے زیر سایہ بچہ.اپنی آنکھ کھولتا ہے اور اپنا بچپن گزارتا ہے۔ یہ محض ایک اولین وسیلہ اظہار ہے اور ایک آسان طرز ادا۔ ورنہ زبان کے اختیار کرنے میں نہ نسل کی کوئی اہمیت ہے نہ نسب کی۔ جو زبان ابتدائے عمر سے عام استعمال میں آتی ہے اور جس سے ایک فرد کا دن رات کا واسطہ رہتا ہے وہی اس کی مادری زبان ہوتی ہے۔ مادری زبان نہ انسان کو ورثہ میں ملتی ہے نہ ماں کے دودھ کے ساتھ بچہ کے جسم میں سرایت کرتی ہے۔

ہر شخص کی مادری زبان دراصل وہ زبان ہوتی ہے جسے وہ زیادہ استعمال کرتا ہے، اس اعتبار سے جغرافیائی، نسلی یا معاشرتی امتیاز ایک ہی ماحول

میں پلنے بڑھنے والے افراد کی زبانوں میں محسوس بھی نہیں ہوتا۔ ایک ہی معاشرے کے پروردہ افراد کی زبانوں میں لہجے، روزمرہ اور محاوروں کے لحاظ سے بھی کوئی فرق نہیں ہوتا، چاہے افراد کا نسلی اور تہذیبی و تاریخی پس منظر مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ اس نقطہ نظر سے مادری زبان اور غیر مادری زبانی کسی تفریق، امتیاز اور تنازع کا سبب نہیں بن سکتیں۔ جس زبان سے ہمارا واسطہ دن رات کا ہوتا ہے اور جو ہماری شخصیت، ہمارے افکار و خیالات اور معاملات زندگی کی تکمیل اور ادائیگی کا سب سے اہم اور ناگزیر وسیلہ ہوتی ہے، دراصل وہی ہماری مادری زبان ہوتی ہے اور وہ ہمارے وجود کا ایک ایسا حصہ بن جاتی ہے جسے ہم اپنی فطرت اور اپنے لاشعور سے الگ نہیں کر سکتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر مادری زبان قومی زبان نہیں بن سکتی۔ یہ بات آج بھی ناقابل تردید ہے اور ماضی میں بھی ایسا ہوا ہے۔ کچھ مادری زبانیں محض بولیوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والوں کو اپنے علمی و تعلیمی تقاضوں کی تکمیل کے لیے کسی نہ کسی بڑی زبان کو اکتسابی عمل کے ذریعے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، کشمیری وغیرہ مادری زبان کی حیثیت سے اپنے اپنے علاقوں میں رائج ہیں لیکن یہ بولیاں بولنے والے سب ہی اردو کو اپنی قومی اور تعلیمی ضرورتوں اور اعلیٰ اظہار کی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

پاکستان میں زبانوں کے تصادم کی کوئی صورت حال یا لسانی تنازع اور کشمکش کا کوئی مسئلہ نہیں۔ لسانی کشمکش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی زبان کسی ترقی یافتہ اہم زبان کو زیر کرنا یا اس کی جگہ لینا چاہتی ہے۔ مثلاً انگریزی جس طرح اردو کو زیر کیے ہوئے ہے اور اس کی جگہ پر قابض ہے اور فقط یہی ہمارے ملک کا ایسا مسئلہ ہے جس کے باعث لسانی اضطراب کی کیفیت

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک نظر آتی ہے۔ اگر انگریزی کے بجائے اردو کو اس کا جائز مقام مل جائے، یعنی جہاں جہاں انگریزی زبان اپنا تسلط رکھتی ہے وہاں اردو کو رائج کر دیا جائے تو نہ صرف اردو بلکہ تمام علاقائی زبانوں کو فروغ اور ارتقاء حاصل ہو گا۔

اردو کا حلقہ اثر اور اس کی افہام و تفہیم کا دائرہ کسی ایک علاقے یا جماعت تک محدود نہیں بلکہ سارے پاکستان پر حاوی ہے۔ یہ ملک کے ہر حصے اور گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور تمام مدرسوں اور اعلیٰ درس گاہوں میں علمی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ تمام پاکستانیوں کی گو عام مفہوم میں، مادری زبان نہیں لیکن اس کی حیثیت مادری زبان ہی کی ہے۔ اس لیے اسے بجا طور پر تمام پاکستانیوں کی مادری زبان سمجھنا چاہیے۔

"اخبار اردو" (جنوری، ۱۹۸۲ء)

ایک بڑا المیہ

زبان اپنے تمام تقاضوں کے لحاظ سے ایک تہذیبی اور معاشرتی عمل ہے۔ ایک ایسا عمل ---- جس کے رونما ہونے کے لیے کسی نہ کسی نوعیت کے اجتماع یا گروہ کا وجود لازمی ہے۔ ہر زبان کا ظہور اور ارتقا اور اس کا زوال معاشرے کے عروج و زوال پر منحصر ہوتا ہے اور اسی طرح ہر معاشرے کی تقدیر اس کی تہذیب اور زبان سے وابستہ ہوتی ہے۔

کسی تہذیبی اور سیاسی انقلاب کے زیر اثر جب کوئی جماعت اپنی زبان ترک کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو اس کی تہذیبی انفرادیت ختم ہونے لگتی ہے۔ وہ تخلیقی اعتبار سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کی ذہنی موت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ ہماری قوم کے ساتھ بھی ہوا ہے اور فی الوقت بظاہر ایسے آثار نظر نہیں آتے کہ ہم اس زوال کی رفتار کو بہت جلد روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہماری قوم کے دانشوروں کو اس کا احساس ہے اور یہ احساس مختلف سمتوں سے عام بھی کیا جاتا رہا ہے، لیکن افسوس کہ بند باندھنے کی کوئی بھرپور اور مخلصانہ کوشش ایسی نہیں ہوئی جو ہماری قوم کو ذہنی موت سے بچا کر اسے قوت اور توانائی دے سکے۔

صورت حال یہ ہے کہ ہماری نئی نسل جو اس وقت اسکولوں' کالجوں اور جامعات میں تعلیم پا رہی ہے' ایک بے زبانی کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ وہ نہ اپنی قومی زبان پر عبور رکھتی ہے اور نہ انگریزی زبان پر' جو اب تک اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ قومی زبان ہر قوم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اس کے بقا اور ارتقا کے لیے ناگزیر بھی ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی لسانی فوقیت جو اس کا ایک تہذیبی ورثہ اور سرمایہ ہوتی ہے' ختم کر دی جاتی ہے تو وہ نہ صرف تہذیبی افلاس میں مبتلا ہو جاتی ہے بلکہ بولنے اور سمجھنے' یہاں تک کہ سوچنے کی صلاحیتیں بھی کھو بیٹھتی ہے۔ آج ہم اسی المیہ کا شکار ہیں۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک انگریزی سیکھنے اور اسے اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں داخل کرنے کے باوجود بھی ہماری قوم میں اس کے وسیلہ سے کوئی قابل فخربات ظاہر نہیں ہو سکی۔ انگریزی زبان کے سہارے دی جانے والی تعلیم نے علم کو عام کرنے کے بجائے محدود کر دیا ہے۔ اُس نے ہمارے معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے لیے بیگانے ہیں۔

ہمارے معاشرے کا جو طبقہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی زبان سے چپکا ہوا ہے' اس میں ایک بھی ادیب و شاعر ایسا پیدا نہ ہو سکا جس کا ذکر انگریزی زبان و ادب کی تاریخ کے کسی حاشیہ ہی میں درج ہو سکتا۔ علوم میں بھی اس طبقے کی کاوشیں جزئیاتی تحقیق بلکہ سرسری اور سطحی تحقیق تک محدود رہی ہیں۔ کسی بھی علم کی نظریاتی سطح پر ہم اب تک کوئی قابل ذکر اضافہ ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر نہیں کر سکے ہیں۔ اس پس منظر میں آج جو نسل تیار ہو رہی ہے اور جسے ورثہ میں علمی' تحقیقی اور فکری بے بضاعتی کے سوا کچھ نہیں ملا اور جو نہ انگریزی سے اچھی طرح واقف ہے اور نہ اردو پر عبور رکھتی ہے' وہ کون سا بڑا تخلیقی اور تحقیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی۔ وہ اپنے مکمل

ابلاغ کے لیے نہ قلم سے کام لے سکتی ہے اور نہ زبان سے۔ نہ اس میں سوچنے کی استعداد ہے نہ اظہار خیال کی۔ اس کے ذہن اور اس کی زبان پر لسانی دوغلے پن کے تحت جہل مرکب کی مہریں ثبت ہو رہی ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس نسل کو اس کی قومی زبان سے جو قومی تشخص کا آئینہ، شخصیت کے اظہار اور اس کی خود اعتمادی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے' کما حقہ' استفادہ کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ جس قسم کی تعلیم اسے مل رہی ہے اور اس کے حصول کا جو ذریعہ اس کے لیے مقرر ہے اس سے نہ اس کے اظہار و ابلاغ کی صلاحیت نمو پا رہی ہے اور نہ ہی اس میں مناسب لیاقت اور استعداد ہے۔ یہ امتحانات کامیاب تو کر لیتی ہے لیکن رٹ کے یا نقل کر کے اسکول کے اونچے درجوں میں پہنچنے کے بعد بھی یہ کسی زبان میں دو جملے صحت کے ساتھ لکھ نہیں سکتی اور چار سطریں صحیح تلفظ کے ساتھ بول نہیں سکتی۔

وہ نسل جس کا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہے' وہ انگریزی اگر بول بھی لیتی ہے تو اس میں نہ فصاحت ہوتی ہے نہ بلاغت۔ یہ صورت حال بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ معیار اب صرف اسکولوں کے طلبا ہی تک محدود نہیں رہا' اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں کے طلبا بھی اسی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ شدید المیہ یہ ہے کہ یہی نسل اب اساتذہ کے زمرے میں بھی داخل ہو رہی ہے۔ اظہار و ابلاغ کا فقدان اب اساتذہ میں بھی عام ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ کسی استاد کے تقرر کے لیے' جو چاہے اسکول کے لیے ہو یا کالجوں یا جامعات کے لیے' صحت زبان اور ابلاغ پر دسترس کی کوئی شرط یا معیار موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اب جو نسل اساتذہ میں ورود کر رہی ہے وہ بھی زبان اور قلم سے کما حقہ' کام لینے میں ماہر نظر نہیں آتی۔ نہ وہ مکمل طور پر اردو میں درس دے سکتے ہیں' نہ مکمل اور درست انگریزی میں۔ جب یہ صورت حال ہو جائے

تو پھر طلبا میں صحت زبان اور اظہار کی صلاحیتیں کیونکر پیدا ہو سکتی ہیں؟

قومی زبان کو روزمرہ زندگی اور معاشرتی اداروں اور خصوصاً درسگاہوں سے دور کرنے اور انگریزی کو چمٹائے رکھنے سے جو بھیانک قومی المیہ جنم لے رہا ہے، وہ ہوش مندوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ انگریزی زبان کی عمل داری کی وجہ سے قومی زبان ہماری قومیت اور شخصیت کا جزو نہیں بن سکی ہے اور اسی لیے اس پر عبور حاصل نہ ہونے کے سبب ہمارے ملک میں تعلیم کا اصل فائدہ اور حقیقی مقصد مفقود ہے۔ قومی زبان پر عبور ہم اس وقت حاصل کر سکتے ہیں، جب یہ مکمل طور پر ذریعہ تعلیم اور ہماری روزمرہ زندگی کا جزو لازم ہو۔ انسان زبان سے اشرف ہوتا ہے لیکن ہم یہ شرف انسانیت کھوتے جا رہے ہیں۔

"اخبار اردو" (فروری، ۱۹۸۲ء)

انگریزی زبان کی تدریس

برعظیم پاک و ہند میں انگریزی زبان کا تسلط انگریزوں کے مستحکم اور مکمل اقتدار کے ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ ایک صدی تک انگریزی زبان پڑھا کر اور اسے امور حکومت اور اعلیٰ ملازمتوں میں جزو لازم کی حیثیت دے کر جب انگریزوں نے جنوبی ایشیا سے اپنے قدم سمیٹے تو یہاں کی آبادی کا بہ مشکل بارہ فیصد حصہ تعلیم یافتہ تھا اور ان میں سے بھی بہت کم ایسے تھے جنھیں انگریزی داں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس طرح انگریزی تعلیم سے پڑھے لکھے افراد کا ایک نیا طبقہ ضرور پیدا ہوا جسے حکومتوں اور ملازمتوں میں اجارہ داری حاصل ہوئی لیکن ان میں بہت کم پر انگریزی پر عبور رکھنے کا اطلاق کیا جا سکتا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ایسے افراد کی تھی جو انگریزی زبان میں اپنی ذمہ داریوں کو محض نباہنے کے قابل تھے۔ یہ وہ طبقہ تھا جو لارڈ میکالے کی توقعات کے عین مطابق ثابت ہوا اور جو خود پر اہل زبان کا قیاس کرتا تھا۔ چنانچہ انگریزی زبان کے تسلط سے اس نے اپنے آپ کو حصول آزادی کے بعد بھی، نجات دلانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ اس کی طبیعت نجات حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے چلے جانے کے باوجود حکومت اور اعلیٰ

ملازمتوں میں اس طبقہ کے متمکن رہنے کی وجہ سے انگریزی زبان بدستور اسی مقام پر رہی جہاں انگریزوں نے اسے فائز کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کے پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہونے کے بارے میں قائداعظم اور مسلم لیگ کے واضح نقطہ نظر کے باوجود ارباب اختیار کو مختلف محرکات کے سبب، جن میں مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان کے حق میں ابھرنے والی متشددانہ تحریک کا بھی دخل تھا، انگریزی زبان کو مملکت کی جڑوں میں مستقل سرایت کیے رہنے کا بہترین موقع حاصل ہو گیا۔ انگریزی کے خلاف دانشورانہ اور عوامی ردعمل کے باوجود، جو قیام پاکستان کے بعد سے مستقل سامنے آتا رہا ہے، انگریزی زبان بہت سخت جان ثابت ہوئی۔ اس کو پاسبان خود صنم خانے سے ملتے رہے۔ ملک کی افسر شاہی، جس کا اوڑھنا بچھونا فقط انگریزی زبان ہے، انگریزی کے قدم مضبوطی سے جمانے کا سبب بنی۔

موجودہ حکومت کے عہد میں اردو کے نفاذ کے تعلق سے جو عزائم سامنے آ رہے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت کے عزائم اور اعلانات پر عمل درآمد ہوتا رہا تو انگریزی زیادہ عرصہ تک نہ تو تعلیم کا ذریعہ رہ سکتی ہے اور نہ سرکاری نظم و نسق کا۔ لیکن ہماری افسر شاہی اور یہاں تک کہ ہماری جامعات میں اساتذہ کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو ابھی تک خود کو اس صورت حال سے ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔

اس وقت ملک کے تعلیمی نظام میں انگریزی زبان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ذریعہ تعلیم کی، دوسری لازمی مضمون کی۔ ان دونوں کے بارے میں بنیادی تبدیلی لازمی ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کی مخالفت کے پس منظر میں یہ خیال کبھی کسی کے پیش نظر نہیں رہا کہ انگریزی کو قطعی طور پر ملک سے نکال دیا جائے۔ ہمیشہ اور ہر سمت سے اس کے بے جا غلبہ اور اس کی ناجائز بالادستی کی

مخالفت کی گئی ہے۔ انگریزی زبان کی بالادستی اور اس کے غلبہ کا ہرگز یہ مطلب نہیں رہا کہ انگریزی بطور زبان و ادب بالکل ہی نہ پڑھائی جائے۔ اسے لازمی طور پر پڑھایا جائے اور اس طرح کہ انگریزی کی شدبد نہ صرف ہر شخص کو ہو جائے بلکہ وہ تمام علمی اور بین الاقوامی تقاضے کما حقہ' پورا کر سکے۔ بعض علمی ضرورتوں کے لیے اسے وہ لوگ زیادہ خصوصیت کے ساتھ پڑھیں جنھیں اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ بعض عام ضرورتوں کے تحت اسے لازماً" پڑھا جائے' لیکن ایک خاص درجہ کے بعد اس کا پڑھنا سب کے لیے لازمی نہ ہو۔ بعض علمی مفادات کے علاوہ وہ لاکھوں طلبا جن کے خاص علمی مفادات نہیں ہوتے اپنا قیمتی وقت اس مضمون پر بلا ضرورت صرف کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں زیادہ درجات تک انگریزی لازمی کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ کیونکہ زیادہ درجات تک لازمی انگریزی اول تو ملکی و قومی تربیت کے معاشرتی اصولوں کے خلاف ہے' پھر علمی لحاظ سے سب کے لیے کسی طور پر ضروری نہیں۔ دنیا بھر میں کسی ترقی یافتہ قوم کی مثال ایسا نہیں کہ اس نے کسی ایسی زبان کو اپنے لیے لازم کر لیا ہو' جس کا تعلق اس کی اپنی تہذیب سے نہ ہو۔ اس محکومانہ مصلحت کو اب باقی نہیں رہنا چاہیے جو انگریزی اقتدار کے دور میں تھی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انگریزی زبان پر اتنا زور دیے جانے کے باوجود انگریزی کا معیار دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔ انگریزی پڑھنے والے سب ہی ہیں لیکن انگریزی پڑھانے والے لائق اساتذہ بہت کم رہ گئے ہیں۔ انگریزی زبان کے اکثر اساتذہ اس زبان پر مکمل عبور کے حامل نہیں کہے جا سکتے۔ چنانچہ طلبا کے لیے انگریزی کی بہتر تدریس کس طور پر ممکن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج جو طلبا بی اے تک انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں سے اکثر صحت کے ساتھ نہ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی

ہے کہ ہم انگریزی زبان اور ادب کو بہر حال انگریزی ذریعہ اظہار کے تحت ہی پڑھتے ہیں۔ انگریزی کے وسیلہ سے ہم جس طرح دوسرے مضامین میں کورے رہ جاتے ہیں، اسی طرح خود انگریزی سے بھی نابلد ہی رہتے ہیں۔ ہماری ساری محنت اسم، فعل، صفت کی انگریزی میں تعریفیں رٹنے میں صرف ہو جاتی ہے اور زبان کا فہم اور سلیقہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے اسباق بھی جو مضامین اور شاعری وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں، ہماری سمجھ سے بالا ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ مناسب ہوگا کہ:

۱۔ انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد کو کم کیا جائے اور صرف وہی لوگ انگریزی پڑھیں جو خاص علمی مفادات رکھتے ہیں۔

یہ تعداد اس طرح کم ہو سکتی ہے کہ انگریزی صرف چند درجوں میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے اور زیادہ توجہ کے ساتھ پڑھائی جائے اور باقی درجوں سے خارج کر دی جائے۔ جب تعداد کم ہو گی تو اساتذہ بھی کم درکار ہوں گے اور اس طرح لائق اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ بہت حد تک کم ہو جائے گا۔

ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ انگریزی زبان کی غیر ضروری تدریس کے کم ہونے سے طلبا اپنی محنت، اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کو کسی اور مزید مضمون میں استعمال کر سکیں گے۔ نئے نصاب میں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی ضرورت بجا طور پر محسوس کی گئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انگریزی کو محدود کر کے عربی نصاب میں انگریزی کے بقیہ درجات میں شامل کر لی جائے۔ اس سے ہماری نہ صرف دینی ضرورت پوری ہو سکتی ہے، بلکہ دنیائے اسلام سے ہمارے تعلقات مزید قریب ہو سکتے ہیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریاضی یا سائنس بھی لازمی مضامین کی حیثیت سے

پڑھائے جائیں۔

۲۔ انگریزی زبان اور ادب کو بھی اردو میں پڑھایا جائے۔

اس تجویز پر یہ اعتراض کہ ہر زبان کے ادب کو اسی زبان میں پڑھنا چاہیے، معقول نہیں ہو سکتا۔ آخر ہمارے اکابر انگریزی زبان کے سہارے فرانسیسی، جرمن اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب کو پڑھتے ہی رہے ہیں اور اس طرح عربی، فارسی، سنسکرت اور دیگر مشرقی ادبیات کو برطانیہ اور امریکہ میں انگریزی میں پڑھا جاتا ہے۔ جب ان زبانوں کے ادب کو انگریزی میں پڑھا جا سکتا ہے تو انگریزی زبان اور ادب کو اردو میں کیوں نہیں پڑھا جا سکتا؟ اس سلسلے میں یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح طالب علموں کو انگریزی زبان میں اظہار خیال پر پوری قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اگر اظہار پر قدرت حاصل نہ ہو سکے تو اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اچھی انگریزی لکھ بول لینا اور علم حاصل کرنا کچھ لازم و ملزوم تو نہیں۔ فرانس، جرمنی اور روس وغیرہ کے وہ علمائے ادب جو انگریزی نہیں جانتے جاہل تو نہیں کہے جا سکتے۔

اگر انگریزی زبان اور ادب اردو میں پڑھائے جائیں تو نہ صرف زبان اور ادب کا بہتر فہم پیدا ہو سکے گا بلکہ انگریزی زبان کے وہ اصول و قواعد اور ادب کے وہ تصورات اور شاہکار جو انگریزی میں اعلیٰ اسناد کے حاصل کرنے کے باوجود پوری طرح ہماری دسترس میں نہیں ہوتے ہمارے گرفت میں آ جائیں گے۔

"اخبار اردو" (مارچ، ۱۹۸۲ء)

نفاذ اردو

قومی زبان کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ اس قدر مسلمہ ہے کہ اس پر اب مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ ملک و قوم کے بہی خواہ اور ہمدرد ابتدا ہی سے اسے رواج دینے اور زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ملک کے تقریباً تمام دانشور اور سائنس دان مستقل یہ مطالبہ کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ جب ملک کے نامور سائنس دان یہ کہہ رہے ہوں کہ سائنس اور دیگر تمام علوم کی تعلیم اردو میں ہونی چاہیے تو غلامانہ ذہنیت اور مخصوص مفادات رکھنے والوں کی یہ دلیل بے اثر اور بے معنی ہو جاتی ہے کہ سائنسی و فنی علوم کی تعلیم اردو میں نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قوم کے تمام بہی خواہ اور ہمدرد اگر اردو کو زندگی کے ہر شعبہ اور دفتروں میں نافذ کرنے پر زور دے رہے ہیں، تو اس کے پس پشت بھی یہی احساس کار فرما ہے کہ قومی زبان کو نظرانداز کر کے ہم نہ تو ترقی کر سکتے ہیں اور نہ اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے مطابق زندہ رہ سکتے ہیں۔ قوم کا اپنی قومی زبان اختیار کرنا اور اس میں معاملت کرنا اس کی ترقی اور فلاح کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ اس کا تشخص قائم رہ سکتا ہے اور نہ وہ

اپنے تاریخی و تہذیبی ورثہ سے سیراب ہو سکتی ہے۔

موجودہ حکومت کے عہد میں قومی زبان کی اہمیت و افادیت کا کما حقہ، اعتراف کیا گیا ہے اور اسے بحیثیت ذریعہ تعلیم اور بطور دفتری زبان اختیار کرنے کی ضرورت کا بھی احساس کیا جا رہا ہے۔ لیکن بعض نامعلوم وجوہ کے تحت اسے سائنسی و فنی علوم کا ذریعہ تعلیم بنانے اور دفتروں میں اس کے مکمل رواج کے لیے مناسب احکامات جاری ہونے میں غیر ضروری تاخیر سے کام لیا جا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ غلامانہ ذہنیت اور مخصوص مفادات رکھنے والا کوئی ایک خود غرض طبقہ ہے، جس کی پرورش انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے سایہ میں ہوتی ہے، وہ اپنی ضد پر قائم ہے اور قومی زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کے راستہ میں رکاوٹیں اور بے بنیاد شکوک و شبہات اور تاخیر پیدا کر رہا ہے۔ حالانکہ جہاں تک قومی زبان کے ذریعہ تعلیم بنائے جانے کی ضرورت کا تعلق ہے، ملک کے تقریباً تمام ممتاز دانشوروں اور سائنس دانوں کے دلائل اس کی حمایت میں موجود ہیں، رہی اس کے بطور دفتری زبان رواج کی بات تو اس ضمن میں بھی تاریخی حقائق اس کے حق میں ہیں۔ ماضی میں انگریزی زبان انگریزی عہد کے علاوہ کبھی دفتری زبان نہیں رہی۔ مغلیہ عہد میں فارسی دفتری زبان کے طور پر رائج تھی اور یہی زبان پورے ملک میں اشتراک و وحدت کا اہم ذریعہ رہی۔ انگریزوں نے اس اشتراک و وحدت کو ختم کرنے کے لیے جہاں اور حربے اختیار کیے وہاں فارسی کو عدالتوں اور دفتروں سے بظاہر خوبصورتی کے ساتھ اس طرح بے دخل کیا کہ ہندوستانی اس وقت ان کی اصل حکمت عملی کو نہ سمجھ سکے۔ انگریزوں نے اولاً اردو کو فارسی کی جگہ دی تاکہ ہندوستانی مطمئن رہیں، لیکن صورت حال کی موافقت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے پھر بہت جلد اردو کو بھی بے دخل کر دیا اور ۱۹۳۵ء میں انگریزی کو دفتری اور عدالتی

زبان کا درجہ دے دیا۔ اس وقت سے انگریزی زبان نہ صرف دفتروں بلکہ نظام تعلیم اور اس کی پروردہ تہذیب پر مسلط اور حکمراں ہے۔ دفتری زبان او نظام تعلیم میں ایک ناگزیر تعلق بھی اس لیے قائم ہوا کہ ملازمت کے متوسط اور اعلیٰ درجوں کے حصول میں انگریزی زبان کی مہارت ضروری لیاقت سمجھی گئی۔

ملازمتوں اور ان کی لیاقتوں کا جو سانچہ پاکستان کو انگریزی حکومت سے ورثہ میں ملا وہ اب بھی برقرار ہے اور اسی لیے انگریزی زبان کی مہارت ملازمت کے اعلیٰ درجوں کا ضروری معیار سمجھی جاتی ہے۔ جب تک انگریزی زبان رہے گی، اس میں مہارت اعلیٰ ملازمتوں کے لیے معیار بنی رہے گی اور اس طرح قوم انگریزی ذریعہ تعلیم سے شاید نجات نہ پا سکے گی۔ اس لحاظ سے ذریعہ تعلیم کی تبدیلی اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ دفتری زبان بھی اس کے ساتھ ساتھ تبدیل نہ ہو۔ مقام شکر ہے کہ پاکستان کی کئی جامعات نے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنا شروع کر دیا ہے اور ایسی جامعات اور تعلیمی اداروں کی فہرست میں اضافہ ہو رہا ہے اور قوی امید ہے کہ حکومت اسے ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے کے مناسب احکامات بھی جاری کر دے گی۔ لیکن یہ سب کچھ ہو جائے مگر قومی زبان دفتروں میں رائج نہ ہو سکے تو قوم کو وہ تمام فوائد حاصل نہیں ہو سکیں گے، جو اس کا بنیادی حق ہیں۔ قومی زبان کو دفتری زبان کے طور پر رائج کر دینے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی ترغیب میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح ملک اور قوم کما حقہ، فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جہاں تک اردو میں دفتری زبان بننے یا نہ بننے کی صلاحیت اور عدم صلاحیت کی بات ہے ---- تو اس میں بھی کسی قسم کے شک و شبہ اور بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اردو اس وقت ایک مکمل اور ترقی یافتہ

زبان ہے اور یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سطح کے علمی و فنی مضامین ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ تاریخی حقائق موجود ہیں کہ اس میں دفتری اور عدالتی زبان بننے کی مکمل صلاحیت اور قدرت بھی موجود ہے۔ دفتروں اور عدالتوں میں اور سرکاری معاملات میں انگریزی زبان کے رواج کے فیصلہ کا اطلاق صرف انگریزی حکومت کی عملداری میں ہوا تھا۔ بیشتر ریاستوں نے خود کو اس فیصلہ سے علیحدہ رکھا۔ کئی ریاستوں میں انگریزی کے بجائے اردو تمام سرکاری اور دفتری و عدالتی امور کی انجام دہی میں استعمال ہوتی رہی۔ وہاں اس کا رواج زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی رہا۔ کئی ریاستوں میں اسے ذریعہ تعلیم کی حیثیت بھی حاصل رہی۔ یہاں تک کہ ریاست حیدر آباد میں ڈاکٹری، انجینئری اور دوسرے علوم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو ہی ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور انگریزی زبان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ پاکستان میں کچھ عرصہ سے حکومت پنجاب اردو کو دفتری زبان بنانے کے سلسلے میں عملی اقدامات کر رہی ہے اور اب وہاں کے دفتروں میں اس کا عمل دخل بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند پیش رفت ہے ---- جس کی دوسرے صوبوں اور خاص طور پر وفاقی حکومت کو تقلید کرنی چاہیے۔ وفاقی حکومت پر اس ضمن میں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر اس نے اپنے دفاتر میں اردو کو رواج دے دیا تو اس کے ماتحت اداروں اور صوبائی حکومتوں میں بھی اس کا نفاذ جلد ممکن ہو جائے گا۔ دفتری اور عدالتی اصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ اردو میں موجود ہے اور جو ہر سطح اور ہر نوع کے کام میں استعمال میں آ سکتا ہے۔

اپنے تاریخی حقائق کے پس منظر اور اپنے تمام موجودہ وسائل کی موجودگی میں اردو کے دفتری زبان کے طور پر فوری رواج میں اب کوئی شک و شبہ حقیقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ اس بے جا اور غیر ضروری تاخیر کا تقاضہ ہے کہ

جلد از جلد اردو کو دفتروں میں رائج کر دیا جائے اور اسے حکومت کی منظوری عطا کر کے سرکاری حکم کے طور پر قابل عمل بنا دیا جائے۔ قومی زبان کو نظر انداز کر کے ہم اب تک ترقی کے میدان میں جس قدر پیچھے رہ گئے ہیں اس کی ایک مناسب تلافی یہی ہو سکتی ہے کہ ہم جلد از جلد اردو کو اس کا جائز مقام دے دیں اور اسے زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کر دیں۔

"اخبار اردو" (نومبر، ۱۹۸۱ء)

ہماری ذمہ داری

موجودہ حکومت کا عہد اردو زبان کی ترویج اور سرکاری سرپرستی کے لحاظ سے سابقہ حکومتوں کے عہد کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ حاصلہ افزا ہے۔ اردو کی اہمیت کو تسلیم کرنے اور اسے سرکاری سطح پر رواج دینے کا جو عمل ایک حد تک اب نظر آتا ہے' یا جو عزم اور ارادے اردو کے تعلق سے موجودہ حکومت کے نظر آتے ہیں' گزشتہ ادوار میں محض زبانی اقرار اور وعدوں پر مشتمل تھے۔ لیکن اس کے باوجود اردو کے نفاذ اور سرکاری اور نجی شعبوں میں اس کے رواج کی جو کیفیت ہونی چاہیے تھی وہ بہرحال اس طرح نہیں ہے' جو اس کا تقاضہ تھی۔ حکومت کے قومی زبان کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کے کم از کم سرکاری سطح پر رواج اور نفاذ میں وہ پیش رفت نظر نہیں آتی جو فی الواقع ہونی چاہیے تھی اور کچھ عرصہ قبل حکومت کے عزائم کو دیکھتے ہوئے جس کی امید بندھ گئی تھی۔ ایسے متعدد اعلانات اور ارادے جو حکومت وقتاً فوقتاً قومی زبان کے نفاذ کے تعلق سے ظاہر کرتی رہی ہے' ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے ہیں اور تمام تر منصوبوں اور وسائل کے باوجود بعض نامعلوم اسباب کے تحت قومی زبان کا نفاذ سرکاری اور قومی سطح پر تعطل کا شکار نظر آتا

ہے اور اس کے لیے جو سمت اور رفتار ہونی چاہیے تھی وہ اختیار نہیں کی گئی۔ حالانکہ قومی زبان کے نفاذ میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن یہ فی الحقیقت قوم اور ملک کا مقدر بن چکی ہے اور اسے جلد یا بدیر نافذ ضرور ہونا ہے۔ بہرحال قومی زبان کے نفاذ کا مستقبل بہت کچھ خوشگوار امیدوں کا حامل ہے اور حکومت اور ارباب اختیار یقیناً جلد اس کے نفاذ کی صحیح سمت کا تعین کرلیں گے اور قوم قومی زبان کی برکتوں سے کما حقہ، فائدہ اٹھا سکے گی۔

لیکن قومی زبان کے نفاذ اور اس کے عام رواج میں جو تعطل، تاخیر اور سست رفتاری نظر آتی ہے کیا یہ محض حکومت اور ارباب اختیار کے سبب ہے؟ اور یہ سوال بجائے خود قومی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ قومی ترقی اور فلاح و بہبود میں خود قوم کا کس قدر حصہ ہوتا ہے اور قوم اپنی ترقی اور اپنے زوال کی خود کتنی ذمہ داری ہوتی ہے؟ قومی زبان کا نفاذ سرکاری اور قومی سطح پر یقیناً حکومت کی ذمہ داری محسوس ہوتا ہے اور حکومت کے توسط سے اس کے نفاذ میں بڑی تیز رفتاری اور آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن جب تک پوری قوم خود اس کے لیے آمادہ اور تیار نہ ہو کوئی بہتر نتیجہ سامنے نہیں آ سکتا۔ اس اعتبار سے یہ بڑی حد تک خود قوم پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس معاملہ میں کس حد تک پیش رفت کر سکتی ہے اور اس کی زندگی میں کوئی انقلاب کس طرح آ سکتا ہے؟

قومی زبان کا نفاذ اگر سرکاری سطح پر حکومت کی ذمہ داری ہے تو قومی اور عوامی سطح پر اس کے نفاذ اور رواج کی ذمہ داری سے کوئی قوم خود کیوں کر پہلو تہی کر سکتی ہے؟ کیا اب تک سرکاری اور قومی سطح پر قومی زبان کے عدم نفاذ کی ذم داری خود ہماری اپنی بھی نہیں ہے؟ یہ عدم نفاذ صرف یک طرفہ نہیں۔ ہم اپنے پیٹ اور اپنے حقوق کے لیے ہزاروں مطالبات مرتب کر

سکتے ہیں، لیکن کیا ان مطالبات کے درمیان اس تواتر کے ساتھ کبھی قومی زبان کے نفاذ کا مطالبہ بھی اپنی جگہ حاصل کر سکا؟ قومی زبان کے نفاذ اور رواج کا وہ مسئلہ جس پر حال کی تعمیر اور مستقبل کی ترقی کی بنیادیں استوار ہیں، کیا ہماری ضروری اور مناسب توجہ حاصل کر سکا؟ کیا وہ ادارے جو اردو کے لیے اردو کے نام پر قائم ہیں، اردو کا حق کسی اعتبار سے ادا کر رہے ہیں؟ ہماری چھوٹی بڑی کئی انجمنیں ہیں، جو اکثر ایک دوسرے کی بے عملی پر طعنہ زن رہتی ہیں، لیکن ان میں سے کیا کسی نے بھی اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کیا ہے؟ ہم ان انجمنوں کے عہدوں اور کرسیوں کے بل بوتے پر ہزاروں آسائشیں، شہرت، وقار اور سیر و تفریح کے مواقع حاصل کر لیتے ہیں لیکن کیا ہم کبھی عمل کے میدان میں بھی آئے ہیں؟

ہمارے شاعر اور ادیب اور دانشور قدیم و جدید اور ترقی پسندی و غیر ترقی پسندی کی بحث میں الجھے رہتے ہیں، لیکن انھیں اس بات کا احساس نہیں کہ جب زبان پر زوال طاری ہو جاتا ہے تو سارے موضوعات بحث ختم ہو جاتے ہیں۔ شعر و ادب کا سارا تانا بانا زبان ہی پر بنتا ہے، جب زبان ہی میں فروغ نہیں تو شعر و ادب میں کہاں؟ یہ وقت ہے زبان کی تحریک کا نہ کہ ادب کی تحریکوں کا، ادبی تحریکیں تو ذہنی نشو و نما حاصل کرتی ہیں، جب زبان میں تحریک اور تجدید نہ ہو تو ادب میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جب زبان ہے تو "انفرادیت" اور "وجودیت" کی بحث کوئی معنی بھی رکھتی ہے، وگرنہ سب بے معنی ہے۔ یہ وقت "اظہار" کا نہیں بہتر وسیلہ اظہار کا ہے۔

ہمارے بیشتر امرائے ادب، جو دانشوروں کی صف میں بھی جگہ پا لیتے ہیں، اردو کے حق میں نہایت بلند بانگ نعرے لگاتے ہیں۔ مضامین لکھتے ہیں، بیانات دیتے ہیں، اردو کے اداروں اور انجمنوں سے وابستہ ہو کر اردو سے

اپنے فرط عشق کا اظہار کرتے نہیں تھکتے، لیکن نہایت دیانت و ذہانت کے ساتھ اپنے بچوں کے لیے ایسے اسکول منتخب کرتے ہیں جہاں اردو کا نام و نشان نہ ہو۔ ان کے مضامین اور بیانات تو اردو میں ہوتے ہیں لیکن ان کی گفتگو انگریزی کے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔ ہم میں سے کتنے ادیب و شاعر اردو کے نام لیوا ہیں جو صرف اردو میں دستخط کرتے ہیں؟ ہم جس غلامی کی راہ سے گزرتے ہوئے انگریزی میں دستخط کرنے کی منزل تک آئے ہیں، شاید منتظر ہیں کہ کوئی سرکاری حکم یا قانون ہی ہمیں اردو میں دستخط کرنے پر مجبور کرے۔

اس طرح زندگی کے عام شعبوں سے تعلق رکھنے والوں، بالخصوص تاجروں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم چاہیں تو صرف ایک دن میں اپنے جملہ اشتہارات، رسیدیں، دکانوں کے نام، بازاروں اور سڑکوں پر آویزاں اشتہاراتی تختے وغیرہ اردو میں منتقل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے کسی سرکاری حکم یا قانون کا انتظار کیا معنی رکھتا ہے؟ ان باتوں کے لیے نامعلوم کیوں ہم پہل کرتے ہوئے جھجکتے ہیں؟ صارفین کو بہر حال اشیا کی ضرورت ہوتی ہے وہ انگریزی کے اعداد اور حروف خریدنے کبھی بازار کا رخ نہیں کرتے۔ پھر یہ کہ بازار میں کتنے ایسے افراد کا گزر ہوتا ہے جو صرف انگریزی سمجھتے ہیں؟ اردو ہر صورت میں دائرہ ابلاغ کو وسیع کرتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اب جو غیر ملکی سفارت کار پاکستان آتے ہیں ان کی ایک اچھی خاصی تعداد اردو سے آشنا ہوتی ہے لیکن ہم ہیں کہ انھیں بلکہ ان لوگوں کو بھی جنھیں انگریزی بالکل نہیں آتی، انگریزی ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ دیہات سے شہروں میں آنے والے بالکل معصوم اور ان پڑھ لوگوں کی آنکھیں بھی انگریزی کے انجانے حروف اور اعداد سے ہی دو چار ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج اردو انگریزی کے صحن اور چہار دیواری میں

دفن ہے اور ہم اس کی رہائی کے لیے ذرا بھی نہ فکر مند ہیں نہ کوشاں ہیں۔ اگر ہر شخص قوم کے ایک فرد کی حیثیت میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر لے اور کم از کم اپنے دائرہ اختیار میں انگریزی کا ہر طرح استعمال ترک کر کے اردو کا استعمال شروع کر دے تو ملک کا ہر گوشہ قومی زبان کے رواج سے آراستہ ہو جائے گا۔

"اخبار اردو" (اپریل ۱۹۸۲ء)

زبان کا مزاج اور
ہماری بے احتیاطی

قیام پاکستان کے بعد سے اردو زبان، جو برعظیم پاک و ہند کی مخلوط تہذیبوں کا ایک مشترکہ سرمایہ ہے، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں اور سماجی رویوں کے سبب بھارت اور پاکستان میں ایک متوازی ارتقائی سفر طے کر رہی ہے۔ مختلف محرکات کے نتیجہ میں، جن میں تہذیبی اور سماجی رویوں کا زیادہ دخل ہے، ان دونوں ممالک کے معاشروں میں زبان اور بیان کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ گو اس کا تہذیبی پس منظر ایک ہے لیکن اب یہ دو مختلف معاشروں میں اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے مزاج اور اس کے آہنگ میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اس کے توسط سے جو تخلیقی اظہار ہو رہا ہے اس کے موضوعات و مضامین، افکار، میلانات، تجربات اور رجحانات و اسالیب میں مجموعی طور پر رنگ و آہنگ کے لحاظ سے وہی فرق محسوس ہوتا ہے جو خود بھارت اور پاکستان کے معاشروں میں تبدیلیوں اور نشیب و فراز کی صورت میں سامنے آتا رہا ہے۔ پاکستان میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے، اگر تمام پہلوؤں سے بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس میں پاکستانی معاشرہ کے تمام خد و خال

کہیں نمایاں اور کہیں ڈھکے چھپے انداز میں نظر آ جائیں گے۔ اسی لحاظ سے اگر پاکستان میں لکھے جانے والے ادب کا بھارت میں لکھنے جانے والے ادب سے اس کے مزاج کے اعتبار سے مقابلہ کیا جائے تو دونوں میں فرق بہر حال محسوس ہوگا اور یہ فرق دونوں ممالک کے معاشروں کے فرق کے لحاظ سے سامنے آئے گا۔ یہی صورت زبان کے مزاج اور اس کے آہنگ کے تعلق سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

موجودہ بھارت میں اردو زبان اپنے اسی معاشرہ میں ارتقائی عمل سے گزر رہی ہے جو اس کی روح ماضی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے ارتقائی سفر میں کوئی بہت بڑا انقلاب رونما نہیں ہوا۔ اردو کا سارا علاقہ اور اس کا مولد و مصدر اسی معاشرہ کا ایک حصہ ہے جس میں اردو مسلسل اپنا سفر طے کر رہی ہے، لیکن پاکستان میں اردو کے ساتھ یہ صورت نہیں ہے۔ یہاں کا معاشرہ اپنے مخصوص تہذیبی اور نظریاتی ماحول کی وجہ سے بھارتی معاشرہ سے تہذیبی اعتبار سے ایک بڑی حد تک اور نظریاتی اعتبار سے یکسر دوسری سمت میں سفر کر رہا ہے۔ یہاں اردو اثر اندازی اور اثر پذیری کے لحاظ سے علاقائی زبانوں کے ساتھ زیادہ گہرے رشتہ میں پیوست ہے۔ پھر سماجی آویزش اور رسم الخط کی یکسانیت اس رشتہ کو مزید استحکام اور تازہ خون پہنچا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب سے قریبی رابطہ اور روز افزوں اثر پذیری کے سبب ہماری تہذیب اور ہماری زبان پر مغربی اثرات بھی بہت واضح صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ بھارت کے مقابلہ میں ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب کے لوازمات سے زیادہ آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اثر ہماری زبان پر بھی بہت گہرا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ ان مختلف اسباب کے نتیجہ میں پاکستان کی اردو میں اردو کا مخصوص مزاج اور آہنگ اور کھڑی بولی کا اثر روز بروز کم تر ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ بالکل

اس طرح امریکہ اور برطانیہ کی انگریزی میں فرق ہے اور آسٹریلیا اور برطانیہ کی انگریزی میں بھی فرق ہے اور افغانستان اور ایران اور وسطی ایشیا کے علاقوں کی فارسی میں فرق ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان ملکوں میں یہ فرق چند الفاظ کی تبدیلیوں اور تلفظ کے اختلاف میں نظر آتا ہے۔ زبان اپنے مزاج اور اپنی بنیادوں سے دور نہیں ہوئی ہے۔

موجودہ تہذیبی ماحول میں اردو اپنی بنیادوں اور اپنے مخصوص آہنگ سے دور ہوتی جا رہی ہے - یہ صورت حال پاکستان میں زیادہ اور بھارت میں کم ہے۔ یہاں انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے اور اپنی زبان کو حقیر اور ناقص سمجھنے کا جذبہ عام ہے۔ صرف کالجوں اور جامعات ہی میں نہیں، عام معاشرہ میں بھی ایک متوازی اردو پیدا ہو رہی ہے - اس کا اثر تحریر اور ادب پر بھی پڑا ہے۔ اب جو اردو استعمال میں آتی ہے، اس میں روز مرہ اور محاورہ کم ہے، متعدد الفاظ اور فقرے انگریزی کے ہیں۔ انگریزی الفاظ کی وجہ سے اردو کا آہنگ اور حسن مجروح ہو رہا ہے اور روزمرہ اور محاورہ کے عدم استعمال سے اس کی چاشنی ختم ہو رہی ہے۔

یہ صورت حال بظاہر تو اپنے محرکات اور عوامل کا تقاضہ ہے لیکن اس میں دراصل ہماری اپنی لاپرواہی کا بڑا دخل ہے۔ مغربی معاشرہ سے قریب اور مغربیت کا شکار ہو کر ہم اپنی تہذیب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف ہم انگریزی الفاظ کے غیر ضروری استعمال اور انگریزی زبان کے اثرات کو اپنے مزاج میں داخل کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم اپنے روزمرہ اور محاورے فراموش کر رہے ہیں اور لاپرواہیاں بھی ہم سے سرزد ہو رہی ہیں۔ ہم زبان کے مسلمہ اصول و قواعد سے انحراف کر رہے ہیں اور اس طرح اردو کے مزاج اور اس کی بنیادوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہم اپنے سماجی ورثہ، نئے

الفاظ کے خون اور تازہ خیالات سے تو اپنی زبان کو توانائی دے سکتے ہیں لیکن زبان کی بنیادوں سے انحراف کر کے اور اسے حالات کے دھارے پر ڈال کر فروغ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ اس معاملے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

"اخبار اردو" (مئی ۱۹۸۲ء)

ذرائع ابلاغ کا منفی کردار

موجودہ حکومت نے قومی تشخص کے فروغ کے لیے بعض ایسے اہم اور دور رس اقدام کیے ہیں، جن کی اہمیت کو تسلیم تو سب ہی کرتے آئے ہیں لیکن ان پر عمل کسی نے نہیں کیا۔ یہ اقدام خلوص نیت پر مبنی ہیں اور ان سے قومی یکجہتی اور تعمیر و ترقی کی راہ میں مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے اب تک وہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے جو متوقع تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ اقدام ابھی تحریک اور تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ملک کا باشعور اور دیدہ ور طبقہ سمجھتا ہے کہ غلامانہ ذہنیت کا قلع قمع کیے بغیر قومی تشخص کے فروغ کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہو سکتیں۔ احساس کمتری ہماری قوم میں ہر سطح پر نظر آتا ہے۔ مملکت کی ترقی و استحکام اور قومی و ملی اہمیت کے اداروں میں بھی اسے ہمیشہ عروج اور اثر و نفوذ حاصل رہا ہے۔ قومی تشخص کے فروغ کی راہ میں جو دیواریں نظر آتی ہیں، وہ اسی ذہنیت کی کھڑی کی ہوئی ہیں۔

یہی صورت ذرائع ابلاغ میں بھی نظر آتی ہے---- جو قومی تشخص اور ترقی و اصلاح کے کام میں بہت مؤثر تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں۔

آج کی دنیا میں انھیں اس حد تک موثر قوت حاصل ہے کہ یہ اگر چاہیں تو قوم کی تعمیر بھی کرسکتے ہیں اور تخریب بھی۔ اس اہمیت اور قوت کے پیش نظر اگر یہ راہ راست پر ہوں تو قومی تعمیر میں ایک اہم عامل ثابت ہو سکتے ہیں۔ قومی تشخص کے فروغ اور قومی زبان کے نفاذ میں بھی ان سے نہایت مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ قومی ذرائع ابلاغ مملکت کے نظریے اور اس کے مفاد کے خلاف بھی روش اختیار کر لیتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اپنی من مانی کرنے کی آزادی حاصل رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ قومی مفاد کے کام یہ اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے بقول انھیں حکومت کی طرف سے بروقت اجازت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن منفی کام یہ بالعموم حکومت کی رضامندی کے بغیر ہی کرنا شروع کر دیتے ہیں---- اور انھیں کسی کا نہ خوف ہوتا ہے اور نہ ان سے کوئی باز پرس ہی کرتا ہے۔

یہ صورت حال قومی نشریاتی اداروں میں عموماً نظر آتی ہے۔ عام طور پر ملک کے دانش ور یہ شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ دور نمائی (ٹیلیویژن) کے مختلف پروگراموں میں پاکستانی ثقافت اور اسلامی تہذیب کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور انگریزی ذریعہ تعلیم اور انگریزی ہندسوں کی برتری کو ثابت کرنے کی نامعقول کوششیں کی جاتی ہیں۔ قومی تشخص کا احساس دلانے کے لیے جو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں وہ اس حد تک نامناسب ہوتی ہیں کہ ان کا اثر مثبت کے بجائے منفی محسوس ہوتا ہے۔ قومی زبان کے رواج کے لیے چند سطری اعلان کر کے یہ ادارے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فرض ادا ہو گیا۔ حالانکہ ان کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔ آج کل سرکاری اور قومی سطح پر اردو زبان کے رواج کی صورت حال عام ہوتی جا رہی ہے لیکن یہ ادارے اپنی سابقہ روش ہی پر نہ صرف قائم ہیں بلکہ اب تو

بعض ناروا پہلو بھی سامنے آ رہے ہیں۔ مثلاً انگریزی زبان کے غیر ضروری الفاظ کا استعمال اب بھی نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جو اعلانات ریڈیو اور دور نمائی پر سننے اور دیکھنے میں آتے ہیں، ان میں انگریزی زبان کے خاصے غیر ضروری الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ زبان بھی جو تقاریر، گفتگو اور مکالموں میں استعمال ہوتی ہے، انگریزی الفاظ کے بے جا استعمال سے بوجھل ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اظہار مدعا کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ احساس کمتری کا ایسا شدید غلبہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا تو لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس پر قدغن لگائی جاتی ہے لیکن جس طرح کہا جاتا ہے اس کا خیال مطلق نہیں کیا جاتا! جن اداروں کو محافظ زبان ہونا چاہیے تھا انھوں نے اپنے اس فریضے کا بالکل اہتمام نہیں کیا ہے۔

جس طرح موضوع اور متن کا احتساب کیا جا سکتا ہے اسی طرح زبان کی عدم صحت، انگریزی الفاظ کی بھرمار اور اپنے ہندسوں سے گریز کا سدباب بھی کیا جا سکتا ہے۔ مقررین اور مصنفین کو بھی پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی زبان کو انگریزی الفاظ سے پاک رکھیں۔ یہی صورت اشتہارات کے لیے بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات تجارتی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر جب انھیں اخلاقیات کا پابند رکھا جا سکتا ہے تو ان پر انگریزی سے پاک زبان کی پابندی بھی عائد کی جا سکتی ہے۔

انگریزی ہندسوں کے استعمال کا بھی کوئی قانونی اور منطقی جواز نہیں۔ دور نمائی پر صرف انگرزی ہندسے اس اہتمام کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں کہ جیسے کسی نے ان کے استعمال پر انھیں پابند کر رکھا ہے۔ حالانکہ ہماری ... کا کوئی ایسا حکم موجود نہیں ہے جس میں اردو ہندسوں

کو اردو زبان سے نکال دینے کا فیصلہ ہوا ہو اور انگریزی ہندسوں کا استعمال لازمی قرار دیا گیا ہو۔ کس قدر نادانی بلکہ افسوس کی بات ہے کہ اردو ہندسوں کے بجائے ایک غیر زبان کے ہندسے ہماری ثقافت کا جزو اور ہمارے رسم الخط کا حصہ ہیں۔ رسم الخط زبان کا لباس ہے' اس پر کوئی پیوند لگتا ہے تو ہر حال میں بدنما ہی نظر آتا ہے۔

یہی صورت حال کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ آج کل صحافت میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ متعدد اخبارات اور صحافی اپنی تحریروں میں انگریزی کے غیر ضروری الفاظ بکثرت استعمال کرنے کی روش عام کر رہے ہیں۔ عام کر ان معنوں میں کہ اخبارات ابلاغ عامہ کا ایک نہایت اہم ذریعہ ہیں۔ وہ اپنی صوری اور معنوی حیثیت میں اپنے قارئین پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اگر وہ صحیح نہج پر ہوں تو قوم کی تعمیر اور فلاح کا ایک موثر وسیلہ ہوتے ہیں۔ اگر زبان کے معاملے میں وہ محتاط رویہ اختیار کریں تو زبان کی وسعت اور اس کے مناسب استعمال کو بہت زیادہ فرغ دے سکتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کا استعمال فقط تن آسانی کا مظہر ہے خلوص اور جانفشانی کا نہیں۔

"اخبار اردو" (جون' ۱۹۸۲ء)

ہم نے کیا کھویا

زبان بظاہر انسان کی معاشرتی ضروریات کی تکمیل کا ایک وسیلہ ہے' لیکن دراصل یہ ساری معاشرت اور تہذیب و ثقافت کی تشکیل کا محرک اور ایک اہم عامل بھی ہے۔ ذہنی اور معاشرتی ارتقا اسی کے سبب واقع ہوتا ہے اور یہی بنیاد ہے جس پر معاشرے کی تہذیب اور تعمیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ ایک وسیلہ ہے جس کے طفیل انسان باہم ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے فکر و عمل میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی ہم آہنگی ایک معاشرے میں تہذیبی و معاشرتی یک جہتی پیدا کر کے ایک مشترک ثقافت کی تشکیل کرتی ہے اور اس طرح ایک مستحکم اور مربوط معاشرہ جنم لیتا ہے۔ اس ضمن میں مذہب بلاشبہ ایک نہایت موثر اور ناگزیر عامل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن زبان کے بغیر معاشرہ نہ تو مذہبی برکات سے مستفید ہو سکتا ہے اور نہ مذہبی قومیت وجود میں آ سکتی ہے۔ معاشرتی انتشار اور فکر و عمل کی عدم مماثلت معاشرے کو ایک مشترک نصب العین سے دور رکھتی ہے' چنانچہ معاشرہ مختلف سمتوں میں بٹ جاتا ہے اور اس کا اتحاد اور استحکام کمزور ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر مذہبی رشتہ بھی کسی وجہ سے کمزور ہو جائے تو پھر

معاشرہ شکست و ریخت سے نہیں بچ سکتا۔

ہمارے ملک کا معاشرہ ایک مشترک زبان (اردو) سے بہرہ مند ہے۔ متفرق ثقافتی صفات کے باوجود قوم ثقافت کی ہر سطح کے مقابلہ میں ایک مشترک زبان کی سطح پر آپس میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہے۔ یہی زبان ہے جس نے قوم کے درمیان افہام و تفہیم کے ایک گہرے رشتے کو استوار کیا ہے اور اجتماعی اور قومی وجود کے احساس کو جنم دیا ہے۔ اگر مشترک زبان کا یہ رشتہ استوار نہ رہے یا اسے قومی تقاضے کے مطابق مستحکم ہونے کا موق نہ ملے تو عین ممکن ہے کہ علاقائی' نسلی یا جغرافیائی عناصر' مشترک عناصر (مذہب اور زبان) کے مقابلے میں زیادہ قوت حاصل کر کے معاشرے کے اشتراک و اتحاد کو کمزور کر دیں۔ اگر معاشرے کی قوت نافذہ (حکومت) اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے سعی کرے تو معاشرہ متحد اور مستحکم رہ سکتا ہے اور تعمیر اور ترقی کے تمام مدارج طے کر سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک ہمارے معاشرے نے مشترک زبان کی حیات بخش اور تعمیری قوتوں کو استعمال میں نہ لا کر بڑے نقصانات اٹھائے ہیں۔ سیاسی اور قومی سطح پر مشرقی پاکستان کے سقوط بلکہ اس کی علیحدگی کے پس پشت جو ایک بڑا اور موثر داخلی عامل تھا' وہ علاقائی لسانی قومیت ہے جو مذہبی قومیت پر حاوی ہو گیا۔ اگر وہاں کے معاشرے میں مذہب کے ساتھ ساتھ ایک مشترک زبان کے شعور کو فروغ دیا جاتا اور اسے دانش مندانہ طرز عمل سے نفاذ بھی دیا جاتا تو صورت حال اس سے بہت مختلف ہوتی جو رونما ہوئی۔

صرف یہی نہیں بلکہ قومی اور تہذیبی سطح پر مذہب کے حوالہ سے جو یک جہتی نظر آتی ہے' مشترک زبان کے مکمل نفاذ سے اس میں مزید قوت اور گہرائی پیدا ہو سکتی تھی۔ علاقائی زبانوں اور علاقائی صفات نے اپنے اپنے علاقے

کو جس طرح ایک تشخص دیا ہے، ایک مشترک زبان کے ذریعے سے ملک گیر سطح پر ایک قومی اور ملکی تشخص پیدا کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں کے عرصے میں بعض گوشوں سے قومی اور ملی تشخص کے مقابلے میں علاقائی تشخص کی جو غیر موثر سی آواز کبھی کبھی سنائی دیتی رہی ہے یہ بھی وجود میں نہ آتی۔

معاشرتی اور علمی سطح پر اردو کی سب سے بڑی اور واحد حریف انگریزی زبان رہی ہے۔ اس نے ہر اس جگہ پر قبضہ جمائے رکھا ہے جس کی حق دار اصلاً" اردو زبان ہے۔ اردو ہماری تاریخ، ہماری روایات اور ہمارے مزاج سے عین مطابقت رکھتی ہے، لیکن انگریزی نے ہماری روایات اور ہمارے مزاج پر اپنے مزاج اور اپنے تشخص کی چھاپ لگائی ہے اور اس طرح اس نے سارے کاروبار مملکت، دفتروں، بازاروں اور تمدنی زندگی کے ہر گوشے پر اپنا سکہ چلا کر ہمارے معاشرے کو انگریزی معاشرت اور انگریزی مزاج کا حامل ایک طفیلی معاشرہ بنا دیا ہے۔

علمی سطح پر بھی انگریزی زبان نے اردو کی جگہ لے کر ہمارے معاشرے کی وحدت کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم حاکم پیدا کر رہا ہے اور اردو ذریعہ تعلیم محکوم۔ انگریزی تعلیم کے سبب ہمارا معاشرہ اپنی بہترین صلاحیتوں سے محروم رہ کر انہی خطوط پر گامزن ہے، جو انگریزی سامراج کا مطمح نظر تھے۔ ہم اپنی بہترین صلاحیتوں کے باوجود اپنی لسانی منافقت کے سبب تخلیقی سطح پر بھی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ ڈیڑھ سو سال تک انگریزی زبان کا تعاقب کرنے کے باوجود انگریزی ہماری مکمل دسترس سے دور رہی اور ہمارے تخلیقی عمل کا حصہ نہ بن سکی۔ اس محرومی کے باعث ہم تخلیق اور تحقیق کی سطحی موجوں کے اسیر رہے اور گہرائیوں تک نہ پہنچ سکے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی تشکیل نو کے خواہاں ہیں

اور حصول علم اور کاروبار مملکت کے لیے انگریزی کو وسیلہ بنائے ہوئے ہیں لیکن ہمارا اظہار نامکمل ہے اور ہم ابلاغ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہیں۔ قوم انگریزی سیکھنے پر مجبور ہے لیکن اس میں مہارت سے معذور ہے۔ اس کے الفاظ زبان سے ادا تو ہو جاتے ہیں لیکن خیال و فکر کا جزو نہیں بن سکتے۔ لفظ اور خیال کے رشتہ میں لفظ کا ادراک ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خیال پر حاوی ہو چکا ہے اور خیال پس پشت چلا گیا ہے۔ چنانچہ ہم تخلیق ہی میں نہیں، اظہار و ابلاغ میں بھی ناپختہ رہ گئے ہیں۔

اب ہماری جو نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں وہ گونگی اور بہری ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی قیمت مستقبل کو ادا کرنا ہوگی۔ افسوس کہ ہمیں قوم کو پہنچنے والے ایسے نقصانات کا نہ تو حقیقی احساس ہے اور نہ ان کے سد باب کی کوئی مناسب اور موثر کوشش کی جاتی ہے۔

"اخبار اردو" (نومبر، ۱۹۸۲ء)

۱۴ اگست کا تقاضہ

۱۴ اگست کا دن ہماری ملی اور قومی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور یادگار دن ہے۔ ۳۵ سال قبل اس دن برعظیم پاک و ہند کے مسلمان ایک طویل جدوجہد کے بعد اپنے مقاصد اور اپنے خواب اور اپنے تصور کو قیام پاکستان کی صورت میں ایک حقیقت کے طور پر ڈھلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ان کی زندگی میں کئی صدیوں کی طویل اور صبر آزما جدوجہد اور کئی نسلوں کی قربانیوں سے یہ خوشگوار اور مسرت انگیز مرحلہ آیا تھا۔ یہ دن ایک طرف ان کی اس کئی صدیوں پر مشتمل قومی جدوجہد کی یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف یہ ان کے لیے یوم تجدید عہد کی حیثیت بھی رکھتا ہے کہ وہ اس دن ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہوں--- جو قیام پاکستان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ انہی مقاصد میں ایک مقصد اردو کے بحیثیت قومی و سرکاری زبان نفاذ اور رواج کا بھی ہے۔

موجودہ حکومت (عہد ضیاالحق) نے بلاشبہ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوششوں کا آغاز کیا ہے اور اسے قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت میں پورے ملک میں نافذ کرنے کا عزم بھی کیا ہے۔ لیکن یہ عزم اور اس کو جائز

مقام دلانے کی کوششیں ہنوز تشنہ تکمیل ہیں۔ صوبائی حکومتوں میں سے بالخصوص پنجاب میں اردو کے دفتری زبان بنائے جانے کی صورتحال اور رفتار بہت حوصلہ افزا ہے لیکن دیگر صوبائی حکومتوں میں یہ رفتار سست نظر آتی ہے۔ سندھ کی حکومت نے تو اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر پیش رفت بھی نہیں کی۔ ان سب سے بڑھ کر جو ذمہ داری اور اہمیت وفاقی حکومت کو اس ضمن میں حاصل ہے--- اور اس لحاظ سے اسے جس قدر سرگرمی اور مستعدی دکھانی چاہیے تھی وہ اتنی واضح اور حوصلہ افزا نہیں۔ اگر وفاقی حکومت اپنا فرض پورا کردے تو صوبائی حکومتوں کے لیے اس کی پیروی کرنا بہت آسان ہو جائے گا اور انھیں اس معاملہ میں تاخیر اور چشم پوشی کا کوئی جواز نہیں مل سکے گا۔

مقتدرہ نے اس باب میں جو کوشش کی ہے اسے وفاقی حکومت کی رضامندی کے باوجود اب تک پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اردو کو دفتری و سرکاری زبان بنانے کے لیے مقتدرہ نے اپنی تجاویز مارچ ١٩٨١ء میں پیش کردی تھیں، جن پر اگر عمل کیا جاتا تو اب تک قومی زبان کے نفاذ کی راہ میں حائل مشکلات (اگر سمجھی جائیں) نہ صرف ختم ہو جاتیں بلکہ اس سلسلہ میں متعدد ضروری مراحل بھی طے ہو جاتے۔ ان تجاویز کو ٣١ اکتوبر ١٩٨١ء کو اسلام آباد میں کابینہ ڈویژن میں تمام صوبائی حکومتوں، ڈویژنوں اور وزارتوں کے نمائندوں نے اصولاً منظور کر لیا تھا۔ یہ توقع ہو گئی تھی کہ ان سفارشات کو اسی سال کابینہ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ چند دن قبل ٢٤ جون کے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ایک سوال کے جواب میں ایک مقدم وزیر نے بتایا ہے کہ "اردو کو سرکاری زبان بنانے کے متعلق مقتدرہ قومی زبان کو سفارشات حکومت کے زیر غور ہیں اور اس بات کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ اردو کو دفتری زبان بنانے کے لیے کتنا وقت لگے گا"۔

یہ صورت حال بہت مایوس کن ہے۔ اس معاملہ میں اس بلا جواز تاخیر کو دیکھتے ہوئے ملک کے دانشور کئی ماہ قبل سے حکومت سے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ اس سال ۱۴ اگست سے اردو کو دفتری و سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا جائے۔ مقتدرہ نے بھی اپنے ایک حالیہ اجلاس منعقدہ ۲۱ جون میں ایک قرار داد میں حکومت سے یہی گزارش کی ہے۔

حکومت تمام خدشات اور اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر اگر اردو کے فوری نفاذ کا اعلان کر دے تو یہ عین اسی طرح ممکن ہے جس طرح گزشتہ سال ۱۴ اگست کو جشن آزادی منانے کے لیے حکومت نے عوام کو ترغیب دی تھی --- اور جس کے نتیجہ میں صرف چند دنوں کے مختصر عرصہ میں جشن آزادی کی ایک لہر پیدا ہوئی جو کراچی سے خیبر تک چپہ چپہ اور قریہ قریہ میں پھیل گئی تھی۔ اس جشن کے اہتمام اور اس کی نوعیت و خصوصیت کو ملک کے ہر خطہ اور ہر فرد نے محسوس کیا تھا۔ عوام کے جوش اور جذبہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ حکومت کی تجویز اور ترغیب اور آزادی اور اپنے وطن سے کتنا گہرا اور قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ اس امر کا بھی واضح ثبوت تھا کہ حکومت کی سرگرمیاں قوم کی حقیقی امنگوں اور اس کی خواہشات سے ہم آہنگ ہوں تو قوم کس طرح اس کی آواز پر لبیک کہتی ہے۔ حکومت کی جانب سے ایسی ہی ترغیب قومی زبان کے نفاذ کے لیے بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر قوم سے یہ کہا جائے کہ وہ ۱۴ اگست کو یا اس تاریخ سے زندگی کے ہر شعبہ سے انگریزی کو نکال کر اردو اختیار کر لیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ عوام اپنی امنگوں اور خواہشوں سے عین مطابقت رکھنے والی قومی زبان کو اسی جوش اور جذبہ کے ساتھ اختیار نہ کر لیں جو گزشتہ سال جشن آزادی میں نظر آ چکا ہے۔ اس وقت تو قوم کو صرف چند یوم کی مدت ملی تھی لیکن اب یہ مدت ایک ماہ سے زیادہ عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر

حکومت چاہے تو--- اس کی ایک تجویز تمام راستوں اور بازاروں سے انگریزی کی اجارہ داری کو ختم کر سکتی ہے اور اس کی ایک ہدایت تمام دفتروں میں اردو کے استعمال کا آغاز کر سکتی ہے۔

شہری ترقیاتی اداروں کا فرض

قومی زبان کے رواج کو ملک کے تقریباً ہر علاقہ میں آج کل جو پذیرائی اور پیش رفت حاصل ہو رہی ہے، وہ بہت خوش آیند اور حوصلہ افزا نظر آتی ہے۔ ان مختلف اسباب کے باوجود، جو قومی زبان کے راستہ میں رکاوٹ کا باعث ہیں اور جن کی طرف ملک کا اہل دانش اور پر خلوص طبقہ وقتاً فوقتاً اشارہ کرتا رہتا ہے، اردو کو بہرحال نہ صرف فروغ حاصل ہو رہا ہے بلکہ متعدد عوامی اور انتظامی اداروں میں اس کے بتدریج رواج کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ ایسے ہی اداروں میں سے "ادارہ ترقیات کراچی" نے بھی گزشتہ دنوں قومی زبان کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس ادارہ نے اپنے قیام کے پچیس سال مکمل ہونے پر نئے مالی سال ۱۹۸۲ء --- ۱۹۸۳ء کا میزانیہ پہلی بار اردو میں تیار کیا ہے اور اپنے جشن سیمیں کے موقع پر قومی زبان کو رواج دینے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

یہ خبر قومی زبان کے نفاذ اور رواج سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی مسرت انگیز ہے۔ کراچی ہر حیثیت سے ملک کا سب سے بڑا شہر ہی نہیں --- بلکہ اب اسے جمہوری، قومی اور ملی اقدار کے لحاظ سے بھی بڑی

اہمیت حاصل ہے۔ صنعتی اور تجارتی رابطہ نے بھی اسے ملک کے ہر خطہ سے منسلک کر رکھا ہے اور اس میں ہونے والی ترقیوں سے ملک کی ایک بڑی آبادی فیض اٹھاتی ہے۔ چنانچہ آج اس کے رویوں اور افکار و حوادث سے ملک کا تقریباً ہر خطہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ایسے شہر میں اس کے ایک بڑے اور ذمہ دار ادارہ کا قومی زبان کو اختیار کرنا بڑا موثر' دور رس اور نتیجہ خیز ثابت ہو گا۔ یہ ادارہ نہ صرف کراچی کو کشادگی اور بلندیاں عطا کر رہا ہے بلکہ اسے ترقی یافتہ شہروں کی صف میں جگہ دلانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ قومی زبان کو اختیار کرنے کا اس کا فیصلہ بڑی حد تک سارے شہر--- بلکہ اس اعتبار سے پورے ملک کو متاثر کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ فیصلہ نہایت مستحسن ہے اور اس پر ادارہ کی ہیئت حاکمہ پورے ملک کی جانب سے مبارکباد کی مستحق ہے۔

لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی ادارے کا قومی زبان میں میزانیہ پیش کر دینا اور مستقبل میں اسے اختیار کر لینے کا ارادہ ظاہر کر دینا ہی کافی نہیں۔ اس ضمن میں اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی انجام دہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ قومی زبان کی حریف انگریزی زبان کو وہ اپنے ادارہ کی تمام حدود سے نکال باہر نہ کرے۔ جہاں تک دفتری امور کی انجام دہی کا تعلق ہے اس میں یک قلم نہ سہی بتدریج اردو کو رواج دیا جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ملک کے دیگر کئی اداروں اور خصوصاً حکومت پنجاب اور حکومت آزاد کشمیر کے ماتحت دفاتر کی مثال پیش نظر رکھی جا سکتی ہے--- جہاں اب دفتری کام اردو میں انجام دیا جاتا ہے۔ صرف وہ مراسلت اس سے مستثنیٰ رکھی جا سکتی ہے جو غیر ممالک اور اداروں سے انگریزی زبان میں کرنی ناگزیر ہو۔

اس کے علاوہ قومی زبان کے رواج اور فروغ کے ایسے متعدد کام ہیں جو "ادارہ ترقیات کراچی" اور دوسرے شہروں کے ایسے ہی ادارے بڑی

سہولت اور آسانی کے ساتھ فوری طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ مثلاً علاقوں اور سڑکوں کے نام جو اگر انگریزی میں ہوں تو انھیں فوری طور پر تبدیل کر کے اردو کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر نئے علاقے تعمیر ہو رہے ہوں اور نئی سڑکیں بن رہی ہوں تو ان کے نام اردو ہی میں رکھے جا سکتے ہیں۔ انگریزی ناموں کے رکھنے کا یقیناً کوئی سرکاری حکم موجود نہیں۔ اس لیے کوئی جواز نہیں کہ "ڈیفنس سوسائٹی کراچی" کے زیادہ تر حصوں میں سڑکوں کے نام صرف انگریزی میں رکھے گئے ہیں، جب کہ اسی آبادی میں کسی کسی علاقہ میں اردو کے دلنشیں نام بھی نظر آتے ہیں۔ یقین ہے کہ ایسے انگریزی ناموں کو اردو میں منتقل کرنے سے کہیں سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہو گی--- بلکہ ستائش ہی کی جائے گی۔

آج کل تقریباً ہر بڑے شہر میں ترقیاتی اور تعمیراتی کام زور و شور سے انجام پا رہے ہیں۔ خصوصاً کراچی میں ترقیاتی اور تعمیراتی سرگرمیاں نہایت عروج پر ہیں۔ ہر سمت میں نئے نئے رہائشی علاقے تعمیر ہو رہے ہیں اور ہر سڑک پر بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ ان تمام تعمیراتی کاموں کی ذمہ داری بعض صورتوں میں ایک حد تک اور بعض صورتوں میں بڑی حد تک "ادارہ ترقیات" کے سر عائد ہوتی ہے۔ جو نئے رہائشی علاقے تعمیر ہوتے ہیں ان کی منصوبہ بندی اسی کے ذمہ ہے--- اور جو عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں ان کی منظوری یہی ادارہ عطا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اس ادارہ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس پر بہت بڑی قومی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔ اگر یہ ادارہ چاہے تو سارے شہر میں اردو کا بول بالا ہو سکتا ہے۔ جن علاقوں اور سڑکوں کے نام انگریزی میں ہیں وہ اردو میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں اور جو نئے رہائشی علاقے تعمیر ہو رہے ہیں ان کے لیے ---- اسکیم، ٹاؤن، میٹروول، سوسائٹی جیسے الفاظ، اور جو

عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں ان کے لیے "کمپلیکس، پلازا، آرکیڈ، سینٹر، اپارٹمنٹس، بنگلوز" جیسے الفاظ متروک کیے جا سکتے ہیں--- بلکہ آیندہ کے لیے ممنوع کیے جا سکتے ہیں۔ تمام تعمیرات کے لیے جب اس ادارہ کی جانب سے قانونی، فنی اور تکنیکی قسم کی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں تو صرف قومی زبان میں نام رکھنے کی پابندی بھی لگائی جا سکتی ہے۔ اس عمل میں ادارہ کے لیے نہ کسی اجازت اور سرمایہ کی ضرورت ہے اور نہ مدت اور معیاد درکار ہے۔

ہماری یہ گزارش ان تمام ترقیاتی اور بلدیاتی اداروں سے بھی ہے جو کراچی کے علاوہ دیگر شہروں میں ترقیاتی اور تعمیراتی امور کی انجام دہی کے ذمہ دار ہیں۔ قومی زبان کے رواج اور فروغ میں ان کی یہ ایک معمولی سی توجہ ملک اور قوم کے تشخص کی راہ میں نہایت موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو گی۔

شہروں، سڑکوں، عمارتوں
کے
انگریزی نام

گزشتہ دنوں بلدیہ کراچی کی کونسل کے ایک اجلاس کے دوران شہر کی سڑکوں کے انگریزی ناموں کے مسئلہ پر ایوان میں کچھ دیر بحث ہوئی۔ بعض شرکائے بحث کا خیال تھا کہ انگریزی اور ہندو نام تبدیل کیے جائیں۔ ایک رکن عبدالخالق اللہ والا نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر ہندو اور انگریز نے اس شہر کی ترقی کے لیے کچھ کام کیا ہے تو اس کے نام سے کسی سڑک کو موسوم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ بحث کسی مثبت نتیجہ تک نہ پہنچ سکی اور ختم ہو گئی۔

افسوس کہ یہاں فاضل رکن نے کسی مخصوص نام کی نشاندہی نہیں فرمائی کہ کسی انگریز یا ہندو نے اس شہر کی ترقی کے لیے کچھ کام کیا ہو اور اس کے نام پر کوئی سڑک موسوم کی گئی ہو! اس نقطہ نظر سے کہ کسی شخص نے شہر کی تعمیر و ترقی یا انسانی بھلائی کے لیے کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہو اور اس کے

نام سے شہر کی کسی سڑک یا بستی کو موسوم کیا جائے--- شاید کسی کو انکار نہ ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا کوئی انگریز یا ہندو ایسا گزرا بھی ہے کہ جس کے نام سے کوئی سڑک یا بستی موسوم کی گئی ہو؟ ہمارے علم کی حد تک تو شہر میں سڑک اور بستی کے نام جس جس انگریز یا ہندو کے نام پر رکھے گئے ہیں' اس نے نہ تو اس شہر کی ترقی ہی میں کوئی حصہ لیا نہ اس شہر اور اس سے تعلق رکھنے والے باشندوں کی تاریخ' تہذیب و ثقافت اور سیاست ہی سے اس کا کوئی مثبت رشتہ قائم ہوتا ہے۔ انگریزوں یا ہندوؤں کے جتنے بھی نام ملتے ہیں---- وہ سب ہی کسی نہ کسی طرح یا تو انگریز حکومت کے نمایندے تھے یا عمال حکومت' جو محض استعماری مقاصد رکھتے تھے اور ان کا رویہ اور کردار سراسر استبدادی اور استحصالی تھا۔ اگر انھوں نے شہر بھی تعمیر کیے' شاہراہیں اور پل بھی بنائے تو صرف اپنے استعماری مفاد کو پیش نظر رکھ کر۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان ناموں میں سرولیم جونز' تھامس آرنلڈ' ڈاکٹر لائٹز' کرنل ہالرائیڈ' سی ایف اینڈریوز' سروجنی نائیڈو یا ایسے اور نام کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ اس اعتبار سے سرگنگا رام ہسپتال (لاہور) اور اسپنسر ہسپتال (کراچی) کے نام تبدیل کرنے کا بھی کوئی اخلاقی جواز نہیں--- اور نہ ہی ان کے یا اس طرح کے کسی نام کی تبدیلی پر کوئی اصرار ہونا چاہیے۔

چونکہ مذکورہ بحث کراچی کے ایک منتخب اور نمایندہ ایوان میں ہوئی ہے' اس لیے اس کے دائرہ کار کا اطلاق بڑی حد تک اسی شہر پر ہوتا ہے' لیکن دراصل یہ صورت حال اور یہ نقطہ نظر صرف اسی شہر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ملک کے تقریباً ہر شہر میں کوئی نہ کوئی سڑک اور بستی---- حصول آزادی کے بعد' ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود--- اب تک اپنے "انگریز آقاؤں" کی یاد دلاتی ہے۔ اور یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہم اب بھی

ان کی غلامی کے سحر میں مبتلا ہیں۔ ایسی مرعوبیت' چاہے انگریزوں کی ہو یا ہندوؤں کی' بہرحال اسلامی اور پاکستانی قومیت کے نقطہ نظر سے جائز نہیں۔ وہ نام جو ہماری اپنی تاریخ' تہذیب اور ثقافت کا حصہ نہیں' ان سے ہمارا کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہیں رہنا چاہیے۔ ہمارے معاشرہ میں ایسے نام ہماری قومیت کی نفی کرتے ہیں اور ہمارے اسلاف --- اور ان لوگوں سے' جو ہماری قوم اور قومیت کی تشکیل اور آزادی کے لیے برسرپیکار رہے' بلکہ اپنی جانیں قربان کرتے رہے' غداری کے مترادف ہیں۔

آج یورپ کو مسلمانوں کے ان احسانات کا احساس ہو رہا ہے' جو علم اور تمدن کے ارتقاء میں مسلمانوں نے کیے ہیں اور جن سے یورپ مستفید اور متاثر ہوا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں نے وہاں شہر آباد کیے اور عجائبات دنیا تعمیر کیے --- بلکہ انھیں جینے کا قرینہ بھی سکھایا اور انھیں علم سے بھی مالا مال کیا' لیکن وہاں احساس سپاس میں کسی مسلمان کے نام کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ مسلمانوں کی ہر میراث' یہاں تک کہ ان کے نام و نشان کو بھی مٹا دیا گیا۔ یہی صورت ہمسایہ ملک میں بھی بڑی آسانی سے مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ کتنے ہی شہر ہیں' جو وہاں مسلمانوں کے دم قدم سے آباد اور بارونق ہوئے تھے۔ اس ملک کے قریہ قریہ اور چپہ چپہ میں موجود اسلامی تہذیب و تمدن کے آثار اسے ساری دنیا کا مرکز نگاہ بنائے ہوئے ہیں' لیکن وہاں نہ صرف سڑکوں اور بستیوں کے اسلامی ناموں ہی کو تبدیل کر دیا گیا ہے --- بلکہ اب تو ایسی کوششیں بھی اعلانیہ ہو رہی ہیں' جن کے تحت صرف اور صرف مسلمانوں سے نسبت رکھنے کے باوجود تاریخی آثار و عمارات اور شہر ہندو ناموں سے منسوب ہو جائیں۔

یہ وہ مثالیں ہیں کہ جہاں مسلمانوں کے تعمیری حصہ کی واضح علامتیں موجود ہیں' لیکن جن سے لاتعلقی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ان کے برعکس ایک یہ

مثال ہے کہ ہمارے ملک میں وہ نام --- کہ جو کسی حقیقی تعمیری کارنامہ سے منسوب نہیں' نہ صرف باقی رکھے گئے ہیں بلکہ ان کے باقی رکھنے پر اصرار بھی کیا جا رہا ہے۔ وہ افراد بھی ہماری ہی قوم کے فرد ہیں --- جو ان ناموں کے باقی رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں --- اور وہ افراد بھی ہماری قوم میں موجود ہیں' جو اختیار رکھنے کے باوجود بھی اس اہم اور ضروری تبدیلی کو انجام دینے سے نہ صرف اب تک صرف نظر کیے ہوئے ہیں بلکہ مذکورہ اصرار پر صاد بھی کیے بیٹھے ہیں۔ جب لائل پور جیسا معروف نام کچھ ہی عرصہ میں ذہنوں تک سے محو ہو سکتا ہے تو ایبٹ آباد اور جیکب آباد جیسے نام کیوں نہیں بدل سکتے؟ اس وقت ملک کے ہر شہر میں متعدد محلوں اور سڑکوں اور چوراہوں کے نام عہد غلامی کی یاد دلاتے ہیں --- ان کے ناموں کی تبدیلی میں کونسے اقتصادی اور قومی و بین الاقوامی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے؟ لائل پور کا نام اگر چند دنوں میں فیصل آباد ہو کر زبان زد خاص و عام ہو گیا --- تو اس سے ملکی یا بلدیاتی بجٹ پر کتنا بوجھ بڑھ گیا؟ جو نئی سڑکیں بنتی ہیں اور نئی آبادیاں بستی ہیں' ان کے انگریزی نام نہ رکھنے میں کیا امر مانع ہے؟ اگر نئی عمارتیں تعمیر ہوں تو ان پر --- قانونی' فنی اور تکنیکی قسم کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ انگریزی نام نہ رکھنے کی بھی اگر پابندی عائد کر دی جائے --- تو کون سی قیامت آ جائے گی؟۔

یہ ایسے نہایت سہل اور ممکن العمل امور ہیں --- جن کی انجام دہی کے لیے متعلقہ اداروں کو شاید کسی صدارتی حکم یا نفاذ قانون کی بھی ضرورت نہ ہو گی --- اور نہ ہی کوئی مالی رکاوٹ پیش آئے گی' بس صرف نیت اور خلوص کی ضرورت ہے۔

نوشتہ دیوار

گزشتہ دنوں مجلس تعلیم اعلیٰ ثانوی کراچی کے حوالہ سے یہ خبر بھی اہل درد کے لیے مسرت انگیز ثابت ہوئی کہ مجلس اپنی اسناد اب انگریزی کی بجائے اردو میں شائع کرے گی۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے فارم اردو میں شائع کرانے کے انتظامات بھی کیے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی مجلس کی تمام دفتری کارروائی قومی زبان میں انجام دینے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔

ملک میں اردو کے نفاذ کی سست روی کو دیکھتے ہوئے یہ خبر بھی غنیمت معلوم ہوئی کہ ایک اور ادارہ نے قومی زبان کو اس کا جائز مقام دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس فیصلہ کے پس منظر کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ بحالت مجبوری عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ اپنا وہ اثر باقی نہیں رکھتا--- جو قومی زبان کے رواج کی خبروں سے ملک اور قوم کے بہی خواہوں کے دل و دماغ پر قائم ہوتا ہے۔ مجلس کے ترجمان نے اردو کے اختیار کرنے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ طلبہ کو انگریزی فارم پر کرنے میں خاصی دقت ہوتی ہے، وہ اسے اپنے اساتذہ یا والدین سے پر کراتے ہیں۔ اگر وہ خود پر کریں تو غلطی کرتے ہیں، اس لیے مجلس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر قسم کے فارم اردو میں

شائع کیے جائیں تاکہ کسی کو کوئی دقت نہ ہو۔

اس پس منظر میں مجلس کا فیصلہ بحالت مجبوری عمل میں آیا ہے --- لیکن بہرحال اگر یہ فیصلہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو مجلس یقیناً اس کے لیے قابل مبارک باد ہے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ آج کراچی مجلس کے ایک ذمہ دار افسر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ طلبہ میں انگریزی کا معیار اس حد تک گر چکا ہے کہ وہ اب فارم بھی خود پر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے' تو اس لحاظ سے ملک کے دیگر طلبہ اور بالخصوص دیہی علاقوں کے طلبہ کی انگریزی استعداد کا کیا حال ہو گا' جو انگریزی سے اس حد تک قریب نہیں رہتے جتنے کہ شہروں کے طلبہ' جو اپنے ماحول کے زیر اثر اسے اپنا طرہ امتیاز بنائے رکھتے ہیں۔ جب یہی معیار لے کر طلبہ کاروبار مملکت میں شریک ہوتے ہی' جہاں ہر ہر قدم پر انھیں انگریزی کو استعمال کرنا ناگزیر ہوتا ہے تو کاروبار مملکت کی مناسب انجام دہی کے لیے کس حد تک حوصلہ افزا تصور قائم کیا جا سکتا ہے؟۔

دفتروں میں بھی ایک عرصہ سے ایسی صورتحال دیکھنے میں آ رہی ہے۔ سارا دفتری کام انگریزی میں انجام دیا جاتا ہے لیکن مناسب استعداد کار کے دفتری کارکن اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ انگریزی مسودہ نویسی اور مراسلت وغیرہ اپنے اسی اسلوب اور بندھے ٹکے انداز میں ہیں جو انگریزوں کے زمانہ میں رائج تھے۔ چند مخصوص القاب' جملے اور الفاظ ہیں جنھیں۔ ہیر پھیر کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے افسران بھی دیکھے گئے ہیں جو بازار سے اسی قسم کی سطحی معاون کتب لے کر مسودہ نویسی اور مراسلت کی مشق فرماتے ہیں اور انہی کی مدد سے دفتری امور انجام دیتے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں کبھی کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا ہے تو ایسے افسران کو اپنے سے مقدم (سینئر) یا پرانے وقتوں کے سبکدوش افراد سے مدد طلب کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ نچلی سطحوں پر تو

عالم ہی اور ہے۔ بی اے کی سند حاصل کر لینے کے باوجود لوگ انگریزی میں خود درخواست نہیں لکھ سکتے۔ انگریزی میں دفتری ریکارڈ کو درست حالت میں رکھنے والے اہلکار بھی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔

ایسی صورت میں اس قسم کے افسران اور اہلکاروں سے قوم اور ملک کو کس حد تک بہتری کی توقع ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں بے پناہ افرادی قوت اور صلاحیت کار موجود ہے جو اگر صحیح طور پر استعمال میں آئے تو ملک اور کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جب منصوبہ سازی' تنظیم کار اور ابلاغ کا انحصار انگریزی زبان پر ہو تو مستقبل کے بارے میں کیا امکان باقی رہ جاتا ہے۔ آخر یہی نسل تو ملک و قوم کے مقدر کی ضامن ہو گی--- جو مملکت کی موجودہ سرکاری زبان انگریزی میں فارم بھی خود پر نہیں کر سکتی۔ یہ نوشتہ دیوار ہے--- جسے پڑھ کر قوم اور کار پردازان مملکت کو مستقبل کے بارے میں فوری طور پر فیصلہ کر لینا چاہیے۔ انگریزی کی گرتی ہوئی دیوار کے نیچے قوم کچلی تو جا سکتی ہے---- لیکن گرتی ہوئی دیوار پھر اپنی سابقہ حالت پر واپس نہیں جا سکتی۔

تازہ غلامی

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی سرشت اور اپنی فطرت سے ہٹ کر کوئی کام کرسکتا ہے۔ اس کے لیے مصمم ارادہ اور ثابت قدمی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے بہت کم انسان' اپنی سرشت اور فطرت کو بدلنا چاہیں تو' اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایسی فطرت کا انطباق عادات و اطوار پر بھی ہو سکتا ہے اور اعمال و افعال پر بھی۔ زبان کے معاملہ میں دیکھا جائے تو ایک عرصہ سے انگریزی زبان' یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہماری ساری قوم کے مزاج میں داخل ہوگئی ہے اور ہماری قوم کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ لاکھ ہم اس مزاج اور فطرت کو بدل ڈالنا چاہیں اور اس کے لیے چاہے کیسی ہی شعوری کوشش کر ڈالیں اور احساس غلامی تازہ کریں' یہ فطرت ہے کہ بدلتی ہی نہیں اور احساس ہے کہ غیرت کا روپ دھارتا ہی نہیں۔ اس کی بجائے ہر نیا دن ہمارے معاشرہ کو انگریزی زبان کے کسی نئے استعمال سے "آراستہ" اور اردو کے اخراج سے پیراستہ کرتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کوئی بھی نئی دکان کھلتی ہے' کوئی نئی عمارت بنتی ہے' کوئی نئی آبادی بستی ہے یا کوئی سڑک تعمیر ہوتی ہے تو اس کا نام انگریزی ہی میں رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے---- اور یہی "چچتا ہوا"

محسوس ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب نام انگریزی میں تجویز ہو گیا تو اس کو اردو رسم خط میں لکھنے میں مناسبت کیوں کر نظر آئے گی۔ چنانچہ اب گلیوں اور بازاروں میں --- چاہے یہ گلیاں اور بازار قصبات اور دیہات ہی کی کیوں نہ ہوں --- ہر طرف انگریزی زبان اور ہندسوں کی جلوہ فرمائی ہے۔ اور اب اس زبان کی استعماریت نہ کسی کو محسوس ہوتی ہے اور نہ کسی ایسا کرنے والے کو اس روز افزوں غلامی کا احساس ہوتا ہے --- جو اس کی وجہ سے اس کے معاشرہ اور ماحول پر مسلط ہو رہی ہے۔

معاشرہ میں ایسی کوئی قوت یا ادارہ نہیں جو اس نوع کی صورت حال پر نظر رکھے' اسے روکے یا اس پر پابندی عاید کرے۔ حکومت کا بھی کوئی محکمہ یا ادارہ ایسا نہیں جو اس معاملہ کو اپنے دائرہ کار میں سمجھتے ہوئے ایسے اقدام پر کوئی قدغن لگائے۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ جب محکموں کا یہ حال ہے کہ اگر کسی وقت ان کے کاموں میں قومی زبان کا کسی حد تک بھی کوئی عمل دخل ہوا تو وہ مستقل نہ رہ سکا۔ محکموں نے یہ جوا جلد ہی اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔ محکمہ ڈاک کی مثال سامنے ہے۔ ایک سہانا دور اس میں ایسا بھی گزرا ہے کہ اس کے ٹکٹوں پر اردو ہندسوں کو بھی جگہ مل گئی تھی' لیکن اب انگریزی ہندسوں ہی کی حکمرانی ہے۔ ٹیلی ویژن پر کبھی اردو ہندسے بھی دیکھنے میں آتے تھے' لیکن اب عنقا ہو گئے ہیں۔ اردو الفاظ کے ساتھ انگریزی ہندسے اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں جیسے یہ اردو ہی کے ہندسے ہوں --- یا جیسے اردو میں ہندسوں کا وجود ہی نہیں۔ اب ایک اور محکمہ کے توسط سے ہماری تازہ غلامی کی یہ مثال بھی سامنے آئی ہے کہ جہاں اردو ہندسے استعمال میں تھے --- اب انھیں ترک کر کے صرف انگریزی ہندسے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ محکمہ قومی شناختی کارڈ جاری کرتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک جاری ہونے والے شناختی کارڈوں پر اردو

ہندسے لکھے جاتے تھے، معلوم نہیں کس حکم یا کس تحریک کے نتیجہ میں اردو ہندسوں کی بجائے اب صرف انگریزی ہندسے لکھے جاتے ہیں۔

"مشتے از نمونہ" یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ ورنہ کوئی محکمہ فخر کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ملک و ملت کے اس ناگزیر تقاضہ کو پورے خلوص اور اپنی ذاتی دلچسپی سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال میں بعض قومی مالیاتی اداروں نے اور اکا دکا قدرے آزاد اداروں نے قومی زبان کو اختیار کرنے کی کوشش ضرور کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں۔ یہ اگرچہ ان کا فرض تھا--- لیکن پوری قوم ان کی معترف ہوگی کہ انھوں نے اس "اردو گریز فضا" میں اپنے فرض کی بجا آوری میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ حکومت پنجاب کے بیشتر اور حکومت صوبہ سرحد اور حکومت بلوچستان کے متعدد محکمے بھی اپنے اس قومی فرض کی تکمیل میں پرخلوص کوششیں کر رہے ہیں۔ پوری قوم نے ان سے حوصلہ افزا امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ قوم حکومت سندھ سے بھی مایوس نہیں ہے۔ یقیناً اس میں ایسے درد مند اور پرخلوص افراد موجود ہیں جو اپنے فرض کو پہچانتے ہوئے قومی زبان کو اس کا جائز اور مناسب حق دلانے میں مزید پس و پیش سے کام نہیں لیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وفاقی حکومت کے ذمہ دار اراکین کی ذرا سی دلچسپی قومی زبان کے رواج کی راہ میں حائل پس و پیش کی اس کیفیت کو ختم کرنے میں بڑا موثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ بعض محکموں کی یہ خود سری، جس کا ذکر اوپر کیا گیا، ضرور ارباب اختیار کی نظر میں ہوگی--- اور وہ ان محکموں کو مذکوہ حالیہ اقدام سے، جو غلامی کو نئے سرے سے اختیار کر لینے کے ذیل میں آتا ہے، نہ صرف باز رکھیں گے بلکہ قومی زبان کے رواج و نفاذ کے لیے سنجیدگی اور خلوص

کے ساتھ اپنا عین قومی فریضہ مناسب طور پر انجام دیں گے۔

قومی زبان کا نفاذ ـــ ہم کہاں رہ گئے

قومی زبان کی لیے یہ امر خوش آیند ہے کہ موجود حکومت کے عہد (عہد ضیاالحق) میں اس کی اہمیت و افادیت کا کماحقہ اعتراف کیا گیا ہے اور اسے بہ حیثیت ذریعہ تعلیم اور بطور دفتری زبان اختیار کرنے کی ضرورت کو محسوس بھی کیا گیا ہے۔ ویسے سابقہ حکومتوں میں سے ہر حکومت نے اردو کو اپنے دستور میں رکھا اور زبانی وعدے کیے، لیکن انھوں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ زبانی وعدوں کو عملی صورت بھی دیں۔ یہ ضرور ہوا کہ اردو کے لیے چند ادارے قائم ہوئے جن کے ذمے مختلف کام کیے گئے، لیکن کوئی ادارہ ایسا قائم نہیں ہوا جسے اردو کی ترقی سے بڑھ کر نفاذ و ترویج اردو کا کام سپرد ہوا ہو۔ قومی زندگی اور سرکاری امور میں اردو کے نفاذ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے صدر ضیاء الحق نے صرف یہی نہیں کیا کہ مقتدرہ قومی زبان کی شکل میں ایک ادارہ قائم کیا، جو اپنی تشکیل و کارکردگی کے لحاظ سے کسی وزارت کے ماتحت نہیں بلکہ راست صدر مملکت کے ماتحت تھا اور وہ دفتری گورکھ دھندوں سے آزاد ہو کر سہولت اور سرعت کے ساتھ اپنی سفارشات کو صدر مملکت سے منظور کرا کے روبہ عمل لا سکتا تھا۔ صدر ضیاء الحق نے قومی زبان کے نفاذ کے

ایک ابتدائی مرحلے میں ایک تو اپنے ماتحت دفاتر کو ہدایت کی کہ وہ اپنے امور میں زیادہ سے زیادہ قومی زبان کو استعمال کریں' اور دوسرے خود اردو کو استعمال کرنے کا عملی اظہار کر کے افسران بالا دست کے اس احساس کمتری کے لیے ایک مثال قائم کی---- جو انھیں انگریزی استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ صدر ضیاء الحق نے صرف ملکی سطح پر نہیں بلکہ چین اور کیوبا وغیرہ میں اردو زبان میں تقریریں کر کے اپنی زبان کو صرف قومی نہیں' بین الاقوامی حیثیت بھی دے دی۔

صدر ضیاء الحق نے اپنی ذاتی دلچسپی اور اپنی سرکلدی ذمہ داریوں میں جس خلوص کے ساتھ اردو کا استعمال کیا ہے' ماضی کے کسی سربراہ مملکت سے اس حوالہ سے ان کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان کی دلچسپی اور جرات مندی کا نتیجہ ہی تھا کہ اردو کے نفاذ کی راہ میں جو ایک تعطل اور بے حسی طاری ہو گئی تھی وہ کسی حد تک دور ہو گئی اور یہ امید بندھی کہ اب جلد قومی زبان سرکاری امور اور قومی زندگی میں اپنی جگہ لے سکے گی۔ صدر ضیاء الحق نے اردو کے نفاذ کو قابل عمل بنانے کے لیے' مقتدرہ قومی زبان کو فروری ۱۹۸۱ء میں اس کے قیام کے بعد اس سلسلے میں ایسی ہدایات دیں کہ وہ سفارشات مرتب کرے جن کی روشنی میں اردو کو بتدریج تمام سرکاری امور میں نافذ کیا جا سکے۔ مقتدرہ نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی سفارشات اگلے ہی ماہ مرتب کر کے پیش کر دیں' جنھیں ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو اسلام آباد کابینہ ڈویژن میں تمام صوبائی حکومتوں' ڈویژنوں اور وزارتوں کے نمائندوں نے اصولاً" منظور بھی کر لیا---- اور یہ توقع پیدا ہو گئی کہ ان سفارشات کو اسی سال کابینہ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا' لیکن افسوس کہ دو سال تک یہ سفارشات منظوری کے لیے کابینہ کے اجلاس میں پیش ہی نہ ہو سکیں۔ اس عرصے میں مقتدرہ کے ارکان' جو

آغاز کار میں صدر ضیاء الحق کی ان یقین دہانیوں سے سرشار رہے کہ مقتدرہ براہ راست صدر مملکت کے ماتحت رہے گا اور اس کی سفارشات کو راست رسائی حاصل ہو سکے گی' ان دفتری گورکھ دھندوں سے سخت مضطرب رہے کہ نہ مقتدرہ کی سفارشات کابینہ میں پیش ہوتی ہیں نہ انھیں منظوری حاصل ہوتی ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے کابینہ ڈویژن کے اجلاس کے تقریباً" دو سال کے طویل عرصے کے بعد کہیں یہ سفارشات کابینہ کے اس اجلاس میں جو صدر مملکت کے بیرون ملک دورے پر روانگی کے وقت منعقد ہوا' اس انداز میں پیش ہوئیں کہ صدر مملکت اس اجلاس کو زیادہ وقت نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ ان سفارشات کی صرف چند شقوں پر گفتگو ہو سکی کہ اجلاس ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ان سفارشات کا کیا حشر ہوا ---- حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا' نہ ہی کوئی امید افزا بات سامنے آ سکی۔

مقتدرہ نے جو سفارشات پیش کی تھیں' وہ تدریجی اور مرحلہ وار تھیں۔ اور اگر ان پر بروقت عمل ہوتا تو نفاذ اردو کا سلسلہ اگست ۱۹۸۱ء سے شروع ہو کر تین سال (۱۹۸۴ء) میں مکمل ہو جاتا ---- لیکن افسوس کہ آج ۱۹۸۸ء تک اس سلسلے کا ابھی حقیقی آغاز بھی نہ ہو سکا۔ اس عرصے میں افسران بالا دست کی جانب سے ۱۹۸۱ء کے آخر میں یہ اطلاع ملی تھی کہ تمام سرکاری محکموں میں اردو باضابطہ دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کا قومی سطح پر جو پروگرام مرتب کیا گیا ہے اس پر عمل درآمد کا آغاز اگلے سال اگست ۱۹۸۲ء سے ہو گا اور چھے سال کی مدت میں یہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ اس ضمن میں یہ بتایا گیا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی اس مقصد کے لیے آخری میعاد ۱۹۸۸ء ہی مقرر ہے۔ قومی زبان کے نفاذ کی اس مایوسی اور جمود و سکوت کی حالت میں آج یہ بھی خوش آئند ہوتا اگر اگست ۱۹۸۲ء سے نفاذ اردو کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور

اس طرح یہ اگست ۱۹۸۸ء تک مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن اب صاف ظاہر ہے کہ چونکہ یہ سلسلہ ابھی تک شروع نہیں ہو سکا اس لیے اس اعتبار سے قومی زبان کا نفاذ ان منطقی، تدریجی اور مرحلہ وار سفارشات کی مناسبت سے جنھیں مقتدرہ نے اپنے آغاز کار میں پیش کیا تھا، شاید ۱۹۹۱ء تک بھی ممکن نہ ہو سکے۔ بلکہ آثار اور نتیجیں تو کسی طور پر بھی حوصلہ افزا نظر نہیں آتیں۔

اس صورت حال میں کہ اردو کے نفاذ کے لیے حکومت کا مقتدر اعلیٰ (صدر مملکت) اس کے نفاذ کا نہ صرف خواہش مند بلکہ مصر بھی رہا ہے اور اردو کو دفتری زبان بنانے میں جو مبینہ مشکلات تھیں، وہ دور ہو چکی ہیں۔ اردو میں تمام ضروری دفتری اور قانونی اصطلاحات کی فرہنگیں شائع ہو چکی ہیں، جو تمام امور کی انجام دہی کے لیے کافی ہیں، اردو ٹائپ رائٹر اس وافر تعداد میں بن چکے ہیں کہ فیکٹری میں انھیں رکھنے کی جگہ نہیں رہی۔ یہاں تک کہ اردو ٹیلی پرنٹر بھی تیار ہو چکے ہیں اور کہیں کہیں استعمال میں بھی آ رہے ہیں۔ صدر مملکت کی خواہش پر مقتدرہ نے ایک راہ عمل بھی تیار کر کے دے دی تھی۔ لیکن ان تمام ضروری سہولتوں کے باوجود اگر قومی زبان کو اس کا حق نہیں ملتا تو صاف ظاہر ہے کہ کچھ درمیانی رکاوٹیں ہیں جو اس کا نفاذ نہیں چاہتیں اور اس کی راہ میں اب واحد اور سب سے بڑی دیوار کی حیثیت سے باقی رہ گئی ہیں۔

یہی وہ رکاوٹیں ہیں کہ جن کی وجہ سے غالباً ہر مثبت قوت مفلوج ہو کر رہ گئی ہے اور یہی وہ عوامل ہیں کہ جو تمام مثبت فیصلوں سے خود انحراف کرتے ہوئے، انھیں غیر موثر بنا رہے ہیں۔ ذریعہ تعلیم کے باب میں ذمہ دار وزیروں کے ایسے بیانات کچھ عرصے تک اہل وطن کے لیے خوشی اور امید کا باعث رہے کہ "تمام تعلیمی اداروں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق حکومت کی پالیسی سے کوئی انحراف گوارا نہیں کیا جائے گا۔ اور مقررہ میعاد (۱۹۸۷ء) ختم

ہونے پر تمام امتحانات صرف قومی زبان میں ہوا کریں گے اور جو تعلیمی ادارے اس قومی تعلیمی پالیسی سے انحراف کریں گے انھیں اپنے طلبہ کو امتحانات دلوانے کے لیے برطانیہ بھیجنا پڑے گا" ۱۹۷۹ء میں ذریعہ تعلیم کے ضمن میں تدریجی طریقہ کار کو وضع کیا گیا تھا اور یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ۱۹۸۰ء سے پہلی جماعت میں اردو کو مکمل ذریعہ تعلیم کی حیثیت دی جائے گی اور پھر یہ سلسلہ ہر سال بتدریج اگلی جماعتوں تک بڑھایا جائے گا۔ اس لحاظ سے آج تمام اسکولوں میں پہلی سے آٹھویں جماعت تک ذریعہ تعلیم صرف اردو ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس فیصلہ کے آغاز کے پہلے سال صرف چند اسکولوں میں اس پر محض اسی ایک سال عمل ہو سکا، باقی تمام اسکولوں نے اس فیصلے سے چشم پوشی کر لی۔ نہ اس فیصلے کو استقرار حاصل ہو سکا نہ اس سے منحرف ہونے والوں سے کوئی باز پرس کی گئی۔

حکومت کے ذرائع ابلاغ بالخصوص ریڈیو اور ٹیلی ویژن، جو واضح احکامات کے باوجود قومی تقاضوں کو خاطر میں نہیں لاتے--- ایک بغیر لکھے قانون پر اس طرح عمل پیرا ہیں کہ بالکل غیر ضروری طور پر اردو کے بجائے انگریزی الفاظ اور صرف انگریزی ہندسے اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے ان کی جگہ اردو میں نہ کوئی لفظ موجود ہے نہ ہندسے۔ یہ مضحکہ خیز اور ناگوار صورت ہر آن نظر آتی ہے کہ ساری عبارت تو اردو میں لکھی ہوتی ہے لیکن ہندسے انگریزی کے استعمال ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تو انگریزی اس حد تک طاری ہو گئی ہے کہ (۱۷ فروری ۱۹۸۴ء کے) ایک پروگرام کے میزبان کا نام اردو رسم الخط میں--- تاشقندی کے بجائے--- تاشکندی لکھنے کو ترجیح دی گئی۔ یہ ذرائع ابلاغ اعلانیہ قومی زبان اور قومی تقاضوں کی توہین کرتے ہیں، جیسے انھیں کوئی روکنے اور ٹوکنے والا ہے نہ باز پرس کرنے والا۔ اسی طرح حکومت سندھ کی حدود میں گاڑیوں پر اگر نمبر اردو میں لکھے ہوں تو اس طرح

جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے---گویا اردو کا استعمال ایک جرم بھی ہے۔

مایوسی کی یہ مستقل صورتحال قوم اور ملک اور اس کے حساس اور محب وطن طبقہ کے لیے کسی طور بھی باعث اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ اس کا تدارک فی الواقع اب اسی صورت میں ممکن ہے کہ افسران بالا دست کی حائل کی ہوئی وہ تمام مذکورہ رکاوٹیں دور ہو جائیں جو قومی زبان کے نفاذ کی راہ میں دیوار بنی ہوئی ہیں۔ صوبائی حکومتوں میں سے بالخصوص پنجاب میں اردو کے دفتری زبان بنائے جانے کی صورت حال اور رفتار قدرے حوصلہ بخش ہے لیکن دوسری صوبائی حکومتوں میں یہ رفتار سست نظر آتی ہے۔ بالخصوص سندھ کی حکومت نے تو اس ضمن میں کوئی پیش رفت بھی نہیں کی۔ وفاقی حکومت، جس پر اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر اپنا فرض پورا کر دے تو صوبائی حکومتوں کے لیے اس کی پیروی کرنا آسان ہو جائے۔ اور انھیں اس معاملے میں تاخیر اور چشم پوشی کا کوئی جواز نہیں مل سکے گا۔ افسران بالادست اگر نیک نیت ہوں تو حکومت کے صرف ایک ہی حکم (آرڈی نینس) سے نہ صرف اردو کے نفاذ کی راہ آسان ہو سکتی ہے بلکہ اس کے تعلق سے قوم میں ویسا ہی جوش اور جذبہ پیدا ہو سکتا ہے جو حکومت کی صرف ایک سرسری ہدایت کی پیروی میں یوم آزادی (۱۴ اگست) پر چند سالوں سے دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ہماری قوم چونکہ غلامانہ ذہنیت سے ابھی تک آزادی حاصل نہیں کر سکی، اس لیے اگر تبدیلی اوپر سے آئے-- چاہے اوپر سے مراد یہاں عوام کے لیے حکمراں طبقہ ہو یا صوبائی حکومتوں کے لیے وفاقی حکومت ہو، تو اس کا اثر فوری ہوتا ہے۔ یہ ہماری فطرت ہو گئی ہے کہ ہم بالائی طبقہ کی خوشنودی مزاج کی خاطر ان کی پسندیدہ زبان اور ان کی پسندیدہ لباس استعمال کرنا ہی اپنے لیے نفع بخش سمجھتے ہیں۔

کیا یہ کیفیت اس اعتبار سے افسوسناک نہیں کہ صدر مملکت کی خواہش اور ہدایت کے مطابق جس کاروائی کا آغاز اگست ۱۹۸۱ء سے ہونا تھا، وہ ۱۹۸۸ء میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی اور کیا یہ صورتحال مزید اس لحاظ سے المناک نہیں کہ قومی زبان کے نفاذ کے مسئلے پر اب ہر طرف یک گونا خاموشی ہی خاموشی ہے جیسے ماضی قریب میں بھی اردو کے نفاذ کی کوئی ہلچل کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ قومی صحافت، جو ہماری قومی زندگی کے سارے ہی حالات و واقعات کو محفوظ کرتی رہی ہے اور جو اس سارے عرصے میں قومی زبان کے نفاذ و رواج کے نشیب و فراز کی کیفیت کو پیش کرتی رہی ہے--- اب اس مسئلے پر قریب قریب خاموش ہی ہے۔ قومی زبان کے نفاذ کے لیے چاہے وہ کسی کے مطالبات رہے ہوں یا کسی کی عملی کوششیں، یا خود صحافت کا اپنا نقطہ نظر، اگر اخبارات کی فائلیں دیکھی جائیں تو ان میں اس نوعیت کی جو سرگرمیاں، مثلاً" فروری ۱۹۸۱ء سے دو سال بعد تک نظر آتی ہیں--- وہ اب اس تناسب سے دکھائی نہیں دیتیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہماری قومی صحافت نے بھی اپنے کردار کو حکمرانوں اور سیاست دانوں کے کردار کے تابع رکھا ہے یہ اس وقت فعال ہوتی ہے۔ جب وہ متحرک ہوتے ہیں۔ اب چونکہ حکمراں اور سیاست داں قومی زبان کے معاملے میں مصلحت آمیز خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں اس لیے ہر طرف خاموشی ہے! یوں ملک و قوم کا مقدر بے بسی کے حصار میں گرفتار ہے--- کہ جس سے آزادی کی کوئی صورت بہ ظاہر نظر نہیں آتی۔

یہی نہیں کہ ملک کے ارباب حل و عقد اور مقتدر اداروں کی بے نیازی نفاذ اردو کے بارے اب تک رکاوٹ بنی رہی ہے--- بلکہ اس کا سبب خود ہماری اپنی ذات بھی ہے اور ہم بھی اس صورتحال کے ذمہ دار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خود ہم نے اپنی زندگی میں قومی زبان کو رواج دینے میں کس حد تک

خلوص دل کے ساتھ پیش رفت کی؟ ہم میں سے وہ افراد جو دکانوں اور اداروں کے مالک و مختار ہیں، کیا اپنی ذاتی کارروائی اردو میں انجام دیتے ہیں؟ اور کیا دکانوں اور اداروں پر آویزاں اشتہاری تختے اور نام اردو میں تبدیل کر دیے؟ کیا ہم نے انگریزی میں دستخط کرنے چھوڑ دیے؟ کیا اپنے مکان پر نام اور نمبر اردو میں تحریر کیے ہیں؟ کیا ہم ڈاک کا پتا اردو ہی میں لکھتے ہیں؟ اور کیا ہم نے ٹیلی فون پر "ہیلو" کہنا چھوڑ دیا؟ اگر ان سوالات کا جواب دیکھا جائے تو بیشتر مقامات پر ہمارے لیے شرمساری کے علاوہ کچھ نہ ہو گا! حقیقت یہ ہے کہ خود ہماری تبدیلی معاشرے کی تبدیلی کا باعث ہو گی۔

روزنامہ جنگ: زبان و ادب کا محل نظر رویہ

اخبار "جنگ" بلاشبہ اردو اخبارات کی تاریخ میں اپنی کثیر الاشاعتی، عمومی اور عوامی دلچسپی، مقبولیت اور صوری و طباعتی حسن کے اعتبار سے مثالی ہے۔ اپنی گوناگوں صفات کے باعث اس اخبار نے جو عروج و کمال حاصل کیا وہ آج، اردو صحافت کے اس ارتقا کے زمانے میں، کہ حالات و وسائل کی اب دوسرے اخبارات کے ہاں بھی کمی نہیں، حیرت انگیز نظر آتی ہے۔ اس ترقی میں یقیناً ملک کی عمومی ترقی و خوشحالی اور قارئین کی روز افزوں مالی فراغت و طمانیت کا بھی دخل ہے لیکن یہ مجموعی صورت حال دوسرے اخبارات اور ان کے سرپرست افراد و اداروں کو بھی اسی طرح حاصل رہی، مگر "جنگ" کی مثالی ترقی کے اسباب اس کی بعض اپنی مخصوص صفات اور خصوصیات میں بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً صوری حسن و طباعت کی دل کشی، عمومی دلچسپی کی حامل زیادہ سے زیادہ خبروں کی اشاعت اور قدرے غیر جانبداری کا اہتمام، ایک بڑی تعداد میں متنوع اشتہارات کی اشاعت اور ان سے عوامی ضرورت و طلب کی ممکنہ تکمیل، معروف دانشوروں، ادیبوں اور کالم نویسوں کی تحریروں کی مستقل اشاعت کا اہتمام وغیرہ ایسی صفات ہیں جو کسی اور اردو اخبار میں بیک وقت نظر

نہیں آتیں۔ اپنی ان صفات کے حوالے سے "جنگ" اس قابل ہے کہ اسے بھارت کی معاصر اردو صحافت (بالخصوص اخبارات) کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ جو اگرچہ اسی روایت کے تسلسل کی ایک کڑی سے منسلک ہے' جو تقسیم ہند سے قبل اردو میں موجود تھی اور جسے اب بھارت میں بھی ہونا چاہیے تھا' لیکن وہاں کی اردو صحافت (کم از کم اخبارات کی حد تک) پاکستانی صحافت سے بہت پیچھے رہ گئی ہے اور دراصل یہی ہمارے معاشرے کی سبتاً" خوش حالی کا ایک مظہراور زبان کے احسان کی ایک مثال ہے جو ہمارے معاشرے پر جاری و ساری ہے اور جس سے بھارت کا معاشرہ بڑی حد تک محروم ہے۔ اگر اردو کو اب تک یہاں اس کا جائز مقام مل جاتا اور ہماری زندگی' معاشرے اور مملکت و حکومت میں مکمل طور پر یہ نافذ ہو جاتی تو صحافتی ترقی کی یہ صورتحال کہیں زیادہ بلند مراحل طے کر چکی ہوتی۔

زبان سے قطع نظر--- خود صحافت ایک بہت بڑا عامل ہے جو قومی و تہذیبی زندگی کو حد درجہ متاثر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ زندگی کا انداز و مزاج اور عقائد و نظریات تک بدل دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ صحافت جس حد تک عوامی زندگی میں دخیل ہوتی ہے اسی حد تک' مثبت و منفی دونوں صورتوں میں ' عوام کو اپنے رنگ میں ڈھال سکتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے ایک ملک یا معاشرے کو بگاڑ یا بنا بھی سکتی ہے۔ خود ہمارے اپنے معاشرے میں' نصف صدی قبل تحریک آزادی کے دوران' ایسی متعدد اور زبان زد مثالیں موجود ہیں جنھوں نے قوم کے مزاج' طرز فکر اور جذبات و احساسات کو نہ صرف بدل کر رکھ دیا بلکہ انھیں اپنے منتخب کیے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے آمادہ بھی کر لیا۔ اس لحاظ سے اگر "جنگ" سے بھی' اس کے دائرہ اثر و مقبولیت کے پیش نظر ایسی ہی توقعات وابستہ کی گئی ہوں یا کی جائیں تو قومی' ملی اور ملکی و معاشرتی

اعتبار سے قطعی نامناسب نہ ہو گا۔ اسی لحاظ سے اگر قوم اب تک کج روی و سست رفتاری کا شکار ہو' دیانتداری و راست فکری سے دور ہو اور قیادت و رہنمائی کے فقدان سے دو چار ہو تو اس کا ایک سبب صحافت کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے "جنگ" اس صورت حال کی ایک بڑی اور بنیادی ذمہ داری سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس ساری صورت حال کا ایک ذمہ "جنگ" کو ٹھہرایا جائے تو کچھ بعید بھی نہ ہو گا۔ اس نے اپنی بے پناہ قوت کو' جو عوام میں اپنی مقبولیت اور اعتماد کے باعث اسے حاصل ہے' قوم کی تربیت اور رہنمائی اور اصلاح و تعمیر کا وہ فریضہ ابھی تک انجام نہیں دیا' جو اس پر عائد ہوتا ہے اور جس کی پوری اہلیت اس میں موجود ہے۔ "صحافتی دیانت" اور عوام کی دلچسپی و "باخبری" کے نام پر بائیں بازو کی اور منفی سیاست کو فروغ کے مواقع کی فراہمی' عوامی مصائب و مشکلات اور ان کے روز مرہ کے مسائل کی موثر اور مستقل ترجمانی سے بالعموم غفلت اور بے نیازی' زیادہ تر غیر مؤثر' بے جان اور ناموزوں ادارتی تحریریں' عوام کے فرسودہ عقائد و رسوم کی اصلاح کے مقاصد پر مشتمل ٹھوس' مدلل اور عالمانہ مضامین کے بجائے سطحی ذہن و علم پر مبنی تحریریں' فن اور فیشن کو حد درجہ اہمیت دے کر معاشرے کے اخلاق باختہ طبقے کی نمود و نمائش اور اس کی تسکین محض جیسی ناروا صفات سے قطع نظر کہ جن پر تفصیلی اظہار خیال یہاں مقصود نہیں' زبان و ادب کے تقاضے بھی "جنگ" نے کماحقہ' پورے نہیں کیے۔

ادب' بالخصوص تخلیقی ادب عوام کی دلچسپی اور توجہ کا حامل رہتا ہے اور کم از کم افسانہ و شعر تو نچلی سطح کے ذہن کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ حالات حاضرہ' روزمرہ کے حوادث و واقعات اور وقتی ہیجانات پر اخبارات میں منظومات کی اشاعت کی روایت تو ہمیشہ ہی سے نظر آتی ہے اور خصوصاً قطعات

کے اہتمام کی روایت تو تقریباً" نصف صدی سے بہت مستحکم ہو گئی ہے اور اس ضمن میں "جنگ" کو رئیس امروہوی کے معیاری قطعات کی وجہ سے بڑا امتیاز بھی حاصل ہے۔ اسی طرح معروف ادیبوں اور دانشوروں کے کالموں کی مستقل اشاعت کا رجحان بھی بڑے اخباروں میں عام رہا ہے' "جنگ" نے بلاشبہ اس دوڑ میں اپنے معاصر اخبارات پر کئی حیثیتوں میں سبقت بھی حاصل کی ہے کہ اس کے صفحات پر اپنے زمانے کے معروف اور مقبول لکھنے والے آئے دن نظر آتے ہیں' جن میں سے شوکت تھانوی' مجید لاہوری' ابراہیم جلیس' ابن انشاء' احمد ندیم قاسمی' جمیل الدین عالی وغیرہ ایسے نام ہیں جو شہرت و مقبولیت کے باعث عرصے تک ذہنوں سے محو نہیں ہوتے۔ یہ فی الحقیقت "جنگ" کا اعزاز ہے کہ اسے اپنے زمانے کے بڑے قلم کاروں کا تعاون اور توجہ حاصل رہی۔ فیض اور جوش وغیرہ کی بعض تخلیقات بھی اس میں پہلے پہل شائع ہوئیں۔ پھر جب سے پاکستان کے اخبارات میں ادبی صفحات شائع ہونے لگے' اور جس کی ایک عمدہ مثال اولاً" "نوائے وقت" اور "امروز" (لاہور) اور پھر "جسارت" (کراچی) نے قائم کی اور تخلیقات و مباحث سے نہ صرف عام قاری کو معاصر ادب سے روشناس کرایا بلکہ عام ادبی صورتحال کو متاثر کرنے کا باعث بھی بنے۔ "جنگ" نے بھی ان اخبارات کی پیروی میں ادبی صفحہ کی اشاعت کا اہتمام کیا اور لکھنے والوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ اس کے ادبی صفحہ نے' اس کی حد درجہ "غیر جانبداریت" کے باعث عدم دلچسپی یا ترجیحاً" اہمیت نہ دیے جانے کی وجہ سے اپنا کوئی امتیازی اور موثر کردار ادا نہیں کیا۔ کئی مواقع پر اشتہارات کی بہتات یا ضمیموں کی اشاعت کے سبب ادبی صفحہ کا ناغہ ہوتا رہا یا ایک عرصے تک اس کی گنجائش کسی اور عمومی دلچسپی کے صفحے کو دے دی گئی۔ پھر یہ بھی ہوتا رہا کہ ادبی صفحہ ہی کو "علم و ادب' تہذیب

و ثقافت" کا نام دے کر اس کا ایک بڑا حصہ خالص ادب سے قطع نظر دوسرے عنوانات کے زمرے میں دے دیا جاتا۔ یوں ادب ترجیحات کے لحاظ سے پس پشت رہ جاتا۔

اپنی حیثیت اور مقبولیت کے پیش نظر اگر "جنگ" نے اپنے ادبی صفحے کو خاطر خواہ اور اپنے وسائل کی مناسبت سے اہمیت دی ہوتی تو اس کا اثر ملک کی پوری ادبی فضا پر پڑنا ناگزیر ہو جاتا۔ کسی حد تک "جنگ" (لاہور) کے ادبی صفحے کو اس ضمن میں قدرے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس نے معاصر ادب کے مسائل اور موضوعات میں اپنی غیر جانبداری کو قدرے بالائے طاق رکھنے کی کوشش ضرور کی لیکن مجموعی طور پر "جنگ" کا ادبی صفحہ اپنے مذکورہ دیگر معاصرین کے مقابلے میں کبھی اپنا کوئی مستقل امتیاز قائم نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ادبی صفحے پر فیض، احمد علی، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سید عبداللہ، احمد ندیم قاسمی اور اسی سطح کے دیگر اکابر کے انٹرویو اور ان کی تحریریں چھپتی رہیں، لیکن ان کا سہارا بھی اس کے لیے کسی مستقل امتیاز کا سبب نہ بن سکا۔ ادب اور اس کے معیار سے قطع نظر "جنگ" نے اپنے صفحے کو محض شہرت و ناموری، نام نہاد غیر جانبداری، عوامی پسند اور طبقاتی نمائندگی کی نذر کر دیا اور یوں اسے محض تنوع، اقتضائے وقت یا خانہ پری کی حیثیت دی۔

زبان کے لحاظ سے یقیناً "جنگ" کی خدمت کہیں زیادہ مسلمہ اور مثالی ہے۔ کچھ لوگ اردو زبان کی وسعت کا ایک سہرا ابن صفی اور لتا منگیشکر کے سر بھی باندھتے ہیں اور اسے مبالغہ بھی نہیں سمجھتے لیکن اس ضمن میں اب "جنگ" کا شمار بھی ناگزیر کہا جا سکتا ہے اور اردو زبان کو اس نے پاکستان کے گوشے گوشے بلکہ بیرون ملک کئی شہروں تک پہنچانے میں ایک نمایاں (لیکن غیر

ارادی) کردار ادا کیا ہے۔ زبان کے استعمال میں، ایک عرصہ قبل تک جو بے احتیاطی، جملوں کی ساخت، لفظوں کی بندش اور زبان و قواعد کی جو اغلاط گاہے گاہے اس میں نظر آتی تھیں، ان میں اب خاصی کمی ہو گئی ہے اور اس کی زبان کو معیاری، مناسب اور نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی یہ خوبیاں اس کے بہت سے معاصرین کے مقابلے میں اس میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یہ اس کا انفرادی امتیاز ہے لیکن اردو زبان کے لیے بحیثیت مجموعی اس کے قومی زبان ہونے اور قومی و ملکی، سرکاری و عدالتی اور عوام کی زندگی میں اس کے رواج و نفاذ کے لیے "جنگ" کے کردار کو بے نیازانہ ہی کہا جائے گا۔ اس نے اس ضمن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ --- بلکہ اپنے وسائل اور زور اثر کی حد تک قومی زبان کے نفاذ کی تحریک میں کوئی موثر اور مناسب حصہ نہیں لیا۔ ایک مختصر مدت میں، جب سندھ اسمبلی میں ۱۹۷۳ء میں لسانی بل پیش کیا جا رہا تھا، اس کا رویہ اور کردار یقیناً جذباتی اور مثبت و موثر تھا، لیکن پھر یہ سب کچھ رفت و بود ہو گیا۔ قومی زبان کے قومی زندگی میں اثر و نفوذ اور ملک میں اسے اس کا جائز مقام دلانے کے لیے اس کی کوششیں اپنے معاصرین کے مقابلے میں کسی طرح نمایاں نہیں۔ اس بارے میں اس نے کماحقہ، اپنا قومی فریضہ انجام نہیں دیا۔ اس نے مستقل طور پر نہ ایوانہائے حکومت تک قومی جذبات پہنچانے کی مناسب سعی کی، نہ نوکر شاہی کو اس ضمن میں قائل کرنے کی کوئی موثر کوشش کی۔ نہ قومی زبان کے بارے میں خود عوام کے ذہنوں کو ڈھالنے، انھیں انگریزی زبان، مغربی تہذیب و معاشرت اور مستعار افکار و خیالات سے نجات دلانے اور اپنی زندگی میں قومی زبان کے عام رواج و استعمال کی ترغیب کے لیے اپنے طور پر کچھ کیا، جبکہ وہ اپنی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے اس ضمن میں نہایت موثر اور بڑی سے بڑی تحریک نہ صرف خود چلا سکتا تھا بلکہ ایسی تحریکوں کے لیے

کامیابی کی راہ ہموار کر سکتا تھا۔

قومی زبان کی تحریک کے بارے میں اس کی بے نیازی و لاتعلقی اور اس کی عدم دلچسپی اسے قومی امنگوں و آرزوؤں اور مستقبل کے سامنے ایک بڑا قصوروار قرار دے سکتی ہیں۔ قومی زبان کے معاملے میں، جو اس ملک کا ایک بہت بڑا مسئلہ بلکہ المیہ ہے، "جنگ" کا اپنے مناسب اور موثر کردار کو ادا نہ کرنا، اس ضمن میں اس کے (نادانستہ ہی سہی) منفی رویے کی ایک صورت ہے۔ پھر اپنے صفحات پر انگریزی زبان کے الفاظ بلکہ فقروں کا بے جوڑ استعمال، کہ جن کی جگہ مترادف اردو الفاظ و مرکبات استعمال کیے جا سکتے ہیں، اس کی محض سہل پسندی و بے نیازی کا ثبوت اور قومی زبان کے مزاج او اس طرح اس کو پہنچنے والے نقصانات سے اس کی چشم پوشی کا مظہر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ خود "ادارہ جنگ" کی نظر میں اردو ابھی اس قابل نہیں کہ انگریزی کی جگہ لے سکے۔ چنانچہ انگریزی کے بے جوڑ اور غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے قطع نظر، اردو کے بجائے محض انگریزی ہندسوں کا استعمال اس کے اس نقطہ نظر کا اعلانیہ ثبوت نظر آتا ہے۔ شاید ادارے کو یہ گمان ہے کہ اگر وہ صفحات کی پیشانی پر صفحہ نمبر اردو میں تحریر کرے اور اخبار کے اندر بھی اردو ہندسوں کو استعمال کرے تو اس طرح اس کی تعداد اشاعت کم ہو جائے گی۔ یعنی پھر اتنی ہی ہو جائے گی جتنی آغاز میں اردو ہندسوں کے استعمال کے وقت تھی۔ یہ "جنگ" کا منفی رویہ ہے۔ حالانکہ وہ اپنی مقبولیت کے ذریعے نامانوس کو مانوس بنانے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو نامانوس ہوتے ہوئے اردو ہندسوں کو عوام میں پھر سے مانوس کر سکتا ہے اور بوجھل و گراں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو عوام کے ذہنوں سے نکال کر ان کی جگہ پہلے سے موجود اردو الفاظ و اصطلاحات کو پھر سے مقبول بنا سکتا ہے۔ دوسرے ممالک میں تو اخبارات کے سرپرست

اداروں میں وضع اصطلاحات کے شعبے ہوتے ہیں جو انگریزی یا دیگر زبانوں کی اصطلاحات کو اپنی زبان میں ضرورت اور سہولت کے مطابق خود ڈھالتے اور منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا قومی فریضہ اور کردار ہوتا ہے۔ جس کی محض معکوس مثالیں ہمارے ہاں نظر آتی ہیں۔ ہم وقت کے بہاؤ میں بہے چلے جاتے ہیں، اسے روک سکتے ہیں لیکن روکتے نہیں۔ "جنگ" اپنے وسائل اور اپنی مقبولیت کے ذریعے سے قومی زبان کا عائد خود پر یہ قرض اتار سکتا ہے، لیکن وہ اس جانب متوجہ نہیں۔ اس کے اس منفی رویے سے بالخصوص قومی زبان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے یا پہنچا ہے، اس سے اہل دانش انکار نہ کر سکیں گے۔ "جنگ" نے اردو صحافت کی تاریخ میں اپنی مختلف حیثیتوں میں جو امتیاز قائم کیا ہے، زبان و ادب کے ذیل میں اس کی بے نیازی و عدم دلچسپی اور اپنے قومی کردار و فریضے سے مصلحتاً چشم پوشی اس کے اس امتیاز پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھی ہے اور یہی "جنگ" کا محل نظر رویہ اور کردار ہے۔

فطری سائنس کی اصطلاحات کے مسائل

اصطلاحات اگرچہ ہر علم کی اپنی جگہ نہایت اہمیت رکھتی ہیں اور ان کے بغیر کسی علم کا تصور ممکن نہیں، لیکن دیگر علوم کے مقابلہ میں سائنسی علوم کی اصطلاحات ہماری زیادہ توجہ چاہتی ہیں ---- کیونکہ سائنس ہماری زندگی کا ایسا شعبہ ہے، جس میں ترقی کی رفتار اور تحقیق کی سمتیں دیگر علوم سے کہیں زیادہ ہیں اور آج ساری دنیا ترجیحاً" اس میں دلچسپی لے کر اور اسے اپنا مرکز توجہ بنا کر اس سے زیادہ سے زیادہ آسائش اور فائدے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی علوم میں ترقی کی رفتار دوسرے علوم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تیز ہے اور یہ علوم تحقیقات اور نتائج کے لحاظ سے بھی سماجی علوم سے زیادہ فعال ہیں۔ کم و بیش تمام سائنسی علوم اپنی ترقی اور وسعت کے ساتھ بے پناہ اصطلاحات سے بھی اس قدر مالا مال ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کا حتمی شمار و قطار ممکن نہیں رہا۔ پھر اصطلاحات کی حد تک یہ علوم ہماری زیادہ توجہ کے اس لیے بھی زیادہ حق دار ہیں کہ ان کی بیشتر اصطلاحات ہمارے لیے اجنبی، ادق اور دوراز کار بھی ہوتی ہیں کہ ان کا ہماری زندگی اور معاشرہ اور ماحول سے اتنا قریبی تعلق نہیں ہوتا، جتنا کہ سماجی علوم کی اصطلاحات کا ہوتا ہے، جو ہمارے

ماحول اور ہماری روزمرہ زندگی سے زیادہ مربوط اور منسلک ہوتی ہیں۔ سماجی علوم کی متعدد اصطلاحات ہمارے قدیم علوم، ہماری تاریخ اور معاشرت میں مستعمل رہنے کی وجہ سے ہمارے لیے اس قدر اجنبی نہیں، جتنی کہ سائنسی علوم کی اصطلاحات ---- جو اپنی اہمیت و افادیت اور اپنی روز افزونی کے باعث ہمارے لیے زیادہ توجہ کی طلب گار ہیں۔

فطری علوم کی اصطلاحات کے مسائل ---- اپنے پس منظر اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے دیگر علوم کی اصطلاحات کے مسائل سے بہت مختلف نہیں۔ جس صورت حال میں اردو اصطلاحات سازی کا عمل آگے بڑھا اور یہاں تک پہنچا ہے، یہ کسی ایک علم یا مضمون کے ساتھ مخصوص نہیں رہی، حالات اس سارے عمل کے لیے یکساں رہے ہیں اور بڑی حد تک اب بھی یہی حالت موجود ہے۔ ہاں، فرق ہے تو یہ کہ ایک مستقل منصوبہ بندی اور اصول و ضوابط کے تعین کے لحاظ سے اصطلاح سازی میں قیام پاکستان سے پہلے کے مقابلے میں اب ہم نسبتاً بہتر صورت حال سے دو چار ہیں، مگر قیام پاکستان کے بعد قومی زندگی کو جس منصوبہ بندی، ترتیب اور سلیقے سے آگے بڑھنا چاہیے تھا اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں مناسب لائحہ عمل مرتب کر کے اور فطری ارتقاء کو اپنی خواہشات اور مقاصد کی متعینہ منزل کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو جاتے ---- لیکن افسوس کہ مختلف وجوہات کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ جب تعلیم جیسا اہم اور موثر شعبہ ہی ہماری بے توجہی کے باعث نشیب و فراز سے دو چار ہوتا ہوا حد درجہ سست رفتاری کا شکار رہا ہے اور قومی زبان، جو قومی یکجہتی اور ملکی ترقی کا اہم ترین زینہ ہے، ہماری مشترکہ توجہ کو اپنی طرف پھیرنے میں ابھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکی ہے ---- تو اصطلاح سازی، جو ان کے مقابلہ میں ایک ذیلی اور ضمنی حیثیت رکھتی ہے، کس طرح

ہماری کلی زندگی سے رشتہ توڑ کر صحیح سمتوں میں آگے بڑھ سکتی ہے؟

اصطلاح سازی میں قیام پاکستان سے پہلے کی متعدد مثبت اور تعمیری مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے مسائل سو ڈیڑھ سو سال قبل دہلی کالج، سائنٹیفک سوسائیٹی علیگڑھ، انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ کے لیے بھی موجود تھے، بلکہ روشن خیالی، علمی وسعت اور وسائل کے لحاظ سے آج ہم اس وقت کے مقابلہ میں ہر طرح اور کئی گنا ترقی یافتہ ہیں اور یہ بات ہمارے لیے طمانیت کا باعث بھی ہے ---- لیکن ہم اس کے مسائل کے مقابلہ میں کوئی مشترکہ، مستقل اور مضبوط بند باندھنے میں اب تک اس طرح کامیاب نہ ہو سکے، جس طرح اپنے حالات و مسائل میں ہمارے اکابر نے بہر حال کامیابی حاصل کی تھی۔

آج ہمارے سامنے اصطلاحات کے جو مسائل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، انھیں اس طرح دیکھا جا سکتا ہے:

(۱) اس وقت اردو میں موجود جس قدر اصطلاحات موجود ہیں، ان سب پر اتفاق رائے نہیں ہے۔

(۲) ان میں بے ضرورت اور ایک اصطلاح کے لیے متعدد اصطلاحات کی کثرت ہے۔

(۳) عام طور پر ان کے استعمال میں عدم یکسانیت ہے اور کہیں کہیں غلط استعمال بھی ہوا ہے۔

(۴) پاکستان میں مختلف اداروں نے اصطلاح سازی میں اپنے اپنے طور پر دلچسپی لی ہے اور خاصی اصطلاحات وضع کی ہیں، لیکن تمام اداروں کی اصطلاحات میں یکسانیت نہیں ہے اور بالعموم ایک ادارہ دوسرے ادارہ کی اصطلاحات کو تسلیم نہیں کرتا۔

(۵) یہ مسئلہ بھی متفقہ طور پر طے نہیں ہوا کہ اصطلاحات کون سی استعمال ہوں گی، اصل انگریزی یا اردو؟

(٦) اصطلاح سازی کا کوئی ایک مستقل اور مقتدر منصوبہ بروئے کار نہیں آیا، اس لیے متعدد مسائل، انتشار اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہوئی اور انگریزی کے حامیوں کو مختلف حیلے بہانوں کا موقع مل گیا۔

(۷) کسی ایک ادارہ کو وضع اصطلاحات اور ان کے نفاذ کا اختیار حاصل نہیں، اسی لیے اصطلاحات یکساں اور مستند نہیں اور متفقہ طور پر مروج نہ ہو سکیں۔

یہ مسائل اصطلاح سازی کے پورے عمل پر حاوی نظر آتے ہیں اور اسی لیے وہ پر خلوص کوششیں بھی، جو کسی بھی ادارہ نے اس سلسلے میں یہاں انجام دیں، کما حقہ، مقبولیت اور استناد حاصل نہ کر سکیں۔ لیکن اگر خلوص نیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے زیادہ مسائل فی الواقعی ایسے مسائل نہیں ---- جو اصطلاح سازی اور اردو میں تعلیم و تدریس کے عمل میں رکاوٹ بن سکیں۔ ان میں سے زیادہ تر مسائل ہمارے احساس کمتری، ہماری غلط فہمیوں اور اردو کو استعمال کرنے میں ہمارے تذبذب اور تاخیر کی وجہ سے "مسائل" محسوس ہوتے ہیں۔ ہم یہاں ابھی اصطلاح سازی کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور آج سے پچاس سال قبل جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل افراد نے اردو میں انجینئری اور طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑی بڑی عمارتیں اور پل بنا ڈالے اور شفا خانے قائم کیے۔ ان میں سے بعض افراد نے اپنے میدان علم و عمل میں عالمگیر شہرت اور احترام بھی حاصل کیا۔ انھیں نہ اردو کی اصطلاحات مشکل محسوس ہوئیں نہ انھوں نے انگریزی اصطلاحات پر انحصار کیا۔ جو کام علمی

اور سائنسی سطح پر اردو میں گزشتہ سو سالوں سے کیے جا رہے ہیں' آج ویسے ہی کاموں کو انجام دینے میں دشواری کی شکایت کی جا رہی ہے۔ ہمارے ذخیرہ میں موجودہ "انتشار" اور "بے اطمینانی" کے باوجود اب بھی اتنی اصطلاحات موجود ہیں کہ جامعہ کراچی کے طالب علم انہی مسائل میں رہنے کے باوجود اب ایم اے اور ایم ایس سی کی تعلیم بالعموم اردو میں حاصل کر رہے ہیں اور ان میں سے سائنس کے ۶۵ فیصد طلبہ اور فنون اور سماجی علوم کے ۸۵ فیصد طلبا اردو میں جوابات تحریر کرتے ہیں' بلکہ چند سالوں سے پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالے بھی اردو میں لکھے جا رہے ہیں۔ اصطلاحات کا مسئلہ ان کے لیے اتنا پریشان کن نہیں بنا' جتنا اردو کو استعمال کرنے میں تذبذب کے شکار لوگ محسوس کرتے ہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ کسی اقدام کا آغاز شرط ہے' جب تک آغاز نہ ہو' نتیجہ یا منزل سامنے نہیں آ سکتی۔ چنانچہ یہ عذر مناسب نہیں کہ جب تک تمام اصطلاحات موجود نہ ہوں' یا ان کا ترجمہ نہ ہو جائے۔ اس وقت تک تدریس یا ترجمہ کا کام شروع نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح تو کبھی آغاز نہ ہو سکے گا۔ اس لیے کہ یہ کام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ہر گزرتی سانس زندگی میں ایک نئی اصطلاح کو جنم دیتی ہے۔ ہم آخری سانس کا انتظار نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ہمارے پاس ذخیرہ موجود ہے اور فی الوقت جیسا بھی ہے ---- اسے استعمال کرنا چاہیے' جو کمی ہے وہ رفتہ رفتہ پوری ہوتی جائے گی۔ زبان کا فطری اصول آئے دن نئی نئی اصطلاحات کو اردو کے قالب میں ڈھال رہا ہے۔ اس وقت اگر جامعہ کراچی اور جامعہ پنجاب کے طلبہ کی اکثریت اردو میں امتحان دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان طلبہ نے یا ان کے اساتذہ نے اپنے لیے راستہ نکال لیا ہے۔ ان میں سے اگر نصف طلبہ بھی موجودہ اردو اصطلاحات استعمال کرتے ہیں تو اس کے

معنی یہ ہیں کہ فطری اصول اپنا کام کر رہا ہے۔

یہ مسئلہ، کہ موجودہ اصطلاحات پر، جن کی ایک تعداد قیام پاکستان سے قبل کی اصطلاحات پر بھی مشتمل ہے، سب کا اتفاق نہیں ہے---- اپنی جگہ فطری ہے۔ کیونکہ وہ اصطلاحات اس وقت کے لیے تھیں۔ آج علم نہایت وسعت اور گہرائی اختیار کر چکا ہے۔ سرسید کے زمانہ میں، جیسا کہ خود سرسید نے کسی جگہ لکھا ہے کہ جب کتاب پریس میں ہوتی ہے تو وہ پرانی ہو جاتی ہے، لیکن آج تو ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ ہماری لکھی ہوئی ہر پچھلی سطر اگلی سطر کے مقابلہ میں پرانی ہو جاتی ہے۔ آج ہر لمحہ ترقی پذیر علمی دنیا میں اصطلاحات اس کثرت سے وجود میں آ رہی ہیں کہ ان سب پر بیک وقت دسترس ممکن بھی نہیں۔ اس لحاظ سے قدیم بلکہ موجودہ اصطلاحات ہمارے لیے فی الواقعی ناکافی ہیں۔ لیکن ادق اور مشکل ہونے کی بنیاد پر ان کی نفی بھی نہیں کرنا چاہیے ان کا ادق اور مشکل ہونا ہماری کم مائیگی کا ثبوت بھی تو ہو سکتا ہے! اس وقت کے طلبہ اور اساتذہ نے ان کے ادق ہونے کا گلہ نہیں کیا۔ کیونکہ قدیم علوم اور عربی و فارسی زبانوں سے ان کا رشتہ قریبی تھا۔ اس قسم کے الفاظ ہماری روزمرہ زندگی، معاشرت اور مطالعہ کا حصہ تھے۔ ایک نیا لفظ ہر شخص کے لیے پہلے پہل مشکل ہو سکتا ہے ---- لیکن استعمال کے ساتھ ساتھ وہ اسے سلیس محسوس ہونے لگتا ہے، چاہے وہ نیا لفظ عربی، فارسی کا ہو یا انگریزی کا۔ چنانچہ ہمارا نفسیاتی احساس اور کسی لفظ کا عدم استعمال بھی اسے ہمارے لیے مشکل بنا سکتا ہے۔ اس لیے ہمارے ذخیرہ میں موجود تمام پرانی اصطلاحات قابل رد نہیں۔ ان میں سے جتنی اصطلاحات علمی افہام کے لیے مناسب ہیں، انھیں برقرار رہنا چاہیے۔ ان کا مشکل ہونا دراصل ان کا نہیں ---- ہمارا عیب ہے۔ اس طرح صرف عربی و فارسی الفاظ ہی مشکل نہیں ہوتے، انگریزی الفاظ بھی تو

مشکل ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی تکلیف دہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں ایک نقطہ نظر صرف انگریزی اصطلاحات کے استعمال پر مصر ہے۔ اس کے خیال میں ہمیں انگریزی اصطلاحات کو اردو میں ترجمہ کرنے یا ان کے مترادفات استعمال کرنے کے بجائے انگریزی اصطلاحات ہی کو ترجیح دینا چاہیے۔ ایسی صورت میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہر انگریزی اصطلاح ہمارے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کوئی انگریزی اصطلاح اگر ترجمہ نہ ہو ---- تو استعمال سے زبان پر چڑھ تو جاتی ہے' لیکن اس اصطلاح سے مشتق کوئی اضافی اصطلاح مثلاً اسم سے فعل بنانا ہو تو ہماری قواعد کے مطابق ہمیشہ ممکن نہ ہو گا اور ہمیں انگریزی ہی کی کرخت اور بوجھل اصطلاح استعمال کرنی ہوگی۔ جیسے ہم فلٹر (Filter) استعمال کر لیتے ہیں اور ہم اس آہنگ کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں ---- لیکن اس سے مشتق اصطلاح مثلاً فلٹرڈ (Filtered) یا ٹرانسسٹر سے ٹرانسسٹرائزڈ ہمارے صوت و آہنگ اور لہجہ پر ناگوار گزرتے ہیں ۔ انگریزی اصطلاحات پر اصرار کا یہ نقطہ نظر قومی تقاضوں اور قومی مزاج کے لحاظ سے ظالمانہ اور بے نیازی پر مبنی ہے۔ اس طرح گویا اردو میں اصطلاحات کی کمی کا عذر کیا جاتا ہے یا اردو کی کم مائیگی کا حوالہ دیا جاتا ہے ۔ لیکن مسئلہ دراصل اردو کی کم مائیگی کا نہیں ۔ اردو اتنی ہی وسیع زبان ہے' جتنی کہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانیں مثلاً انگریزی۔ حالانکہ خود انگریزی بھی متعدد دوسری زبانوں سے اصطلاحات مستعار لیتی رہتی ہے اور اس میں متعدد اصطلاحات کا وجود بھی نہیں۔ لیکن آج سوچنے کا عمل چوں کہ بالعموم ان ممالک میں جاری ہے جو انگریزی استعمال کرتے ہیں ---- اس لیے اصطلاحات انگریزی میں تخلیق پاتی ہیں۔ سوچنے کا عمل سائنسی اور فنی اظہار کا

پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی ہر تخلیق اور ایجاد اپنے ساتھ اپنے مخصوص الفاظ بھی جوں کا توں ہم پر مسلط کر دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے الفاظ یا اصطلاحات کثرت استعمال کی وجہ سے ہماری زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے الفاظ اگر صوتی اعتبار سے دشوار نہ ہوں اور اردو رسم الخط میں لکھے بھی جا سکیں تو انھیں اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ ہم آئے دن اس طرح کی اصطلاحات کے عادی ہوتے جا رہے ہیں ۔ ایسی صورت میں اس گنجائش سے فائدہ اٹھانا مناسب ہے اور یہ گنجائش وضع اصطلاحات کے ہمارے اصولوں میں اب مسلم ہو چکی ہے کہ ایسی انگریزی اصطلاحات، جو ساری دنیا میں عام فہم ہوں، ان کی ادائیگی اور ان کا تحریر کرنا ہمارے لیے مشکل نہ ہو تو انھیں اردو میں اختیار کر لیا جائے(۱)، لیکن جن انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات موجود ہیں یا ان کا ترجمہ کیا جا سکے ---- ان کی جگہ ایسی انگریزی اصطلاحات، جو بین الاقوامی نہ ہوں، استعمال کرنا قومی اور اخلاقی نقطہ نظر سے جائز نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً تیزاب ہمارے ہاں ہر سطح پر ایک قابل فہم اور مکمل اصطلاح ہے۔ اس کی جگہ ایسڈ پر اصرار کرنا زیادتی ہے۔ اسی طرح "ایٹم" کے لیے "جوہر" کا لفظ ایک عرصہ سے ہمارے ہاں مروج ہے۔ اس کے بجائے "ایٹم" کو ترجیح دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح بعض مرکبات میں یہ صورت اور ناگوار محسوس ہوتی ہے ۔ مثلاً energy کے لیے اردو میں توانائی عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ atomic energy کے لیے "جوہری توانائی" مناسب اور دل نشین ترکیب ہے ۔ اس کے مقابلے میں "ایٹمی توانائی" کا استعمال بھونڈا محسوس ہوتا ہے۔

ایک اور تکلیف دہ صورت، جس نے ہمارے ہمارے ہاں رواج پا لیا ہے، یہ ہے کہ طالب علم کو کسی درجہ میں ایسی کتاب پڑھنے کو مل جاتی ہے،

جس میں اصطلاحات اردو میں ہیں اور کسی درجہ میں ایسی کتاب بھی اس کے مقدر میں ہوتی ہے، جس میں اصطلاحات انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اسے تیزاب کے بعد "ایسڈ" اور جوہر کے بعد "ایٹم" پڑھنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو کی مناسب اور مکمل اصطلاحات بھی اب ایسے لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنی ہوئی ہیں، جو نئے لفظوں کے حالیہ استعمال کو ان کی معقولیت بھی قرار دے رہے ہیں۔

یہی ضمنی طور پر علامات اور ترمیمات کے بارے میں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم انھیں اپنے ماضی کے تجربات کی روشنی میں پوری طرح اردو میں لکھ سکتے ہیں اور ترتیب دے سکتے ہیں۔ انھیں اردو عبارت میں انگریزی میں لکھنا، عبارت کو "آدھا تیتر، آدھا بٹیر" بنانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جن حضرات کو انگریزی علامات و ترمیمات اور ہندسوں پر اصرار ہے، انھیں چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (۲) اور میجر آفتاب حسن (۳) کے متعلقہ مقالات ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جیسی معتبر اور فاضل شخصیت کے اس ارشاد کے بعد کہ آج تک انگریزی میں جتنی علامتیں ایجاد ہوئی ہیں ان سب کے لیے اردو میں مترادف علامتیں موجود ہیں---- کسی سمجھ دار شخص کے لیے بحث اور شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ ہاں، یہ مناسب ہے کہ مثلاً کیمیا میں جن عناصر کی علامتوں کو دنیا بھر میں رواج حاصل ہے، مثلاً آکسیجن کے لیے O اور نائٹروجن کے لیے N وغیرہ۔ وہ بین الاقوامی اصطلاحات کو استعمال کرنے کے مسلمہ اصول کے تحت اسی طرح برقرار رہیں۔ قومی مفاد کے نقطہ نظر سے جس طرح انگریزی زبان کا استعمال تعلیمی اور سرکاری سطح پر مضرت رساں ہے ---- اسی طرح انگریزی اصطلاحات کا بالجبر استعمال بھی ہر شعبہ اور ہر سطح پر بے ربط اور نقصان دہ ہے۔

پاکستان میں قومی تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے جن اداروں، مثلاً انجمن ترقی اردو، جامعہ کراچی اور جامعہ پنجاب اور افراد مثلاً پروفیسر منہاج الدین نے جو پر خلوص کوششیں وضع اصطلاحات میں کی ہیں اور ان کے نتیجہ میں ایک بڑا ذخیرہ اصطلاحات وجوذ میں آگیا ہے، یہ ہر علم میں اعلیٰ سطحی تعلیم و تحقیق کے لیے کار آمد بھی ثابت ہوا ہے، لیکن قباحت یہ ہے کہ ان تمام اصطلاحات سے مشترکہ طور پر استفادہ ممکن نہیں رہا۔ اس کی کئی وجوہات نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ کوئی ایک ادارہ تمام علوم کی اصطلاحات وضع نہ کر سکا اور ایک حد تک یہ کسی ایک ادارہ کے لیے ممکن بھی نہ تھا کہ وہ اپنے طور پر سارا کام انجام دیتا۔ دوسرے یہ کہ متعدد اصطلاحات پر اتفاق رائے نہیں ہے۔ ہر ادارہ کی متعدد اصطلاحات دوسرے اداروں کی اصطلاحات سے مختلف ہیں۔ یہ اختلاف اصول و ضوابط میں بھی ہے اور تخلیق اور ترجمہ میں بھی۔ غالباً اسی صورت حال کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اردو اصطلاحات ہی سے برگشتہ ہو کر انگریزی اصطلاحات کو ترجیح دینے کی بابت سوچنے لگے ہیں یا انھیں اس صورت حال کے باعث اردو سے گریز کا بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ اس صورت حال ---- یعنی اصطلاحات کی کثرت کو لوگوں نے "انتشار" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اصطلاحات کی بہتات کا یہ "انتشار" اردو کی کم مائیگی کو نہیں ---- دولت مندی کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن بہر حال اس صورت حال کا تدارک ہونا چاہیے۔

اردو میں اصطلاح سازی کے قواعد مقرر اور مسلم ہیں۔ انھیں ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے۔ ان مسلمات کا خلاصہ مولوی عبدالحق (۴) اور میجر آفتاب حسن (۵) کی متعلقہ تصانیف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان مسلمہ اصولوں کی روشنی میں ہمیں موجودہ ذخیرہ اصطلاحات پر نظر ثانی کرنا چاہیے:

۱۔ نظر ثانی کے لیے ضروری ہے کہ :

(ا) وہ تمام اصطلاحات ، جو مفہوم کی مکمل ادائیگی کرتی ہیں، انھیں برقرار رکھا جائے ---- چاہے وہ مشکل ہی محسوس ہوں۔

(ب) جن اصطلاحات میں صحت اور سلاست کے لحاظ سے رد و بدل کی گنجائش ہو، ان میں مناسب رد و بدل کر لیا جائے۔

(ج) ایک مفہوم کے لیے --- یا ایک انگریزی اصطلاح کے لیے صرف ایک ہی اردو اصطلاح رکھی جائے ----

(د) اگر ایک ہی مفہوم کے لیے ایک سے زیادہ اصطلاحات موجود ہوں، چاہے وہ مروج اور مقبول ہی کیوں نہ ہوں، ان میں سے صرف مفہوم سے قریب تر اصطلاح اختیار کی جائے اور اگر ایسی کئی اصطلاحات موجود ہوں تو زیادہ مروج اصطلاح باقی رکھی جائے۔

(ہ) جو انگریزی اصطلاحات ہمارے ہاں عام طور پر مستعمل ہو گئی ہیں اور وہ اردو میں بے جوڑ محسوس نہیں ہوتیں، برقرار رکھی جائیں۔

(و) جن انگریزی اصطلاحات کے مناسب اردو مترادفات موجود ہیں، ان کے لیے صرف اردو اصطلاح باقی رکھی جائے۔ ورنہ ---- اصلاح شدہ صورت حال میں ---- اردو مترادفات کی موجودگی میں انگریزی اصطلاحات کا استعمال اسی طرح غیر فطری اور بے جوڑ محسوس ہو گا جس طرح سرسید اور ان کے رفقا کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک نے ہماری ساری قومی زندگی کا رخ موڑ دیا تھا، لیکن ان کی نہایت موثر اور مقبول تحریک بھی انگریزی کے بے جوڑ الفاظ کو اردو میں ضم کرنے میں ناکام رہی۔ سرسید اور ان کے رفقاء

کے مقابلہ میں ہماری کوئی حیثیت نہیں۔

۲۔ ترجمہ: اصطلاحات کے ذخیرہ پر نظر ثانی کے بعد ---- جن انگریزی اصطلاحات کے لیے اردو میں مترادفات موجود نہ ہوں' ان کا ترجمہ ہونا چاہیے اس کام میں:

(ا) الفاظ کو رواں' سہل اور بلا تکلف استعمال کرنے کے لیے اسماء سے افعال بنانے کی روایت مفید ہو سکے گی۔ مثلاً اپنانا یا قومیانا۔ یہ اپنے مترادف انگریزی الفاظ کے مفہوم کو بہتر صورت میں ادا کرتے ہیں۔ جب کہ اردو میں یہ نئے الفاظ ہیں۔ اس انداز سے مفرد کے ساتھ ساتھ مرکب الفاظ بھی بنائے جاسکتے ہیں۔

(ب) تراکیب بناتے ہوئے ضروری ہو جائے تو مسلمہ قواعد سے قدرے انحراف میں کوئی مضائقہ نہیں' جیسا کہ اردو میں رواج موجود ہے۔ مثلاً لب سڑک' سمجھ دار' لاچار وغیرہ۔ اس طرح عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی کے سابقے اور لاحقے یا ہندی الفاظ کے ساتھ عربی و فارسی کے سابقے اور لاحقے استعمال کر لیے جائیں۔

۳۔ وضع اصطلاحات: جن انگریزی اصطلاحات کے لیے اردو میں کوئی لفظ موجود نہیں اور ان کا ترجمہ بھی ممکن نہیں تو:

(ا) تراکیب و اشتقاق کے اصول سے نئے الفاظ وضع کیے جائیں۔

(ب) اشیاء کے اوصاف کے مطابق نئے نام تخلیق کر لیے جائیں۔

(ج) مفہوم کے لحاظ سے آزادانہ نئی اصطلاح وضع کی جائے۔

(د) نئی اصطلاح وضع کرتے وقت یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ کسی دوسرے علم میں مختلف معنوں میں استعمال نہ ہو۔

(ہ) اگر نیا لفظ بھی تخلیق نہ کیا جا سکے تو انگریزی اصطلاح کو اختیار کر

لیا جائے اور اگر ان کی ادائیگی اور انھیں اردو میں لکھنے میں دشواری ہو تو ممکنہ اردو تلفظ کے مطابق قدرے تبدیل کر لینا چاہیے۔

(و) وہ الفاظ جو اصلاً عربی، فارسی یا اردو کے ہیں، لیکن انگریزی میں دخیل ہو گئے ہیں اور ان کی شکل بدل گئی ہے---- جب وہ اختیار کیے جائیں تو انھیں ان کی اصل صورت میں اختیار کرنا چاہیے، جیسے امیر البحر جس کے لیے اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ "ایڈمرل" کے لیے ہے۔

(ز) بین الاقوامی اصطلاحات، جو ہر زبان میں یکساں استعمال ہوتی ہیں، انھیں اختیار کر لینا چاہیے۔ لیکن ہم اپنے طلبہ کو سمجھانے اور ان کے ذہن نشین کرنے کے لیے ان اصطلاحات کے ساتھ قوسین میں ان کے اردو مترادفات بھی لکھ سکتے ہیں۔

(ح) اصل انگریزی اصطلاح کو صرف ناگزیر صورت میں اختیار کرنا چاہیے۔

نظر ثانی، ترجمہ اور وضع اصطلاحات کے اس سارے عمل میں ضروری ہے کہ:

(۱) ہر علم کی حد تک ایک مجلس نظر ثانی تشکیل دی جائے تاکہ وہ ایک مقررہ مدت میں سارے ذخیرہ پر نظر ثانی کر کے صرف مناسب اور کار آمد اصطلاحات منتخب کر سکے۔

(۲) ہر علم کی ایک مجلس کا مستقل قیام ضروری ہے، جو نئی انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات تلاش کرتی رہے یا انھیں اردو میں ترجملہ کرے یا نئے الفاظ وضع کرے یا پھر اصل انگریزی اصطلاحات کو مخصوص شرائط کے ساتھ اختیار کرے۔

(۳) ہر مجلس میں دو ماہر مضمون ہوں، جنھیں انگریزی اور اردو پر

عبور حاصل ہو اور ان کے علاوہ ایک ماہر اردو زبان میں ہو' جو لسانی نقطہ نظر سے اصطلاح سازی میں معاونت کرے۔

(۴) ہر علم کی ایسی "مجلس وضع اصطلاحات" پر ایک نگران مجلس اصطلاحات ہو' جو معیار صحت اور یکسانیت وغیرہ کا لحاظ رکھے۔

(۵) لیکن ان سارے امور کی انجام دہی اور نگرانی ایک مقتدر ادارہ کے ذمہ ہو ---- جسے وضع اصطلاحات کے کل اختیارات حاصل ہوں اور اس کی منظور کردہ یا وضع کردہ اصطلاحات کا استعمال سب ہی کے لیے ضروری ہو۔

اس طرح تمام کتابوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور جو کتابیں اس وقت مروج ہیں' ان کی اگلی اشاعتوں میں ان پر نظر ثانی کر کے متروک اصطلاحات کی جگہ مستند اصطلاحات داخل کی جا سکیں گی۔

ان مجلسوں کے ضمن میں یہ ممکن ہے کہ ماہرین علوم پر مشتمل ذیلی مجلسیں مختلف شہروں میں تشکیل پائیں' لیکن ان سب پر ایک مرکزی نگران مجلس اس ادارہ میں قائم ہو ---- جسے سارے ملک میں اصطلاحات کے نفاذ کا ذمہ دار بنایا جائے۔ اس ادارہ کو یہ اختیارات ---- نفاذ قانون کی کسی صورت میں ملنے چاہیں' تاکہ عمل یقینی ہو جائے' جیسا کہ متعدد ترقی یافتہ ممالک میں یہ روایت موجود ہے۔

میں نے اپنی معروضات میں ان عیوب کا ذکر نہیں کیا' جو ہمارے موجودہ ذخیرہ اصطلاحات میں نظر آتے ہیں اور نہ ہی اس انتشار کی وضاحت کی ہے ---- جو اصطلاحات کے استعمال میں بالعموم نظر آتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اصطلاحات کے مسئلہ پر لکھے جانے والے جائزوں اور مقالات میں بالعموم نظر آتی ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہمارا موجودہ کل ذخیرہ اصطلاحات نظر

ثانی اور اصلاح کا منتظر ہے اور اسی طرح تقریباً تمام درسی سائنسی کتابیں اصطلاحات اور تراجم کے نقطہ نظر سے تصحیح کیے جانے کی قابل ہیں۔

جہاں تک قدیم اصطلاحات کے اختیار کرنے ' انگریزی زبان سے اصطلاحات مستعار لینے اور نئی اصطلاحات وضع کرنے کے اصولوں اور طریقوں کا تعلق ہے' یہ مسلمہ صورت میں موجود ہیں۔ ہمارے اکابر و زعما' ماہرین علم و فن اور ماہرین زبان نے مختلف وقتوں میں یہ اصول متعین کر دیے ہیں ' جن سے اختلاف ---- بلکہ جن میں ترمیم کی بھی بہت کم گنجائش موجود ہے' پھر ان اصولوں کی مدد سے انجمن ترقی اردو ' جامعہ عثمانیہ اور جامعہ کراچی کے تجربے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لہٰذا ان تجربات کی بنیاد پر ---- زیادہ تحقیق اور وسعت نظر سے کام لے کر ---- موجودہ اور مستقبل کی ضرورتوں کے مطابق جس قدر جلد ممکن ہو ' مستقل منصوبہ بندی کے تحت کام کا آغاز کر دینا چاہیے - ورنہ جتنی تاخیر ہوتی جائے گی ---- کام بڑھتا ہی جائے گا۔ ہمیں ان اداروں اور اکابر کا شکر گزار ہونا چاہیے' جنھوں نے دشوار مراحل کو ہمارے لیے آسان کر دیا ہے۔ ہمارے لیے اتنی مشکلات نہیں' جو قدیم اداروں اور جامعہ عثمانیہ کو پیش آئیں۔ ماضی سے کہیں زیادہ باصلاحیت اور فاضل لوگوں سے ہماری سرزمین شاد و آباد ہے۔ اس مسئلہ پر بحث و مناظرے کو ایک صدی کا عرصہ بیت چکا ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ اب مزید دراز نہ ہو اور کام ایک تکمیل تک پہنچے۔

حواشی

۱۔ اس طرح کے کچھ الفاظ کی نشاندہی میجر آفتاب حسن کی تصنیف "اردو ذریعہ

تعلیم اور اصطلاحات" (مطبوعہ، کراچی یونیورسٹی، ص ۱۴۱ و بعدہ) میں کی گئی ہے اور ان کے لیے کچھ رہنما اصول بھی متعین کیے گئے ہیں۔

۲۔ "اردو ہندسے اور علوم ریاضی کی علامتیں" مشمولہ: "اخبار اردو" (کراچی، ستمبر ۱۹۸۱ء)۔

۳۔ "سائنس اور ریاضی کی درسی کتابیں" مشمولہ: "جریدہ" (کراچی یونیورسٹی، شمارہ ۶)۔

۴۔ "اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ" (مطبوعہ، کراچی، ۱۹۴۹ء)۔

۵۔ "اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات" محولہ بالا۔

نوٹ:

مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) کے زیر اہتمام سیمنار منعقدہ (۱۹۸۵ء) میں پیش کیا گیا۔ و نیز مشمولہ: "تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات" (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء)۔

فروغ لسانیات کی ضرورت

زبان کی ماہیت اور اس کے ارتقا کے بارے میں غور و خوض ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ زبان کے قواعد کے تعلق سے جستجو کا سلسلہ ہندوستان میں (۴۰۰ ق م) اور یونان میں ارسطو کے زمانہ سے جاری ہے ' لیکن اٹھارویں صدی کے اواخر میں یورپی مستشرقین کی سنسکرت کی بازیافت اور خصوصاً سر ولیم جونز کی کاوشوں نے ' جن میں سنسکرت ' یونانی ' لاطینی کو ایک خاندان کی زبانیں ثابت کرنا بھی شامل ہے ' تاریخی اور تقابلی لسانیات کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں علم لسانیات اپنے ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ گیا جسے آج "توضیحی لسانیات" کہا جاتا ہے۔ صوتیات "Phonetics" اور صرف "Morphology" کے نئے تصورات نے اس علم کو انقلاب آفریں بنا دیا ہے۔ گزشتہ تیس چالیس سال کے عرصہ سے نحو اور معنی کے مسائل نئے انداز سے دیکھے جا رہے ہیں۔ آج دن بدن ان مسائل کے بارے میں نئے نئے نقاط نظر سامنے آ رہے ہیں اور لسانیات نسبتاً ایک نیا علم ہونے کے باوجود آج زبان و ادب ' عمرانیات ' بشریات ' نفسیات ' فلسفہ ' ریاضی اور مشینی ترجمہ کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے۔

آج ترقی یافتہ ممالک میں لسانیات کی مدد سے تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے بہت سے مسائل حل کیے جا رہے ہیں۔ اس سے مختلف نسلوں اور زبانوں کا باہمی اشتراک و اختلاف معلوم کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے قوموں اور زبانوں کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم کیا جا رہا ہے کہ کسی قوم یا کسی زبان نے کس کس علاقہ کا سفر کیا ہے اور وہ اثر اندازی اور اثر پذیری کے عمل سے کس حد تک دو چار رہی ہے۔ قدیم اور مردہ زبانوں کے رسم الخط اور ادب کی تفہیم بھی لسانیات کی مدد سے ممکن ہو گئی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جن زبانوں کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں، لسانیات انھیں رسم الخط بھی عطا کرتی ہے اور موجودہ رسم الخط میں جو خامیاں ہیں، انھیں اس کی مدد سے دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر کسی زبان کی عبارت کو اگر کسی دوسری زبان میں لکھنا ممکن نہ ہو تو لسانیات ایسے نشانات وضع کرتی ہے، جن کی مدد سے عبارت کو دوسری زبان میں آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح اب ہر زبان حقیقی تلفظ کے ساتھ لکھی جا سکتی ہے۔ لسانی و ادبی تحقیق میں مخطوطات کا زمانی تعین بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لسانیات کے بعض اصولوں کی مدد سے مخطوطات کے زمانی تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔ اور اس طرح یہ تحقیق میں بہت سی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کی مدد سے ایسے قواعد بھی بنائے جا رہے ہیں، جن کے ذریعہ کسی دوسری زبان کو بہت کم عرصہ میں سیکھا جا سکتا ہے۔

لسانیات کو، اس کی افادیت کے پیش نظر، ترقی یافتہ ممالک میں خاطر خواہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ اب اسے ریاضی اور شماریات کے انداز میں وضع کیا جا رہا ہے۔ اس کو افواج میں فوجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ خفیہ الفاظ بنانے اور دوسروں کے خفیہ الفاظ کو

پڑھنے کے کام بھی لیے جا رہے ہیں۔ مغرب کے کئی ممالک میں اسے کمپوٹری حیثیت دی جا رہی ہے۔ اس کی مدد سے ترجمہ کرنے کی ایک ایسی مشین بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر سکے گی۔ اس ضمن میں کچھ کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ اب اس طرح ایک زبان کا مختلف زبانوں میں مشین کے ذریعہ چند ثانیوں میں ترجمہ ہو سکے گا۔

یہ وہ برکات ہیں جن سے وہ ممالک، جو لسانیات کی اہمیت اور ضرورت سے واقف ہو کر اس کی طرف خاطر خواہ توجہ دے رہے ہیں، روز بروز استفادہ کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہماری حیثیت اس حد تک ہے کہ ہم کو اس کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ بھی نہیں۔ اس کے بارے میں جو مواد انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور روسی میں جمع ہو گیا ہے، اس کے مقابلہ میں اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قطعی طور پر ہیچ ہے۔ ویسے تو خان آرزو ہمارے پہلے عالم تھے، جنھوں نے فارسی اور سنسکرت کے قریبی تعلق کی طرف، سر ولیم جونز سے بھی پہلے اشارہ کیا تھا، لیکن وہ اس پر مفصل روشنی نہ ڈال سکے۔ انشاء اللہ خان انشاء نے اردو قواعد کے بعض اہم مسائل کو اہمیت دی اور اپنے عہد کے شہر دہلی کی بولیوں کے اختلافات کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن افسوس کہ یہ روایت ہمارے ہاں جاری نہ رہ سکی۔ چنانچہ قومی اور ادبی اصلاح و ترقی کی تحریک کے آغاز سے پہلے سرسید احمد خاں نے بجا طور پر یہ گلہ کیا تھا کہ اردو میں کوئی مناسب قواعد موجود نہیں۔ ان کے دور میں محمد حسین آزاد بھی اس وجہ سے متاسف رہے کہ اردو زبان تہذیب کے دربار میں صف آخر میں کھڑی ہے اور اس کا ادب تنگ دامانی کا شکار ہے۔ گو اس سارے عرصہ میں بعض مستشرقین نے، جن میں جان گلکرسٹ، گارساں و تاسی، میکس مولر، جان بمیز اور جی اے گریرسن وغیرہ شامل ہیں، مختلف صورتوں میں ہندوستانی زبانوں

کا لسانیاتی جائزہ لیا تھا، جس میں ضمنی طور پر اردو کے لسانی مطالعہ کی کوششیں بھی شامل تھیں، لیکن اردو کے اکابر و ماہرین نے اس باب میں خاطر خواہ جستجو نہیں کی اور نہ لسانیات کے ان فوائد کی بابت سوچا جو مغرب کی علمی دنیا اب اس سے حاصل کر رہی ہے۔ اس عرصہ میں ہمارے بعض اکابر وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، وغیرہ نے اس علم سے اپنی بے پناہ رغبت کا اظہار ضرور کیا۔

اردو اگرچہ سارے جنوبی ایشیاء کی زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑا حلقہ اثر رکھتی ہے اور یہ ہند آریائی علاقوں سے باہر، دراوڑی زبانوں کے علاقوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، لیکن اس لحاظ سے بد قسمت زبان ہے کہ اس قدر وسعت، مقبولیت اور علمیت رکھنے کے باوجود اس پر علمی اعتبار سے قابل اطمینان کام ابھی ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اردو کا توضیحی مطالعہ، اردو کی مختلف بولیوں کے جائزے اور دیگر لسانی موضوعات پر لسانی تحقیق چند مضامین یا ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس میں توضیحی لسانیات کا آغاز ڈاکٹر محی الدین قادری زور سے ہوا، ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ڈاکٹر گیان چند جین وغیرہ نے لسانیات کے توضیحی اور تاریخی دونوں پہلوؤں پر لکھا، لیکن ان سب کے باوجود اس کا مطالعہ ابتدائی منزل میں ہے اور اس کے تجزیاتی، توضیحی اور افادی پہلوؤں سے استفادہ کی صورت ہمارے ہاں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ مغرب کی زبانوں سے اس کا مقابلہ تو ایک طرف، یہ ابھی لسانیاتی تحقیق اور سائنٹی فک مطالعہ کے لحاظ سے اپنے اطراف کی، بلکہ اپنے پڑوسی ملک (بھارت) کی دیگر زبانوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، جہاں توضیحی لسانیات کے مطالعہ کا آغاز ۱۹۵۴ء سے ہو چکا ہے، اور جہاں بلا مبالغہ اردو اور ہندی میں

لسانیاتی کتابوں کی تصنیف کا تناسب ایک اور پچاس کا ہے۔

آج کے دور میں، جب کہ لسانیات نے زبان کے تاریخی جائزوں کی سرحدوں سے باہر نکل کر ریاضی اور سائنس کی اعلیٰ منزوں تک رسائی حاصل کر لی ہے، ان منزلوں تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی حیثیت مستحکم کر رہی ہے۔ زبانیں اب اپنے مخصوص دائروں میں محدود نہیں رہ سکتیں۔ تہذیبی انقلاب، لسانی تبدیلیوں اور صنعت و سائنس کی بے پناہ ترقی میں انھیں اپنے لیے جگہ متعین کرنی ہو گی۔ ماضی کی طرف نگاہ رکھنا ضروری سہی، لیکن زمانہ کی رفتار کے پیش نظر مستقبل سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے مستقبل کے تقاضوں کو قبول کرنا ہو گا۔ ہم نے اردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشت الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے اعلیٰ تعلیمی نصاب میں بھی اس سے زیادہ اگر کچھ رکھا بھی گیا ہے تو فقط نمائش کے لیے۔ ہمارے لیے، اس کے مطالعہ اور اس کی اہمیت و افادیت کی طرف توجہ صرف علمی لحاظ سے ہی ضروری نہیں بلکہ قومی نقطہ نظر سے بھی اہم ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسانی گروہوں کی یکسانیت اور مشترکہ خصوصیات کا انداز ہوتا ہے اور لسانی ہم آہنگی بھی اس سے اجاگر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے توسط سے انسانی گروہوں کے درمیان مطابقت، یکسانیت اور ہم آہنگی کے جذبات عام ہوتے ہیں اور اس طرح باہمی اخوت پیدا ہوتی ہے۔

ان علمی و قومی مقاصد کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں فروغ لسانیات کی خاطر سنجیدگی کے ساتھ غور و خوص کیا جائے۔ اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ ایک تو لسانیات کی اہمیت و افادیت اجاگر ہو سکے اور دوسرے اس علم کے فروغ سے جو علمی، سائنسی اور قومی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں،

ان کے لیے منصوبہ بندی کی جائے تاکہ ملک اس کی برکات سے فائدہ اٹھا سکے۔
ان مقاصد کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یا اس کی طرز کا ایک ایسا ادارہ ہو، جو لسانیات کو علمی مدارج پر فروغ دے۔

۲۔ اس ادارہ کے تحت ایک ایسا مرکز قائم ہونا چاہیے جس میں لسانیاتی تحقیق کو فروغ دیا جائے اور دوسرے یہاں لسانیات کی تدریس بھی ہو تاکہ اس طرح یہ علم عام ہو سکے۔ عام دلچسپی لینے والوں کے علاوہ اساتذہ کو وظائف، ترقی اور مالی فوائد کے حوالہ سے اس کی طرف باآسانی راغب کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ یہ ادارہ ایسی کتابیں شائع کرے جن سے لسانیات اور اس کی افادیت عام لوگوں پر اجاگر ہو سکے اور وہ اس میں دلچسپی لے سکیں۔

۴۔ تمام جامعات میں زبانوں اور ادب کے شعبوں میں توضیحی و تجزیاتی لسانیات کی تدریس کو لازمی اور مستقل اہمیت دی جائے، اس وقت بعض جامعات میں ایم اے اردو میں لسانیات کا ایک پرچہ ہوتا ہے، لیکن اسے صرف اردو زبان کے آغاز کے نظریوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس نصاب پر جدید تقاضوں کی روشنی میں نظرثانی کی شدید ضرورت ہے۔

علمی و قومی نقطہ نظر سے لسانیات کے فروغ کے لیے حکومت کی توجہ نہایت موثر ہو سکتی ہے۔ اس طرح علمی اور سائنسی ترقی اور قومی یکجہتی کی راہ میں اس کے توسط سے مفید اور بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی لسانی خدمت

اردو کے جدید لسانیات مطالعہ کا آغاز انشاء اللہ خان انشاء کی تصنیف "دریائے لطافت" سے ہوتا ہے لیکن افسوس کہ اس مطالعہ کی روایت ہمارے ہاں مستحکم نہ ہو سکی۔ گو بعض مستشرقین نے، جن میں جان گلکرسٹ، گارساں دتاسی، میکس مولر، جان بیمز اور جی اے گریرسن وغیرہ شامل ہیں، مختلف صورتوں میں ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ لیا تھا، جن میں ضمنی طور پر اردو کے لسانی مطالعے کی کوششیں بھی شامل تھیں، لیکن اردو زبان کے اکابر و ماہرین نے اس باب میں خاطر خواہ جستجو نہیں کی اور نہ علم لسانیات کے ان فوائد کا شعور حاصل کیا، جو اب مغرب کی علمی دنیا اس سے حاصل کر رہی ہے۔ ایک سو سال قبل اردو زبان جس طرح "تہذیب کے دربار میں صف آخر میں کھڑی" تھی اور اس کا ادب "تنگ دامانی" کا شکار تھا، آج جدید لسانی مطالعے کے لحاظ سے بھی اردو بے مایہ اور سب سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہاں تک کہ یہ زبان اپنی ہم عصر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں بھی پیچھے ہے۔ اس وقت بھارت میں کئی بڑے ادارے جدید اور تجزیاتی لسانیات کی اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں اور وہاں

تمام اہم اور غیر زبانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اردو کے لیے اس کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشت الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ مغرب میں لسانیات کو ریاضی کے انداز میں ڈھالا جا رہا ہے اور اس کے کئی مفید شعبے تشکیل دیئے جا رہے ہیں' جن سے زبانوں کی عمر کا اندازہ لگایا جا رہا ہے اور جن زبانوں کا کوئی رسم الخط نہیں ہے ان کی آوازوں کا تجزیہ کر کے اسے ایک رسم الخط دیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تلفظ کی مناسبت سے رسم الخط کی صحت کا کام بھی اس سے لیا جا رہا ہے۔ اس کو امریکہ کی افواج میں فوجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت خفیہ الفاظ بنانے اور دوسروں کے خفیہ الفاظ کو پڑھنے کا کام بھی لیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایسے قواعد بنائے جا رہے ہیں' جن کی مدد سے کسی دوسری زبان کو بہت تھوڑے عرصہ میں سیکھا جا سکتا ہے۔ مغرب کے کئی ممالک میں اس کو کمپوٹری حیثیت بھی دی جا رہی ہے۔ اس کی مدد سے ترجمہ کرنے کی ایک ایسی مشین بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو مختلف زبانوں میں ترجمہ کر سکے گی۔ اس مقصد کے لیے تمام زبانوں کی مشترک اقدار کی تلاش اور ترتیب کا کام کیا جا رہا ہے۔ جب یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ تو کسی بھی زبان سے ترجمہ کرنا مشکل نہ رہے گا۔ یہ سب فوائد ایسے ہیں جو آئے دن دوسرے ممالک میں حاصل کیے جا رہے ہیں۔ لیکن ہماری بے خبری اور کم مائیگی کا یہ حال ہے کہ ان فوائد کے حصول کے لیے ہم نے نہ کوئی منصوبہ بندی کی ہے اور نہ ہمیں اس کا شعور و خیال ہے۔

اردو کے جدید لسانیاتی مطالعہ میں سب سے اہم اور اولین نام ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا ہے جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں لندن سے "ہندوستانی صوتیات" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ انھوں نے

پیرس میں ڈی لٹ کے لیے ہندوستانی کے گجراتی اسالیب پر بھی مقالہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ اس وقت تک نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی جدید لسانیاتی مطالعہ کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ لسانیات کے باب میں اردو ' بقول گیان چند' ہندی سے پچیس سال پیچھے ہے۔ جب کہ ۱۹۲۸ء تک شیام سندر داس کی" بھاشا وگیان ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔

ڈاکٹر زور کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں ' انور شبنم دل ' ڈاکٹر گیان چند ' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جدید لسانیات کے اصولوں اور وسائل کو اردو کی لسانی اور صوتی تحقیق میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے جدید علم لسانیات نے مدلل مباحث کے ذریعہ صراط مستقیم دکھائی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو کی لفظی تشکیل پر جو تحقیقی و تجزیاتی مقار لکھا ہے' وہ بہت قابل قدر ہے۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اس نوع کے مقالات بھی اردو لسانیات کے باب میں اہم اضافوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اردو زبان' قواعد اور لغات کے تعلق سے اس دوران جو تحقیقی مقالات بھارت اور پاکستان کے مختلف اصحاب علم نے لکھے' ان میں بھی کہیں کہیں جدید لسانی شعور کا استعمال نظر آتا ہے۔ غیر ممالک میں ایسی کوششیں زیادہ وقیع اور سائنٹفک بنیادوں پر ہوئیں۔ جیسے الفرڈ ہچکاک نے واشنگٹن کے اطلاقی لسانیات کے مرکز میں اردو کے صوتیوں پر ایک تجزیاتی مقالہ تصنیف کیا۔

اس موضوع پر زیادہ مستقل کام روس کے مختلف لسانی تحقیق کے مراکز میں ہوا۔ ڈاکٹر و متیس 'ڈاکٹر السی فیروف' ڈاکٹر دادید ووا' ڈاکٹر چیر

نیشوف، ڈاکٹر سونیا چرنیکوا وغیرہ نے اردو کی صرفی و نحوی خصوصیات کے تعین میں مستقل اہمیت کے مقالات لکھے۔ یہ سب کوششیں حال کی ہیں جن میں اردو کے لسانیاتی مطالعہ کو اہمیت دی گئی ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں اس نوع کی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں۔ جدید لسانیاتی مطالعہ اور تجزیہ کی ایک موثر اور مستقل کوشش انور شبنم دل نے ضرور کی ہے، جو "Linguistic Research Group of Pakistan" کے داعی اور اس کے سب سے فعال رکن بھی رہے ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں جدید لسانیات کے مطالعہ کو فروغ دینے کی بڑی مثبت کوششیں کیں۔ کئی مطالعے کیے، اور لسانی مطالعوں پر مشتمل کئی مجموعہ مقالات شائع کیے۔ انھوں نے پاکستانی لسانیات کے مطالعہ کا جو ایک محدود لیکن مفید حلقہ تشکیل دیا تھا، اس سے وابستہ ماہرین لسانیات نے مختلف نوع کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے کیے۔ خود انور شبنم دل نے جدید لسانیاتی اصولوں اور طریق کار کی مدد سے اردو جملوں کی ساخت کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ تصنیف کیا۔ افسوس کہ انھوں نے اس نوع کے چند کام کرنے کے بعد پاکستان کو خیرباد کہہ دیا۔ پاکستان میں اس نوع کا کوئی اور اجتماعی کام پھر کبھی نہ ہوا۔ واحد انفرادی کوشش جو جدید لسانیاتی مطالعہ کے باب میں اردو کے تعلق سے ہوئی، وہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے انجام دی۔ زیر نظر سطور کا مقصد دراصل ڈاکٹر صاحب کی ان خدمات کا ایک سرسری جائزہ لینا ہے، جو انھوں نے جدید لسانیات کے تعلق سے انجام دیں۔

ڈاکٹر زور کے بعد جدید لسانی شعور کے تحت اردو کے لسانی مطالعہ کی کوشش ڈاکٹر صاحب کی ان تحریروں میں نظر آتی ہے جو انھوں نے ۱۹۳۶ء سے لسانی موضوعات بالخصوص تاریخی لسانیات اور توضیحی لسانیات اور صوتیات پر "علی گڑھ میگزین" اور دوسرے رسالوں کے لیے لکھیں۔ اس وقت تک

اردو کے ماہرین لسانیات میں سے حافظ محمود شیرانی وغیرہ نے جو کام کیے تھے' وہ محض لسانیاتی پہلوؤں کی جانب متوجہ کرنے کی کوششیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علم لسانیات پر اپنے ان مضامین کے ذریعے توضیحی لسانیات اور صوتیات پر لکھنے کی ابتدا کی۔ لسانیات سے ان کی یہ دلچسپی روز افزوں رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے منسلک ہو کر شمالی ہند میں ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء کے موضوع پر اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ اس مطالعہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف ہند آریائی زبانوں کے قدیم ترین نمونوں کا دردستان کی زبانوں شینا وغیرہ سے سراغ لگانے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف پنجابی' سندھی' اردو وغیرہ کے لسانی پس منظر کا مطالعہ کیا جائے۔ انھوں نے یہ کام وہاں کے معروف ماہرین لسانیات پروفیسر فرتھ' پروفیسر ہارلے اور پروفیسر الفرڈ ماسٹر کے تعاون اور ان کی نگرانی میں کیا۔ پروفیسر فرتھ سے ان کے تعلقات بعد میں بھی استوار ہے۔ پاکستان میں جب ۱۹۵۶ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام کراچی میں زبانوں کی تدریس کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں پروفیسر فرتھ بھی مدعو تھے' اور لسانیات کی تعمیل' تدریس اور تحقیق کے لیے ایک مجلس بنی تو وہ اس کے صدر بنائے گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس مجلس کا معتمد بنایا تھا۔ اس مجلس کی سفارشات منظور ہو گئی تھیں اور حکومت نے ان کی تفصیلات اور اخراجات کے تخمینہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کو ایک منصوبہ بنا کر پیش کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی محنت اور دلچسپی سے پاکستان میں لسانیات کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کا ایک جامع منصوبہ بنا کر پیش کیا' لیکن یہ منصوبہ حکومت کے سرد خانے کی نذر ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی لسانیات سے دلچسپی اور وابستگی کو مزید تقویت اس وقت پہنچی جب وہ ۱۹۵۹ء میں کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) سے مطالعہ پاکستان

کے شعبے میں استاد کی حیثیت سے منسلک ہوئے۔ یہاں کے دوران قیام میں انھوں نے درس و تدریس کے بعد کے فاضل اوقات میں لسانیات کے شعبہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا اور منجملہ دیگر مضامین کے سنسکرت کے نصاب کی بھی تکمیل کی ۔ انھیں اطلاقی لسانیات اور لسانیات میں مشینوں کے استعمال سے تعارف بھی یہیں حاصل ہوا۔ نیو یارک میں لسانیات کی اعلیٰ ترین تجربہ گاہ Hoskins Lab میں' جہاں امریکی محکمہ دفاع کے بہت سے منصوبوں پر کام ہوتا ہے اور وہاں عام طالب علم کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی' لیکن ڈاکٹر صاحب کو کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کی حیثیت سے یہ رعایت یا استحقاق حاصل تھا ۔ چنانچہ شام کا زیادہ وقت ان کا اسی تجربہ گاہ میں گزرتا۔ جب وہ کولمبیا سے کراچی واپس ہوئے تو انھوں نے ایک چھوٹی سی تجربہ گاہ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں قائم کی۔ پاکستان میں لسانیات کی یہ واحد تجربہ گاہ ہے۔ اس کے متعلق بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین لسانیات نے ستائشی کلمات ادا کیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں بعض جدید ترین تکنیکوں کا استعمال نئے موضوعات پر کیا ہے۔ افسوس کہ مختلف اسباب کی بنا پر اس تجربہ گاہ کی توسیع نہ ہو سکی اور نہ اس کی نگہداشت کے لیے مناسب امداد کا انتظام ہے۔

جدید لسانیات کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے جو مقالے تصنیف کیے وہ بھی اپنی جگہ اردو میں منفرد' اہم اور مفید ہیں۔ مثلاً ''لسانی مطالعے میں شماریاتی امدادی طریقوں کا استعمال'' اور ''صوتی تغیرات'' اور پھر ''اردو کا صوتی نظام'' یہ مقالات اردو میں اپنے موضوع کے تعارف اور جائزے میں اولین کوششیں ہیں' جو جدید لسانیات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ موخرالذکر مقالہ اپنے موضوع پر نہایت اہم کاوش ہے۔ جس میں پہلی مرتبہ جدید لسانیات کے

اصولوں اور طریق کار کی مدد سے اردو کے صوتی نظام کا ایک بھرپور اور مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ دراصل ڈاکٹر صاحب کا وہ توسیعی خطبہ تھا جو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ۱۹۶۶ء میں پیش کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے لسانیاتی اہمیت کے حامل کئی اور اہم مقالات بھی تصنیف کیے ہیں۔ جو ان کے مجموعہ مقالات "ادب و لسانیات" (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء) میں شامل ہیں۔ اردو زبان کی لسانی، تعلیمی اور قومی اہمیت اور خصوصیات ان کے متعدد مقالات کا موضوع ہیں۔ پاکستان میں زبان کے مسئلہ اور اس کے مختلف پہلوؤں اور قومی زبان کے نفاذ پر ان کے مقالات میں نہایت پرخلوص خیالات ملتے ہیں۔ ان کا یہ یقین ہے کہ جدید لسانیات کی روشنی میں اردو اور علاقائی زبانوں کے صوتی نظام اور پھر ان کے لسانی اشتراک کا مطالعہ قومی یکجہتی اور یگانگت کا راستہ ہموار کرنے میں ایک موثر عامل ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ زبان کے مسئلے میں شماریاتی امدادی طریقوں کے استعمال سے ٹائپ نویسی کو بھی زیادہ آسان اور تیز رفتار بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اولاً ترقی اردو بورڈ کراچی اور پھر مقتدرہ قومی زبان کے لیے ٹائپ مشین کے بنیادی کلیدی تختے کی تیاری کا کام کیا، جو منظور ہو گیا ہے اور اب اس کے مطابق ٹائپ مشین بننے کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔

شماریاتی امدادی طریقوں کے تحت شماریاتی تواتر شماری کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے بنیادی اردو کی لغت کی تدوین و ترتیب کا منصوبہ بھی مکمل کیا۔ اس طریقہ کے تحت تقریباً دو ہزار اردو الفاظ کی ایک ایسی لغت تیار کی گئی ہے جو عام طور پر روز مرہ زندگی اور کاروبار میں سادہ زبان میں بات چیت کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لسانیات کے شعبہ میں اردو کے تعلق سے جو کام

انجام دیئے ہیں، وہ واحد اور اولین مثالوں میں سے ہیں۔ لیکن ان کاموں کے علاوہ ان کی ایسی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں، جو لسانی مطالعہ کے ضمن میں آتی ہیں۔ مثلاً ان کا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ جو ترکی اور اردو کی تشکیل کے مشترک عناصر کے باب میں ہے۔ یا "جامع القواعد" کے نام سے اس کے حصہ صرف کی تصنیف، جو ایک مبسوط اور دقیع قواعد ہے۔ بنجمن شلز کی تحریر کردہ "ہندوستانی گرائمر" کا ترجمہ اور اس کی ترتیب اور اس پر تعلیقات اور ترقی اردو بورڈ کراچی کے عظیم منصوبہ لغت کی تصحیح اور اس کی جلد اول پر ان کا مبسوط مقدمہ، ان کی مزید دقیع کاوشیں ہیں، جو لسانی نقطہ نظر سے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

ادب

پاکستان میں اردو ادب ---- محرکات و مسائل

ان عوامل و محرکات سے قطع نظر کہ جن کے نتیجہ کے طور پر برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں طویل جدوجہد کے بعد آخر کار ایک آزاد اسلامی مملکت قائم ہوئی' جہاں مسلمانوں کے خیال کے مطابق وہ اپنی تہذیب اور اس کی روایات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ پاکستان بننے کے ساتھ بہر حال بعض عوامل و محرکات کا وہ تسلسل نہ ٹوٹا جو تحریک حصول پاکستان کے دوران موجزن تھا۔ مثلاً زبان و ادب کے تعلق سے پاکستان کے وجود میں آنے تک اردو کو ایک ایسی زبان تسلیم کیا گیا تھا' جس میں قومی زبان بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں اور یہ عقیدہ کہ اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہو گی۔ بعد کے حالات نے' جس میں مشرقی پاکستان میں ابھرنے والی ابتدائی دور کی بنگالی قوم پرستی کی تحریک نے بھی زبان کے مسئلہ کو قدرے الجھا دیا' لیکن پھر بھی یہ پاکستان کی قومی زبان تسلیم کی گئی ہے اور اس ضمن میں اسے دستوری تحفظات حاصل ہوتے رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد زبان کے مسئلہ میں کسی قسم کی بحث یا رکاوٹ موجود نہیں' اب یہ متفقہ طور پر واحد قومی زبان تسلیم کی جاتی ہے اور

سرکاری سطح پر اس کے استعمال میں تذبذب کی جو صورت حال تھی، وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے یہاں سرکاری اور عدالتی زبان کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور ایسی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ جہاں جہاں ملک میں مصلحتہ اور ضرورتاً انگریزی کو بالادستی حاصل ہے وہاں بہت جلد اردو اس کی جگہ استعمال ہونے لگے۔ اسی طرح ادب اور اس کی مختلف اصناف بھی اسی تسلسل کے تحت رہیں کہ جو آزادی کے وقت تک جاری تھا۔

پاکستان کی جغرافیائی حدود میں اردو کی روایت بہت قدیم ہے۔ اردو زبان کو یہاں ہر جگہ عام رابطہ اور بول چال کی زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اردو اور یہاں کی علاقائی زبانوں میں ہمیشہ اثر اندازی اور اثر پذیری کا ایک فطری رشتہ قائم رہا ہے۔ گاہے گاہے علاقائی زبانوں کی ادبیات کے اعلیٰ نمونے اردو میں منتقل کرنے کا کام ہوتا رہا ہے اور قیام پاکستان کے بعد مختلف علاقائی ادبیات کی انجمنوں کی تشکیل سے اس مد میں خاصا مفید اور نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل پاکستانی علاقوں میں، مشرق میں ڈھاکہ اور مغرب میں لاہور کو ادبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ان شہروں کو بدستور مرکزیت حاصل رہی اور پھر بھارت سے ایک بڑی تعداد میں ادیبوں و شاعروں کے ہجرت کر کے پاکستان آنے اور ان کی ایک خاصی تعداد کے کراچی میں بس جانے کے سبب کراچی کو بھی ایک بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان بڑے مراکز کے علاوہ سرگودھا، راولپنڈی اور حیدر آباد بھی ثانوی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیگر شہروں میں پشاور، ملتان اور بھاولپور کو بھی ادبی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔

قیام پاکستان کے وقت یہاں کے نمائندہ لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد معروف اور مقبول تھی۔ ان میں سے بعض نے چند سال قبل لکھنا شروع

کیا تھا' لیکن ان کی انفرادیت بعد میں سامنے آئی۔ ان میں سے اکثر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے رجحانات کو اختیار کیے ہوئے تھے اور بعض حلقہ ارباب ذوق کے رجحانات کے حامل تھے اور اس کے تجربات کو بھی اپنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تقسیم ہند نے جس طرح پاکستان اور بھارت کے درمیان جغرافیائی اور نظریاتی لحاظ سے ایک خط فاصل کھینچا تھا' اسی طرح اس نے اردو کی لسانی' ادبی اور فکری تاریخ کو بھی علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا۔ یعنی سوچ کے جو انداز ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمات کا درجہ حاصل کر چکے تھے' اب نئے ماحول میں ان کے بارے میں کہیں انکار اور کہیں تشکیک کی فضا پیدا ہو گئی۔

۱۹۳۶ء کے بعد ادبی بغاوتوں کے جو طوفان بڑی شدومد کے ساتھ اٹھے تھے' ان میں اعتدال اور ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نئی فضا اور اس کے نئے تقاضوں نے مصالحت اور مفاہمت کا رجحان پیدا کیا جس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ انتہا پسندی کی جگہ غور و فکر اور ملکی عناصر اور بیزاری کے بجائے ملکی اور قومی مزاج کو سمجھنے اور اس سے ہمدردی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ بعض اہل فکر نے اس تبدیلی کو ادب کے انحطاط اور جمود سے تعبیر کیا ہے' مگر یہ ایک نقطہ نظر ہے۔ اس دور کو جمود سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ اعتدال کی کیفیت تھی' ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک کا عہد بڑے انتشار و پریشانی اور بحران کا دور رہا اور اس کا عکس ادب میں بھی نمایاں ہو کر رہا۔ آزادی ' تقسیم' فسادات اور ہجرت کے واقعات ۱۹۴۷ء کے آس پاس ایک ساتھ رونما ہوئے۔ برعظیم کی تاریخ میں ایسا دور کم ہی نظر آیا جب ایک ساتھ اتنے بڑے سیاسی' معاشرتی اور ذہنی انقلابات واقع ہوئے ہوں۔

ادب کی ترقی پسند تحریک اور سیاسی جدوجہد نے قومی اور ملی احساس' اجتماعی اور سیاسی شعور اور اپنی تہذیب و ثقافت اور علمی و روحانی

ورثے کے عرفان کو تحریک دی تھی۔ ایک طرف آزادی کی منزل قریب آ رہی تھی، دوسری طرح سیاسی جماعتوں کے اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی سیاست نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو اپنے میں ضم کر لیا اور جو باقی بچے وہ بھی نظریاتی تصادم کے باعث بہت دور تک ساتھ نہ چل سکے۔ ترقی پسندی نے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی، آپس میں اختلافات بڑھے اور ادیب کے لیے کمیونسٹ ہونا ضروری سمجھا گیا۔ اب ترقی پسندی نئے ادب کی تحریک کے آغاز کی وسیع تر ترقی پسندی سے بہت مختلف صورت اختیار کر چکی تھی، ایک مخصوص سیاسی نظریہ ترقی پسند ادب پر مسلط ہو گیا۔ تحریک کے سیاسی عناصر، جن کی ادبی حیثیت بہت مستحکم نہ تھی، سیاست کی گرفت سے ادب کو زوال کی طرف مائل کر رہے تھے۔

تقسیم کے بعد ترقی پسند تحریک کا زوال ایک اور وجہ سے بھی رونما ہوا۔ ترقی پسند مصنّفین نوزائیدہ ملک میں نئے مسائل اور نئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے ۔ ایک تو وہ مذہب کو اجتماعی زندگی کے اہم عوامل اور مظاہر میں شمار نہ کر کے اپنی قوم سے الگ تھلگ رہے تھے اور دوسرے پاکستان کا قیام انھیں اپنے نظریوں کے مجروح ہونے کی وجہ سے ناگوار گزرا تھا۔ نئے حالات میں یا تو بیشتر ترقی پسند لکھنے والے مایوس ہو کر خاموش ہو گئے یا اپنے آپ کو دہرانے لگے۔ کوئی ادبی تحریک لکھنے والوں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اسے تخلیقی عمل زندہ رکھتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اسے پرانے اور بڑے نام بھی زندہ نہ رکھ سکے۔ یہ تحریک اپنا وقتی کردار ادا کر کے قیام پاکستان کے بعد چھ سات سال کے عرصے ہی میں نئے ادبی میلانات کے لیے راہ چھوڑ گئی۔ ترقی پسندی کے خلاف حالات کے مطابق جو فطری اور صحت مند ردِ عمل ہوا، اس نے ایک نئے مزاج کی تشکیل کی۔

آزادی کی جدوجہد کے زمانہ میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں، مختلف الخیال گروہ اور افراد، ایک خاص حد تک، ایک مشترکہ اجتماعی مقصد رکھتے تھے جس نے ادب کی ایک خاص سمت کا تعین کر دیا تھا، مگر ان حادثات اور واقعات سے مقصد کی یکجہتی بھی مجروح ہوئی اور پھر آزادی ملنے کے بعد ذہنی دنیا میں ایک طرح کا انتشار پیدا ہوا اور اندورنی اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ دلوں میں خلیجیں حائل ہوئیں، پوری پوری آبادیاں فسادات کا شکار ہوئیں یا ہجرت کے دوران لوٹ لی گئیں۔ جو باقی بچے وہ نئی جگہوں پر اجنبی بن کر رہنے کے لیے پہنچے۔ مہاجر ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ثابت ہوئے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس ہجرت میں اپنے بچپن اور جوانی کے ماحول کو چھوڑا، جب لکھنے بیٹھے تو ان کا روحانی کرب اور قلبی انتشار تحریروں میں بھی جھلکا۔ چنانچہ ادب کی تمام اصناف میں یہ کرب اور المیہ "فسادات" کے عام موضوع کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان افراد میں نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں نے اسی زمانہ میں کالجوں اور جامعات کی فضا میں ادبی ہوش سنبھالا تھا اور وہ ترقی پسندی کے رجحانات سے ذہنی طور پر متاثر بھی ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پیشرو ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت سے بھی اثرات قبول کیے۔ اب تنگ نظری اور انتہا پسندی کے اس دور میں انھیں اپنا ادبی مقام بنانے میں بھی بڑی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ان حالات کے جان دار اور صحت مند عناصر کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ انھیں ذہنی طور پر جذب کر کے اپنے مزاج میں شامل کر لیا۔ ان میں بہت سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہے، کچھ ذہنی سفر میں حلقہ ارباب ذوق کے ہمراہ چلے، کچھ حسن عسکری کی انفرادیت سے متاثر رہے، مگر ان سب کے مزاج کی انفرادیت ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں تشکیل پائی۔ اس کے بعد کے عرصہ میں ان کا میلان "جدیدیت" کی صورت

میں بڑی شدومد کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ میلان دراصل اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا اور تنہا نہیں تھا۔ مغرب کی متعدد ادبی و فکری تحریکوں کے زیر اثر یہاں بھی مختلف میلانات و رجحانات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد کے چند سالوں میں فکری سطح پر جو انتشار کی کیفیت طاری تھی اس میں ادیب مغرب کے زیر اثر کبھی "وجودیت" کبھی "لاشعور" کبھی شعور کی رو' اور کبھی سائنسی نظریہ ادب کو رواج دیتے رہے۔ جدیدیت کا میلان اسی طرز فکر کے نتیجہ میں کچھ مدت کے لیے ایک زیادہ واضح رویہ کی صورت اختیار کر گیا اور ادب میں عصری رجحانات اور جدید تقاضوں کی ضرورت کے جواز میں زیر بحث رہا۔

اسی عہد میں ان تمام اقدار سے انحراف کا بھی ایک مخصوص رجحان سامنے آیا' یہ اسلامی ادب کی تحریک تھی۔ بنیادی طور پر اس کا پس منظر نظریاتی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ملک میں دو متصادم رجحانات ایک دوسرے کے متوازی رونما ہوئے تھے۔ ایک رجحان پاکستان کے آئین کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کا تھا اور دوسرا پاکستان کو ایک لادینی (سیکولر) مملکت بنانے کا تھا۔ ادب میں یہ صورت حال اس طور پر ظاہر ہوئی کہ وہ ادیب و شاعر جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ یا متاثر تھے' پاکستان کو لادینی مملکت دیکھنا چاہتے تھے اور جو افراد آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے حق میں تھے' ان کی ایک تعداد اسلامی ادب کی محرک بنی۔

اس دور کے ادب میں قومی تہذیب کے تعلق سے ادیبوں کے نقطہ نظر میں ایک تبدیلی بھی نظر آتی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کے زمانہ میں روایت شکنی کے جوش میں بہہ کر عام ادیب قومی تہذیب کے بارے میں بیگانگی بلکہ گریز کا رویہ اختیار کرنے لگے تھے' وہ تہذیبی و قومی روایات کو رجعت پسندی اور

انحطاط پسندی کہہ کر ٹھکرا دیتے تھے اور اس طرز فکر میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند برابر کے شریک تھے۔

آزادی کے بعد بیگانگی کی وہ روش باقی نہ رہی۔ روایت پسندی کی مخالفت سب سے زیادہ ترقی پسندوں ہی نے کی، مگر اب ان میں بھی مخالفت کا وہ انداز موجود نہیں رہا۔ اس رجحان کی زیادہ بدلی ہوئی بلکہ ایک حد تک رد عمل میں ایک صورت دوسرے تصور کی شکل میں ظاہر ہوئی یہ پاکستانی ادب یا قومی ادب کی تحریک ہے۔ اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں تخلیق کیا جانے والا ادب ان اقدار کی ترجمانی کرے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھیں۔ اسی بحث کے ذیل میں قومیت، تہذیب اور نظریہ کے مسائل بھی ضمنی طور پر گفتگو کا موضوع بنے۔

پاکستانی ادب میں قومی احساس اور ملی شعور کا مسئلہ ایسا ہے جس پر پاکستان کی ابتداء ہی سے سنجیدہ ادیب توجہ دلاتے آئے ہیں۔ ابتداء میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پاکستان کے قیام کے بعد اب اس کے استحکام، ترقی اور تعمیر کا سوال ہے، اس نوزائیدہ ملک میں نئے تقاضے اور نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں ہمارے لکھنے والے ان کی طرف توجہ دیں، قوم کے مزاج کو پہچانیں اور اس کے عزائم کا ساتھ دیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستانی ادب صرف وہی نہیں ہے جو پاکستان کی سرزمین میں تخلیق ہو، بلکہ وہ ہے جو یہاں کے نئے تقاضوں، نئے حالات اور نئے ماحول کی عکاسی کرے۔ کیونکہ پاکستان کے قیام سے کوئی نئی قوم تو نہیں بنی، قوم تو پہلے ہی موجود تھی اور پاکستان دراصل قوم کے تہذیبی وجود کے تحفظ کے لیے بنا تھا، پاکستانی تہذیب تیرہ سو سال پرانی ہے اور اردو ادب کی روایت دراصل پاکستانی ادب کی روایت ہے۔

اس سے زیادہ مؤثر آواز اسلامی ادب کے لیے تھی۔ اس کے

ترجمان اسلام کے مخصوص تصورات کے مطابق ایک ایسے ادب کی تخلیق کے داعی تھے جو اسلامی اقدار حیات کی ترجمانی کرے اور ان کی ترویج بھی کرے۔ یہ بحث کافی عرصہ تک جاری رہی۔ یہ نقطہ نظر دراصل اس غیر مصدقہ نظریے کا رد عمل تھا' جو ۱۹۴۷ء سے پہلے دور میں ادب اور مذہب و اخلاق کے مابین ایک فاصلہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ اسی کا سبب تھا کہ قیام پاکستان کے بعد ادب کو اسلامی اور غیر اسلامی دو شعبوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ تقسیم کے بعد بھارت کے ایک گروہ نے اردو اور اسلام کو مرادف قرار دیا تھا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں بھی لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اردو اور اسلام جب مرادف ہو سکتے ہیں تو ادب اور اسلام میں کوئی خاص مغائرت کیوں ہونے لگی؟

پاکستانی ادب اور اسلامی ادب؟ کی بحث اب بھی گاہے گاہے ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں بھارت سے جنگوں اور مشرقی پاکستان کے سقوط کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا' اس میں یہ بحث موضوع اور رجحان کی صورت میں نمودار ہوئی۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں نفاذ شریعت کی تحریک کے شروع ہونے اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے مختلف تدریجی مرحلوں کے دوران یہ بحث اب پھر شروع ہوئی ہے۔ دیگر حالیہ مسائل میں جو ان دنوں زیر بحث رہتے ہیں' "بین الاقوامیت" اور "وابستگی" زیادہ نمایاں ہیں۔ "بین الاقوامیت" کے حامی سمجھتے ہیں کہ آج دنیا اس قدر وسیع ہے کہ فرد صرف اپنی مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر خود کو محصور نہیں کر سکتا' اسے بین الاقوامی سطح پر سوچنا چاہیے اور اس طرح ادبی اثرات اور فکری اثر پذیری بھی بین الاقوامی ہو۔ جب کہ اس نقطہ نظر کے برعکس "وابستگی" کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ادیب زندگی اور معاشرے کے حوادث اور نظریات سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا

اسے کسی نہ کسی نظریہ یا فریق سے وابستگی ضرور رکھنا چاہیے۔

نثری نظم۔ جواز اور عدم جواز

نثری نظم کے موازنے میں موجودہ بحث کا ماحصل جو کھل کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کو روایتی ہیئت کے حصار میں مقید نہیں رہنا چاہیے۔ اس نقطہ نظر کے تحت یہ کہا جاتا ہے کہ اصناف کی پابندیوں کے بجائے بہتر یہ ہے کہ ہیئت کی نئی تشکیل میں نئے تجربات کیے جائیں اور اظہار کو زیادہ بے ساختہ بنایا جائے۔ لیکن اس بحث کے دوران بار بار ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ کیا ان شعراء نے، جو نثری نظم کا جواز پیش کر رہے ہیں، دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کر لی ہے کہ جس کے بعد انھیں ان اصناف کی تنگ دامنی کا احساس ہو رہا ہے؟ یا ان کے پیش نظر کچھ ایسے بڑے شاعروں کے نام موجود ہیں جو اصناف کی تنگ دامنی کا شکار ہو گئے ہیں؟۔

اس بحث میں اصل مسئلہ ہیئت ہی کا ہے، ہیئت چاہے وہ کسی صنف کی ہو، مستقل اور جامد نہیں رہتی۔ ابتداء سے اب تک کسی نہ کسی صورت میں تجربات ہوتے رہے ہیں۔ یہ تجربات شعری تخلیق میں سازگار بھی ثابت ہوئے ہیں۔ ایسے تجربات سے ادب میں تنوع اور جاذب نظری پیدا ہوتی رہی ہے، لیکن موجود تجربہ شعری ہیئت اور اس کے روایتی سانچوں کو اگر مکمل طور پر نہ

سہی ایک بڑی حد تک، رد کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے قبل ایسی ہی کوششیں آزاد نظم اور نظم معریٰ کے ضمن میں ہوئی ہیں۔ اور نثری نظم بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ان اصناف میں آزاد نظم اور نظم معری تو آہنگ کی کسی سطح پر تخلیق ہوتی ہیں، لیکن نثری نظم کا کوئی آہنگ نہیں۔ اگر اس کے مدعی اس کے آہنگ رکھنے پر مصر ہیں تو---- یہ نثر کا آہنگ ہے، جو داخلی احساسات اور تصورات سے آراستہ خاص رومانوی نثر کا آہنگ کہلا سکتا ہے۔ اس بحث میں بات محض آہنگ اور صنف سخن کی نہیں بلکہ ذریعہ اظہار کی ہے اور فی الحقیقت اصناف میں تفریق کچھ بے معنی سی چیز بھی ہے۔ کسی نظم کو جو چیز موثر بناتی ہے، وہ جذبہ ہے۔ جو جذبہ شاعر سے نظم کہلواتا ہے وہ عام طور پر ایک مبہم سا وجدان ہوتا ہے جو سب سے پہلے شاعر کے ذہن میں ایک مصرعہ یا ایک شعر کی شکل میں آتا ہے۔ بقیہ نظم دراصل اس کی تشریح کے لیے یا اس کا پس منظر واضح کرنے کے لیے کہی جاتی ہے۔ عام طور پر نظم کا سارا وجدان ایک مصرعہ میں ڈھل کر سامنے آجاتا ہے اور وہی مصرعہ نظم کا سب سے شاندار حصہ اور اس کی اساس بھی ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات شاعر جس جذبہ سے متاثر ہوتا ہے اس کے اظہار کے لیے اسے غور کرنا پڑتا ہے کہ مناسب ہیئت کیا ہو گی۔ اس طرح متنوع جذبات یا متنوع موضوعات کے لیے شاعر ان کی مناسبت سے پیرایہ بیان اور ہیئت کا تعین کرتا ہے اور اس کے لیے شعوری طور پر اپنی نظم کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ اس کے لیے اس سے بہتر ذریعہ اظہار یا اس سے بہتر ہیئت ممکن نہ ہو۔ مجھے یہاں یہ بات تسلیم ہے کہ وہ شاعری جو باقاعدہ سانچہ بنا کر کی جائے مصنوعی ہوتی ہے۔ طویل نظموں کے بھی وہی حصے اچھے ہوتے ہیں جہاں شاعر کا تخلیقی شعور بیدار ہوتا ہے۔ بقیہ نظم محض خیالات کا منظوم اظہار تو ہوتی ہے، شعری کیفیت نہیں

رکھتی۔ اگر شاعر کے جذبات اور خیالات میں تازگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری فطری تخلیقی عمل کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی ہے اور اس صورت میں اسلوب میں بھی تازگی ہوگی۔ نظم میں دراصل تخلیقی عمل پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ایسا شاعر جس کی تخلیقی قوت بیدار نہ ہو نئی سے نئی بات نئے سے نئے پیرایہ میں کہنے کے باوجود بے جان شاعری کر سکتا ہے' اور یہی بات آج ان شاعروں میں کم و بیش نظر آتی ہے جو نثری نظم کے پیرایہ میں اپنا اظہار چاہتے ہیں۔ یہ شاعر' یوں لگتا ہے کہ موضوعی اور معروضی اظہار کی تنگ دامنی کے سبب ایسا نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اپنے روایتی شعری سانچوں یا روایتی عروضی آہنگ کو اختیار کرنے کی محنت اور مشقت سے احتراز کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو نثری نظم بھی فی الحقیقت بعض خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں اظہار بے ساختہ ہو سکتا ہے' قافیہ اور ردیف کے لزوم سے نجات مل جاتی ہے' شاعر قافیوں کے قبضہ میں نہیں رہتا اور بحر کے تقاضوں سے بری ہو جاتا ہے۔ خیالات حشو و زوائد سے مبرا ہوتے ہیں۔ شاعر کو جو کچھ کہنا ہے وہی کہہ سکتا ہے' کوئی لفظ برائے "بحر" استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ زبان و جذبہ کی طرف توجہ مرکوز رہتی ہے' مقررہ لفظوں' علامتوں' استعاروں' تشبیہوں کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خیال و جذبہ کی طرف توجہ مرکوز رہتی اور شعر میں تعقید نہیں ہونے پاتی کیونکہ مصرعوں کی ترتیب عام طور پر نثر کے مطابق رہتی ہے۔

چونکہ یہ نثر کے مطابق ہوتی ہے اس لیے اس میں زور اور تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ شعری آہنگ یا بحر کی وجہ سے کلام میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے تو سننے والے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس میں شاعر اور اس کے پیرایہ اظہار کے درمیان کسی قسم کی مسابقت نہیں رہتی کہ جس کے سبب ہم اعلیٰ درجہ کی

شاعری کو پرکھ سکتے ہیں۔ کیا یہی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اردو کی نثری نظم میں ابھی تک کوئی وقیع اور نایاب کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکا ہے؟ اور یہ اس صورت میں ممکن بھی نہیں جب تک کہ نثری نظم کے شاعر ایک تو اردو نثر کے صنائع و بدائع اور اسالیب سے واقف نہ ہوں، اور دوسرے اردو شاعری میں ہیئت کے تجربوں سے بہرہ مند نہ ہوں۔

یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ شاعری کی کوئی صنف ضرورت کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ اگر شاعری کو ہم صرف شاعری یا تخلیقی عمل کے پیمانے سے ہی جانچیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی تخلیقی شاعر کو نئی ہیئت وجود میں لانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ ہمیشہ قصیدہ، مثنوی، غزل میں سے کسی ایک پر ہی اکتفا کیوں نہ کر لیا گیا ہو؟ دراصل نظم کی مثال ایک راگ کی سی ہے، جس میں ایک تسلسل اور ایک وحدت ہوتی ہے۔ ہر دور اپنے ساتھ اظہار کے طریقے بھی وضع کرتا ہے، لیکن یہ اظہار خلا میں نہیں ہوتا، روایت کی خوبی اور خامی دونوں سے واقفیت ضروری ہے۔ شاعر کے مزاج کی حالت اور اس کا شدید احساس یہ دونوں مل کر نظم کے لیے بحر اور وضع کا تعین کرتے ہیں، اور پھر دونوں کی مدد سے نظم وجود میں آتی ہے۔ ان دونوں میں جس قدر تناسب، حسن اور وابستگی ہوگی نظم بھی اتنی ہی بلند پایہ ہوگی۔ لیکن نثری نظم اس تناسب اور حسن سے عاری ہے، کیونکہ اس کا آہنگ نثر سے قریب ہے، جبکہ اسے نثر سے مختلف ہونا چاہیے چونکہ شاعری شاعر کے بنیادی خیالات و جذبات کا اظہار ہوتی ہے اور اس مقصد کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتی ہے یا الفاظ کو ایسے طریقہ سے استعمال کرتی ہے جو انسانی تجربہ کے اصل منبع سے قریب ترین ہوتے ہیں اس لیے اس کی زبان نثری ادب کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ شاعری بڑی حد تک ایک اضطراری طریق اظہار ہے اور یہ شعور کی ایک بالیدہ کیفیت کا

نتیجہ ہوتی ہے۔ شعر اور نثر کے درمیان وزن ایک امتیازی وصف ہے' لیکن نثر میں بھی ایک طرح کا وزن ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ نظم کا وزن باقاعدہ اور متواتر ہوتا ہے' نثر کا زیر و بم نحوی ہوتا ہے اور قواعد صرف و نحو کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شعر کا زیر و بم حسی ہوتا ہے' اور کسی اندرونی ضرورت کا تابع ہوتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک مخصوص و موزوں نظام اصوات تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ شعر ایک مکمل' خود مکتفی وحدت ہوتا ہے جو تمام و کمال ذہن میں وارد ہوتی ہے یعنی اس کے اجزاء تحلیل ہو کر اور ایک نئی ترکیبی ہیئت اختیار کر کے شعور میں آتے ہیں۔ شعر میں صورت اور معنی' ہیئت اور مضمون' اشعار اور شاعرانہ کیفیت کے درمیان ایک توازن ہوتا ہے' ایک ہم آہنگی ہوتی ہے' جو نثر میں نہیں پائی جاتی۔ شاعرانہ اظہار جہاں کہیں ہوتا ہے اس کے پس پردہ شاعرانہ ادراک بھی ہوتا ہے جس کے لیے شاعرانہ اسلوب اظہار ہی بہترین اور موزوں ترین اسلوب ہے۔ بحیثیت مجموعی نظم و نثر کا باہمی فرق زبان کی چند خصوصیات کا فرق نہیں۔ یہ بنیادی طور پر طریق ادراک کا بھی فرق ہے۔ یہ طریق ادراک ایک خاص قسم کے اسلوب کا تقاضہ کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بالکل ایسا ہی واضح فرق ہے جیسا کہ چلنے اور رقص کرنے میں۔ نثری نظم کے تحت ہیئت اور اسلوب کا جو تجربہ ہوا ہے وہ نثر سے قریب تر ہے بلکہ اگر مخصوص خصوصیات کی حامل نثر کو نظم مسور کے مقابلہ میں رکھا جائے تو نثر کے ایسے نمونہ بھی مل جاتے ہیں جن میں زیادہ حلاوت ترنم اور تاثر ہے اور نثر کی متعدد خصوصیات ان میں مل جاتی ہیں۔

یہاں اس پہلو پر بھی سوچا جا سکتا ہے کہ نثری نظم دراصل شاعر کا وہ احساس کمتری ہو سکتا ہے جو نثر نگاروں کے مقابلہ میں اس میں پیدا ہوا ہے؟ کیونکہ یہ تجربہ عام طور پر ان شاعروں میں عام ہو رہا ہے جو ابھی نو مشق ہیں اور

اظہار کے کسی اور پیرایہ میں کسی امتیاز کا ثبوت نہیں دے سکے ہیں۔ مغربی ادبیات میں بھی نثری نظم کی تحریک ان ادیبوں اور شاعروں کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی تھیں جو بلند پایہ شاعری کرتے تھے اور نثر لکھنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ بعض دیگر اصناف' رجحانات اور تحریکات کی طرح' جو مغربی ادبیات سے یہاں آئی ہیں' اردو میں نثری نظم کے ذریعہ بھی ایک مفید اضافہ ہو سکتا ہے' اگر شاعر موضوع اور اسلوب دونوں کے توازن سے تخلیق کریں۔ چلنے اور رقص کرنے میں بہرحال فرق ہونا چاہیے۔

نثری نظم کے جواز میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اظہار کی ایک صورت ہو سکتی ہے' جو تجریدی ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہاں تجرید کا تجربہ کارفرما نہیں ہے۔ یہ ایک خوبصورت اصطلاح تو استعمال کی گئی ہے لیکن اس کا اظہار نہیں ہوا ہے۔ تجریدی اظہار تو اظہار کا آخری مرحلہ ہے۔ اس اظہار میں شاعر کائنات کی اشیاء یا احساسات کی غیر ضروری جزئیات کو علیحدہ کر کے ایک مجرد شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ سب کچھ حافظہ یا اپنے سابقہ تجربہ کی بنیاد ہوتا ہے۔ حافظہ کے دو پہلو ہوتے ہیں' ایک ادراکی اور دوسرا تصوراتی۔ ادراکی حافظہ میں معروض مجسم شکل میں محفوظ رہتا ہے' اور تصوراتی حافظہ میں معروض کی صرف مخصوص صفات تصور کی صورت میں باقی رہتی ہیں۔ تجریدی اظہار تصوراتی حافظہ کے ذریعے ہوتا ہے جس میں کوئی تاثر یا احساس محض مجرد تصور کی صورت میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ انسان فی الاصل تصویروں کی زبان میں سوچتا ہے۔ انسانی ذہن جیسے جیسے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اس کا حیطہ ادراک مجرد ہوتا جاتا ہے۔ یہ ذہن کا ارتقائی اور انتہائی مرحلہ ہوتا ہے اور جب انسانی مشاہدے میں معروضات کی کوئی مجسم شکل باقی نہیں رہتی تو وہ انھیں مجرد اشیاء اور تصورات کی صورت میں اپنے حیطہ ادراک میں جگہ دیتا ہے۔ جو شاعر اپنے

تجریدی اظہار کے دعوے دار ہیں وہ بالکل ان مصوروں کی طرح ہیں جو کم سنی اور نومشقی کے دور میں ہیں' بجائے اس کے کہ حقیقت کی مصوری کریں' تجریدی مصور پر مشق ستم کرنے لگتے ہیں۔ یہ دراصل سہل پسندی اور فیشن پرستی کی ایک مثال ہے۔

میرے خیال میں نثری نظم محض شاعر کا آزاد تلازم ہے' جس میں مہیج اور محرک سے متاثر ہو کر وہ اپنے ذہن اور حافظہ کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اس عمل میں وہ اپنے سابقہ تجربہ کے زیر اثر بعض مخصوص تصورات' محرکات' احساسات' مظاہر اور اشیاء سے تلازم اور وابستگی پیدا کرتا چلا جاتا ہے جو محض اتفاقی طور پر بعض نفسیاتی حقائق اور مخصوص نتائج کی حامل بھی ہو جاتی ہیں۔ ان معروضات سے محض میری یہ مراد نہیں ہے کہ نثری نظم ایک "کار طفلاں" ہے اور اسے ترک کر دینا چاہیے یہ اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہو سکتی ہے اگر اس کے ذریعہ ادب میں نئے اور بہتر خیالات و تجربات کا اضافہ ہو۔ کیونکہ مثبت روایتوں سے انحراف دراصل فرد کی محرومی اور نارسائی کا ثبوت ہے۔ اس طور پر نہ بہتر فن تخلیق ہوتا ہے نہ بہتر فنکار ابھرتے ہیں اور فنکار تو ویسے بھی کمزور شخصیت کا مالک ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ترفع کے تحت فن کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن اگر وہ اپنی شخصیت' اپنے جذبات و احساسات اور ترفع کے اسباب پر قابو پالیتا ہے تو وہ پختہ شخصیت اور بلند پایہ فن کار بن جاتا ہے اور بہتر فن پارہ اسی وقت تشکیل پاتا ہے۔

"دست تہ سنگ" کی غزلیں

"زنداں نامہ" (۱۹۵۶ء) سے "دست تہ سنگ" (۱۹۶۵ء) تک فیض نے کل گیارہ غزلیں کہیں جو مؤخرالذکر مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان غزلوں کی تخلیق کی نوسالہ مدت کا احوال اور اس کی روداد فیض نے "دست تہ سنگ" کے مقدمے کی آخری سطور میں مختصر طور پر بیان کی ہے۔ اس سے ان کی غزلوں میں شامل احساسات، خیالات اور پھر اشارات و کنایات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کلام کا یہ مجموعہ پہلے تین مجموعوں کے مقابلے میں اپنی سج دھج، نفس مضمون، جمالیاتی کیفیت اور تاثر کے اعتبار سے قدرے مشترک اور قدرے مختلف ہے۔ اس مختصر لیکن وسیع دنیا میں وہ سب کچھ بھی موجود ہے جو دوسرے مجموعوں میں ملتا ہے اور وہ بھی ہے جو دوسروں میں نہیں ملتا۔ اس کی قدر مشترک فیض کی شخصیت اور ان کا وہ احساس ہے جو ہر مجموعے میں اپنا اظہار قریب قریب یکساں طور پر کرتا رہا ہے اور یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود اس عہد کی نوعیت کے سبب ہے، جس کے پس منظر میں فیض نے یہ غزلیں تخلیق کیں۔

"نقش فریادی" سے "زنداں نامہ" تک فیض کی شعری خصوصیات و

مزاج کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ فیض نے ایک تو وقت کے ان مسائل کی ترجمانی کی ہے جن سے اجتماعی جذبات وابستہ ہوتے ہیں، دوسرے فیض نے زبان و بیان کے ایسے پیرایے استعمال کیے، جو عموماً مانوس اور پراثر تھے۔ تیسرے یہ کہ فیض کے شعری مزاج میں ذاتی درد و غم کی کسک بھی موجود ہے۔ پھر انھوں نے شاعری کی مثبت روایات سے اپنی شاعری کو علیحدہ نہیں رکھا۔ ایک تو پرانے استعارے استعمال کیے لیکن اس سے بڑھ کر نئے اور مخصوص معاشرتی و سیاسی پس منظر کے حامل استعارے بھی تخلیق کیے۔ منفرد علامتیں بھی استعمال کیں، روایتوں سے کام لیا اور نئے تجربوں سے استفادہ بھی کیا، زبان کے مانوس اسالیب بھی اختیار کیے اور نئی ترکیبیں بھی وضع کیں جو خاصی معنی خیز اور انفرادی شان بھی رکھتی ہیں۔ اپنے مخصوص نظریات کو جذبات کے طور محسوس کیا، لیکن بغاوت اور نعرہ زنی سے دور رہے۔ ان کی نظر اظہار پر رہی۔ رومان سے حقیقت تک اور حقیقت سے رومان کی طرف ان کی آمد و رفت ابتداء سے اب تک جاری ہے۔ یوں ابتدائی شاعری کے نمونوں میں بھی ایک داخلی رومانی کیفیت ہے جو درد آمیز بھی ہے اور آگاہی بھی بخشتی ہے۔ ان میں دل کا درد اور نظریے کا درد الگ الگ بھی نظر آتا ہے مگر کہیں کہیں خلط ملط بھی ہو جاتا ہے۔ رومان اور انقلاب کی آویزش "نقش فریادی" تک محدود نہیں، دوسرے مجموعوں تک یہ کشاں کشاں چلی آئی ہے۔ بنیادی طور پر "نقش فریادی" کے بعد "دست صبا" اور "زنداں نامہ" میں شامل ان کی بیشتر تخلیقات ان ہی ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوا تھا۔

فیض کے لیے "زنداں نامہ" کے بعد کا زمانہ کچھ افراتفری کا زمانہ ہے۔ جس میں ان کا اخباری پیشہ چھٹا، ایک بار پھر سے کچھ انسداد راہ اور کچھ

نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کا آئینہ دار ان کا چوتھا شعری مجموعہ "دست تہ سنگ" ہے۔ اپنے اس پس منظر میں فیض کی شاعری کا اصل قابل لحاظ عنصر رومان و حقیقت اور جستجو و آرزو کی وہ کیفیت ہے جو شاعر کے قلب اور روح میں جاگزیں ہے۔ اس کی شخصیت سالم نہیں رہی اس میں انقسام و انتشار پیدا ہوتا رہا ہے بلکہ یہ چیز تو پہلے بھی بڑی شدومد سے اپنا اظہار کرتی رہی ہے۔ اب محرومیوں اور ناآسودگیوں نے اس کے دل کو محشر آرزو بنا دیا ہے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ذہنوں میں رومان اور انقلاب کا امتزاج ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فیض اس امتزاج و کشمکش کی کیفیات و احساسات کو اپنے اسلوب میں بیان کرتے رہے ہیں۔ پہلی صورت باعث تسکین ہے تو دوسری نجات کے لیے ضروری۔ عقل دار کی طرف بلاتی تھی تو دل کوچہ جاناں کا مکیں تھا۔ فیض کے اجتماعی شعور میں الجھن اور اختلاف کا سرچشمہ ان کے نصب العین کی مادیت ہی ہے۔ ان کے پیش نظر زندگی کا منتہائے مقصود جسم کی راحت اور حواس کی تسکین رہا ہے۔ چنانچہ انقلاب اسی رومانی مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔ غم روزگار وصال محبوب کی راہ میں رقیب بن کر حائل ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جس فن کاراز چابک دستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا۔ یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں بالکل نئی اور منفرد مثال ہے۔ نئی اور مستحسن بھی:

گلے میں تنگ ترے حرف لطف کی باہیں
پس خیال کہیں ساعت سفر کا پیام

فیض کی شاعری کا رومانی پہلو دل آویز نہایت ہے۔ رومانیت ان کی شخصیت اور شاعری کا بڑا اہم وصف ہے۔ ان کے فکروفن دونوں میں رومانیت کی جلوہ گری اور کارفرمائی شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ فی الحقیقت اس

وقت وہ اردو شاعری کی عشقیہ روایت کے منفرد اور واحد امین ہیں۔ محبوب کی دلفریب اداؤں کا محسوس و معتبر بیان جس کیف و لطافت کے ساتھ ان کے کلام میں نظر آتا ہے اس کی مثال ان کے ہمعصر شاعروں میں نہیں ملتی۔ وہ وصال کے شاعر ہیں لیکن فراق کے تاثر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں فراق کے حرمان و یاس کا سایہ نہیں۔ زیادہ تر وصال کی شادکامی اور نشاط کی پرتاثیر آب و تاب ہے۔ ان کا عشق بہت لطیف و شاداب ہے۔ یہ محض ان کا شاعرانہ تخیل معلوم نہیں ہوتا' جیسا کہ عام رومانوی شاعروں کے ہاں ہے بلکہ یہ ان کا انسانی جذبہ بن گیا ہے۔ یہ شاید اس لیے بھی ہے کہ فیض کے وجود و فن میں حواس ہی کا غالب عنصر نمایاں رہتا ہے۔ زیر نظر مجموعے کی بیشتر غزلیں اس عنصر کا نمایاں اور بھرپور اظہار کر رہی ہیں:

چھلک رہی ہے ترے حسن مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

یہ جفائے غم کا چارہ' وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دست عیسیٰ' تری یاد روئے مریم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

فیض اپنے کلام میں باذوق جمال پسند ہیں۔ نسائی حسن ان کے اعصاب پر طاری ضرور ہے لیکن یہ خارج سے ہوس انگیز ہونے کے بجائے داخلی طور پر اس درجہ جاگزیں ہے کہ تاثر میں انتشار پیدا نہیں ہوتا' ایک مستقل پرسکون کیفیت موجود رہتی ہے۔ یہ کیفیت ضبط اور سلیقے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کیفیت کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ فرد کا جذبہ ساری کائنات پر مرکوز ہو جاتا ہے یا وہ اپنے اندر مناظر فطرت کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ فطرت کے حسین و دلکش مظاہر

محبت کا صرف پس منظر ہی نہیں رہتے، محرک بھی بن جاتے ہیں۔ ایک دلکش فضا عموماً عشقیہ استعارات سے تیار کی جاتی ہے:

بساط رقص پہ صد شرق و غرب سے سرشام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہ تمام

صحن گلشن میں بہر مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیے کیا کیا ہمیں باد سحری نے

اس دلکش فضا کے کیف کی تکمیل کے لیے ایک بے نام سی خلش، مبہم سی آرزو بھی تحریک پیدا کرنے لگتی ہے۔ مجسم عشق کے اس وفور کا لازمی نتیجہ ایک دائمی تشنگی کا احساس ہے۔ فیض کا تصور وصال سے اس قدر معمور ہے کہ انتہائے کار درد کی کسک پیدا ہوتی ہے۔ گرانبار لذتیت کا خمار ہمیشہ طاری نہیں رہ سکتا' خمیازہ اس کا فطری نتیجہ ہے۔ ناآسودگی اور بے تابی کے احساسات اسی سبب سے فیض کے کلام میں وافر ہیں۔ ان کی دردمندی محض یاس و محرومی کا نتیجہ ہی نہیں شادکامی کا سبب بھی ہے اسی لیے اس میں تلخی نہیں صرف حسرت ہے۔ اس کی مثالیں زیر نظر مجموعے میں بکثرت ملتی ہیں:

دل و جان فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سر کوئے دلفگاراں شب آرزو کا عالم

خون عشاق سے جام بھرنے لگے دل سلگنے لگے داغ جلنے لگے
محفل درد پھر رنگ پر آگئی پھر شب آرزو پر نکھار آ گیا

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی

سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہو گی
کب جان لہو ہو گی کب اشک گہر ہو گا
کس دن تری شنوائی اے دیدہ تر ہوگی
کب مہکے گی فصل گل کب مہکے گا میخانہ
کب صبح سخن ہو گی کب شام نظر ہو گی
کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامت جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہو گی

شرح فراق مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں
سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاش بام
دل ساتھ دے تو آج غم آرزو کریں
کب تک سنے گی رات کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں

چونکہ فیض کی شاعری عشق کی تشنہ کامیوں کا اظہار کرتی ہے اس لیے اس کا ایک نمایاں وصف یاس و ملال اور حزن و حسرت کی کیفیت بھی ہے۔ اس کیفیت اور اس کی فضا کو تخلیق کرنے میں فیض کو جو کمال حاصل ہے اس کی مثال آج بہت کم شاعروں میں ملتی ہے۔ وہ کم سے کم لفظوں میں ذہنی کیفیات کی تصویریں کھینچ دینے پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تصویر کشی اور حقیقت نگاری ہمارے احساسات کے لطیف پردوں سے ٹکراتی ہے۔ تسلسل، ربط، احساسات کی نزاکت اور خفیف سا حزن اس شاعری کی چند خصوصیات ہیں:

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں
قریب آ اے مہ شب غم نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سرر ہگزار چلے گئے
تری کج ادائی سے ہار کے شب انتظار چلی گئی
مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

پھر لہو سے ہر ایک کاسہ داغ
پر ہوا جام ارغواں کی طرح

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوادیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض نے شکستہ دل اور محرومی و یاس کی ترجمانی کے باوجود اپنی شاعری میں شکست خوردہ ذہنیت کو راہ نہیں دی۔ ان کے کلام میں شکست خوردگی کے بجائے وہ رجائیت بھی شروع سے ہی موجود ہے جو ناسازگار حالات کو بدلنے کے حوصلے کا نتیجہ ہوتی ہے چونکہ وہ حساس دل کے ساتھ ساتھ بیدار ذہن بھی رکھتے ہیں اس لیے اس دنیا کے دکھ درد کی طرف ان کا رویہ وہ نہیں جو فراریت پسندوں کا ہوتا ہے' ورنہ وہ بھی غم دوراں کو غم جاناں کی شدت میں کمی کا جواز ٹھہرانے لگتے:

رت بدلنے لگی رنگ دل دیکھنا رنگ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا اشک اُمڈے کہ ابر بہار آ گیا
فیض کیا جانیے یار کس آس پر منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں دلفگاروں پر قاتل کو پیار آ گیا

اس مجموعے کی بعض غزلیں سیاسی مزاج اور سیاسی کرب کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ اس میں نہ صرف ان کے ذہن کا تمام درد و غم بلکہ شعور و احساس بھی مؤجزن ہے۔ ان میں فنی اختصار و ارتکاز اور عبارت و اشارت بڑی معنی خیز ہے۔ ان غزلوں کا محرک ہنگامی سیاسی واقعات سہی لیکن ان کا حسن اور تاثیر لازوال ہیں۔ سیاست اور غنائیت کا ایسا حسین امتزاج مثالی ہے---- جو آج کے دور میں فیض کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان میں ایک مخصوص آواز اور منفرد لہجے کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ غزلوں میں فیض کی انفرادیت عاشقانہ تاثرات کی بہ نسبت سیاسی تصورات کے اظہار میں زیادہ نمایاں ہے:

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ دار سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزم یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں

دل سنبھالے رہو، زباں کی طرح

لو سنی گئی ہماری یوں پھرے ہیں دن کے پھر سے
وہی گوشہ قفس ہے وہی فصل گل کا ماتم

فنی اعتبار سے یہ اشاراتی انداز بڑا کارگر ہے۔ تلخ سے تلخ بات کہتے ہوئے بھی متانت کا پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔ رمز و کنایہ نے ہمیشہ ایک لطیف قسم کی ترشی برقرار رکھی ہے اس لیے فیض کا وار بھرپور اور کاری ہوتا ہے۔ اور وہ شعریت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ اور یہی شعریت عموماً" ان کے پیغام کو پروپیگنڈہ ہونے سے بچالیتی ہے۔ چونکہ ان غزلوں میں ماجرائے دل کے ساتھ ساتھ تقاضائے وقت کی طرف بھی اشارے ہیں اس لیے ان میں علامتوں اور استعاروں سے بھی خاص طور پر کام لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے پرانی علامتوں اور پرانے استعاروں کو بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے کلام میں جنون، قاتل، مقتل، شام و سحر، بہار و خزاں، منصف، مسیحا، شیشہ و جام، قفس، فصل گل، صبح فردا، یہ تمام استعارے سیاسی مفہوم و اشارات کے حامل ہیں۔ فیض کے تخیل پر نقوش ہمیشہ استعارے و کنائے کی صورت میں نازل ہوتے ہیں ہر مفہوم اپنا مخصوص رنگین پیرہن لے کر ابھرتا ہے۔ ان کے تاثرات میں حسیت اور تجسیم کو بہت بڑا دخل ہے۔ ان کے کلام میں مجرد تصورات مفقود ہیں۔ جو خیال بھی وہ پیش کرتے ہیں ان میں حسیت کی کوئی نہ کوئی کیفیت یا ملی جلی کیفیات ضرور موجود رہتی ہیں اور یہ کیفیات رنگ برنگ کی تشبیہیں اختیار کرتی رہتی ہیں:

صحن گلشن میں بہر مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح
پھر لہو سے ہر ایک کاسہ داغ

پڑ ہوا جام ارغواں کی طرح
یاد آیا جنون گم گشتہ
بے طلب قرض دوستاں کی طرح
جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگ ناگہاں کی طرح

فیض کا مخصوص رنگ کلام کچھ اسی قسم کے نقوش سے آراستہ ہے۔ یہ تشبیہات معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی تحلیل سے اثر پذیر ہوئی ہیں۔ یہاں اشعار و تشبیہات دونوں ایک دوسرے کے ممنون احسان ہیں۔ ان کے زیر نظر مجموعے کی غزلوں میں اس نوعیت کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں: حشر، جنون، دار، لہو، دشمن، سنگ، داغ، جام، حسن، چراغ، کرن، گل، شام، گلشن، سحر، دل وغیرہ۔ ان کی تصویر کاری کا انداز اپنا ہے۔ وہ استعارے سے بکثرت کام لیتے ہیں اور تفصیلی تصویر کشی بہت کم کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ایما، اشارہ اور اجمال کی بلاغتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں استعارے کا خاص استعمال عجیب ہونے کے باوجود دلکش ہوتا ہے۔ یہی صفت تراکیب کے استعمال میں بھی ہے۔ وہ مضمون کی بنیاد پر تراکیب کو دور کی مناسبتوں اور قربتوں پر باندھ کر قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ اور قاری اس کیفیت میں مضمون کی گہرائی تک محو ہو کر گزرتا ہے۔ ان کی بیشتر تراکیب خاصی معروف ہوئی ہیں۔ تراکیب کا استعمال شاعری میں ایک توسیعی عمل ہوتا ہے۔ فیض نے ادبی روایات اور لسانی و صوتی موزونیت کا لحاظ کرتے ہوئے تراش و خراش او وضع و ایجاد سے بھی کام لیا ہے۔ بعض ترکیبیں جو انھوں نے تخلیق کی ہیں غالب کی تراکیب سے کم چست اور کم خیال انگیز نہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ا کی ایسی تراکیب دیکھنے میں آتی ہیں۔ حرف لطف، شمع وعدہ، خون دل و ج

لب مشکبو، پیانِ جنوں، سرکوئے دلفگاراں، صبحِ سخن، شامِ نظر، جنون گم گشتہ، دل ریزہ ریزہ، تن داغ داغ وغیرہ۔ ان کے طریقِ تعبیر کی جدت و ندرت نے فرسودہ نکات کو بھی تر و تازہ و درخشاں بنا دیا ہے۔ فارسی ترکیبوں کا یہ استعمال، ان غزلوں کی زبان، بیان اور لہجہ میرا خیال ہے کہ ایک نمایاں خصوصیت کی حیثیت سے ان کی شاعری میں ہمیشہ پایا جائے گا۔

فن اور تاثیر کے لحاظ سے جہاں تک اس مجموعے کی غزلوں کا تعلق ہے ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض کے کلام میں مصرعوں اور شعروں کی جو ترتیب اور تقسیم ہے وہ خیالات کی رو اور جذبات کی روانی سے عین مطابقت رکھتی ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر غزلیں "نقشِ فریادی" کی غزلوں سے بڑی حد تک اور "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کی غزلوں سے قدرے مختلف ہیں۔ زبان، بیان اور موضوع کے اعتبار سے "نقشِ فریادی" کی غزلیں وارداتِ قلبی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کی غزلیں عشقیہ تاثرات کے ساتھ ساتھ سیاسی تصورات سے بھی آراستہ ہیں۔ "دستِ تہ سنگ" کی غزلیں ایک ذہنی انتشار، کچھ نئی راہوں کی طلب کے احساس، تشنگی، آرزو اور انتظار کی آئینہ دار ہیں۔ یہ غزلیں مختلف آوازوں، مختلف رنگوں اور مختلف لہجوں سے عبارت ہیں۔ اور ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے ہر آواز، ہر رنگ اور ہر لہجہ خود فیض کا ہے۔ جب کہ اس سے قبل کی غزلوں میں فیض پر غالب اور اقبال کا بڑا خوشگوار اثر ملتا ہے۔ اس مجموعے کی صرف ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

شرح فراق مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

ذوق کی زمین میں کہی گئی ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں فیض

اساتذہ کے اثر سے بڑی حد تک آزاد ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان غزلوں میں فیض نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ ان میں ایک مخصوص آواز اور منفرد لہجے کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

زبان و بیان کے تعلق سے ایک اور بات جو دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں اس میں مستحسن ہے، یہ ہے کہ اس میں وہ کوتاہیاں اور خامیاں نظر نہیں آتیں جن کی طرف مختلف ناقدین نے توجہ منعطف کرائی تھی۔ پہلے مجموعوں کے مقابلے میں اس مجموعے کی غزلوں میں زبان و بیان کے اعتبار سے خاصی ہمواری اور پختگی پائی جاتی ہے۔ ویسے ان کوتاہیوں سے قطع نظر بھی کہ جو انھوں نے بیان و بلاغت کے ضمن میں روا رکھی ہیں، ان کی شاعری کے سحر سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔اس مجموعے کی غزلوں میں بھی ایک سحرکارانہ حسن اور دلکشی ملتی ہے۔ اس کا راز نہ صرف ان کے خلوص اور جذبات میں پوشیدہ ہے بلکہ اس بات میں بھی ہے کہ ان غزلوں کی زمینیں شگفتہ، بحریں مترنم اور لب و لہجہ نرم و شاداب ہے ان غزلوں کے بعض شعر تو خاص و عام میں ازبر ہیں۔ میرے نزدیک اس مجموعے کی یہ غزلیں جن کے پہلے مصرعے یہ ہیں:

- ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
- کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی
- نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا

فیض کی بہترین غزلیں ہیں۔ انھیں اردو غزل کی تاریخ میں دوام حاصل ہو گا اور یہ اردو غزل کے اچھے سے اچھے انتخاب میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔

طنز و مزاح کے دس سال

۱۹۷۰ء۔ ۱۹۸۰ء

نثر

ان گزشتہ دس برسوں میں، جہاں تک اردو نثر میں طنز و مزاح کا تعلق ہے--- لکھنے والوں میں نمایاں نام تو پرانے ہی ہیں، جو پچھلی دہائیوں میں لکھتے رہے ہیں اور ایک عرصہ پہلے ہی اپنے مقام و منصب پر پہنچ چکے تھے، جن میں شفیق الرحمان، کرنل محمد خاں، مشتاق احمد یوسفی اور ابن انشا خاص طور پر ممتاز رہے۔ بعض معروف مزاح نگار، جنھوں نے گزشتہ دہائیوں میں اپنی ممتاز حیثیت کو متعین کرایا تھا، اس دہائی میں یا تو منظر سے ہٹ گئے یا انھوں نے پہلے کے مقابلہ میں بہت کم لکھا --- جیسے ایم آر کیانی، شفیق الرحمان، مسعود مفتی اور ابراہیم جلیس۔ کیانی کا تو پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا، لیکن ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ، جس میں ان کے مخصوص اسلوب مزاح کے حامل مکتوبات شامل ہیں، اس دہائی میں شائع ہوا۔ جلیس نے اس دہائی کے نصف آخر میں وفات پائی۔ شفیق الرحمان نے بہت قال قال کچھ لکھا۔ مسعود مفتی نے طنز و مزاح کی طرف توجہ بہت کم کر دی ہے۔ اب وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہی ہیں لیکن ایک

عرصہ قبل وہ اچھی افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ کامیاب مزاح نگاری کی طرف بھی توجہ دیتے رہے ہیں۔ "محدب شیشہ" اور "سرراہے" کو طنز و مزاح کے ادب میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان ہی کی طرح امجد حسین نے بھی اس عرصہ میں طنز و مزاح کو کوئی قابل ذکر چیز نہیں دی۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "میرا گریبان" گزشتہ دہائی کے عین اختتام پر شائع ہوا تھا۔ کم لکھنے کی تو ان کی یہ روایت رہی ہے لیکن اس عرصہ میں ان کی بہت کم تحریریں دیکھنے میں آئیں۔ "ادب کے باوا لوگ" جیسی کوئی تحریر انھوں نے توقع کے باوجود پیش نہیں کی، لیکن پھر بھی منفرد انداز نظر میں اور اسلوب کے لحاظ سے ان کے چند مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔

اس سلسلہ میں متعدد ایسے معروف اور غیر معروف مزاح نگار بھی ہیں، جو گزشتہ دہائیوں میں جس انداز سے لکھ رہے تھے، اس عرصہ میں بھی انھوں نے اسی انداز اور روایت کو برقرار رکھا۔ ایسے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد انشائیہ نگاری کے ضمن میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتی رہی۔ جیسے مشتاق قمر، نظیر صدیقی، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، سجاد نقوی، منصور قیصر وغیرہ۔۔ لیکن یہ ایک علیحدہ جائزہ کا موضوع ہے۔ کیونکہ انشائیہ بہرصورت طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے ایک الگ شے ہے اور اس لیے اسے طنز و مزاح کے معیار سے پرکھنا جائز نہیں ہو گا۔ ویسے بعض انشائیہ نگاروں نے انشائیہ لکھتے ہوئے بھی خالص طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔

طنز و مزاح کے یہ گزشتہ دس سال گو سابقہ دہائیوں کی روایات پر استوار رہے لیکن پھر بھی اس روایت میں ایک نمایاں حد تک اضافہ ہوا اور اس کے موضوعات اور اس کے اسلوب میں وسعت پیدا ہوئی۔ عام طور پر ادب میں طنز و مزاح کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے اس معاشرہ کے مزاج اور

منہاج سے وابستہ کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں بالعموم یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ مزاح دراصل ایک متناسب اور خوش آہنگ معاشرہ کی تہذیب و شائستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس نقطہ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات پاکستانی معاشرہ کے ساتھ ' کم از کم ان دس سالوں میں سیاسی اور تہذیبی صورت حال کے نتیجہ میں متناسب اور خوش آہنگ نہیں رہا۔ سیاسی اور تہذیبی انتشار' اضطراب اور بحران نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ سیاسی اور قومی سطح پر المناک صورت حال بھی رونما ہوئی اور قومی زندگی کے منظر پر بے یقینی کی فضا چھائی رہی لیکن اس کے باوجود طنز و مزاح کے ادب میں مشتاق احمد یوسفی' کرنل محمد خاں' ابن انشا نثر میں اور ضمیر جعفری اور سید محمد جعفری شاعری میں اپنے سبک' شگفتہ اور شائستہ اسلوب کے ساتھ اس کے ارتقا میں حصہ لیتے رہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہو کہ معاشرہ کا اضطراب' یاس و محرومی اور دستور زباں بندی جب کھل کر بات کرنے نہیں دیتے تو طنز و مزاح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بات چاہے کچھ ہو' واقعہ یہ ہے کہ ان دس سالوں میں طنز و مزاح اور اس کی مختلف صورتوں کو بہت نکھار اور استحکام حاصل ہوا۔ بعض پختہ لکھنے والوں نے ادب کو چند نئی اور معیاری تخلیقات دیں' متعدد اہم اور کم اہم ناموں کا اضافہ ہوا اور بالخصوص نثری اسلوب میں بعض دل پذیر مثالیں دیکھنے میں آئیں۔

یہ دس سال بھی کرنل محمد خاں' مشتاق احمد یوسفی اور ابن انشا کے لیے بڑی کامیابی کے سال رہے۔ شفیق الرحمان نے اس عرصہ میں جو کچھ لکھا' اس سے ان کے فن میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی--- بلکہ اس میں ایک ٹھہراؤ سا رہا۔ کرنل محمد خاں' نے اس عرصہ میں "بسلامت روی" کا اضافہ کیا۔ ویسے ان کی اور مشتاق احمد یوسفی دونوں کی اصل شہرت و اہمیت ان کی پہلی کتابوں "بجنگ آمد" اور "چراغ تلے" کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ان دونوں کے بارے میں

یہ کہنا کہ ان پہلی کتابوں کے بعد ان کی جو دوسری تصانیف منظر عام پر آئیں یا اس زیر نظر عرصہ میں ان کے فن میں خصوصیات کا کچھ اضافہ ہوا تو شاید یہ درست نہ ہو گا۔۔۔ اس حد تک ضرور ہے کہ اگر ان کے فن نے ارتقاء کے مزید مراحل طے نہ کیے تو اس میں ٹھہراؤ بھی نہیں آیا۔ ان دونوں نے اپنی روایات کے استحکام کو برقرار رکھا۔ کرنل محمد خاں نے اس عرصہ میں "بسلامت روی" کا جو اضافہ کیا اس میں مزاح نگاری کے لحاظ سے بڑی سلامت روی کا ثبوت دیا۔ یہ بنیادی طور پر تو ایک سفر نامہ ہے جس میں پاکستان سے انگلستان کے درمیان چند ممالک کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن دراصل اس میں سفرنامہ نگاری سے قطع نظر ہم سفر شخصیات میں مزاح کے پہلو تلاش کیے گئے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں انھیں دشواری پیش نہیں آئی، کیونکہ وہ جس طرح مختصر جملے تحریر کرتے ہیں اور سلاست اور روانی پیدا کرتے ہیں اور بظاہر جتنی آسانی اور چستی کے ساتھ مزاح نگاری کے جوہر دکھاتے چلے جاتے ہیں، یہ ان کی تحریر کا مزاج بن گئے ہیں اور اس مزاج کی تشکیل میں انھیں یقیناً" بڑی محنت اور ریاضت سے گزرنا پڑا ہو گا۔ اسے تحریر کرتے ہوئے کرنل محمد خاں نے جس سادگی، بے ساختگی اور شگفتگی سے کام لیا ہے، وہی ان کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ معمولی سے معمولی بات ان کے انداز بیان سے ایک لطیف تجربہ اور ایک فنکارانہ عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں مشاہدہ کا تنوع اور احساس کی رنگا رنگی کا کمال شامل ہے۔ اگرچہ وہ فوجی زندگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن اس میں زندگی کے اہم مسائل کا بھی عمل دخل ہے۔ بنیادی طور پر وہ مزاح نگار ہیں اور ان کی تحریروں میں طنز کی آمیزش عنقا ہے۔ ان کی حالیہ تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مزاح میں کس قدر تازگی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاح میں بالعموم پطرس اور رشید احمد صدیقی کے اثرات تلاش کیے جاتے ہیں اور اس کا ایک بڑا سبب ان کا اپنی ذات کو بھی مزاح میں شامل کرلینا ہے۔ اس عرصہ میں ان کی جو واحد تصنیف "زرگزشت" شائع ہوئی وہ ان کی "سوانح عمری" ہے۔ اس میں یوسفی نے مزاح کو بطور حربہ اپنے آپ پر آزمایا بلکہ "زخمایا" ہے۔ ان کی تحریروں میں لفظ' خیال اور واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ آج کے دور میں برجستگی اور ذہانت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں الفاظ و محاوروں کے ردو بدل اور صوتی مترادفات سے مزاح پیدا کرنے کی روایت کے غالباً وہ تنہا امین ہیں۔ "زرگزشت" ان کے مخصوص اسلوب کا ایک اچھا اور نمائندہ اظہار ہے۔ اس کی بنیاد ان کی اپنی ذات پر استوار ہوئی ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف واقعات' مشاہدات اور کرداروں کو جس رخ سے دیکھا اور پرکھا ہے' ان کے خط و خال نمایاں کرتے ہوئے انھوں نے شگفتگی' ذہانت اور صداقت کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ وہ انسانی نفسیات اور روزمرہ زندگی کی صداقتوں سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ان کا مزاح ایک شائستہ اور پروقار فضا میں جنم لیتا ہے۔ اس میں عام طور پر ایک تو خوشگوار طنز ہے' جس میں تلخی اور ترشی کے بجائے لطافت کا شائبہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ "زرگزشت" مزاح کے اس عہد کی ایک توانا اور شگفتہ تخلیق ہے۔

یوسفی کے ساتھ ساتھ اس عہد میں ابن انشاء کو بھی ایک انفرادیت حاصل رہی ہے۔ مگر اس دہائی کے اواخر میں ان کی وفات خود طنز و مزاح کے لیے بھی ایک المیہ ہے لیکن اس عرصہ میں انھوں نے مزاحیہ ادب کو "اردو کی آخری کتاب" "آوارہ گرد کی ڈائری" "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" "دنیا گول ہے" جیسی متنوع اور شگفتہ تصانیف دیں۔ مزاح میں تنوع پسندی ان کی

نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ چنانچہ موضوعات میں اور اسالیب میں دونوں جگہ اس کا اظہار ہوا ہے۔ طنز' پیروڈی' لفظوں کے الٹ پھیر اور بات سے بات پیدا کر کے مزاح پیدا کرنا انکا امتیازی وصف ہے۔ چنانچہ مذکورہ کتابوں میں ان کے مخصوص اسلوب کو ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں مختلف واقعات و حالات اور انسانی اعمال سے مزاح پیدا کرنے کام لیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں علامات کا استعمال بھی زیادہ ملتا ہے۔ ان کے مزاح کے اس تناظر میں بڑی وسعت ہے اور ان کے اسلوب اور جملوں کے استعمال میں بڑی برجستگی ہوتی ہے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اسلوب سے بہت سی باتوں کا پس منظر بھی بیان کرتے ہیں اور بالکل سادہ اور معمولی واقعات سے بھی طنز و مزاح تخلیق کرنے کی بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔ مختصر مضامین' صحافیانہ کالم اور سفرنامے' وہ ہر جگہ ایک کامیاب مزاح نگار کے طور نمایاں رہے۔

محمد خالد اختر نے اس عرصہ میں اپنے اسلوب کی سابقہ روایات کو برقرار رکھا۔ ان کا لہجہ اور اسلوب پختہ رہا ہے اور ہمیشہ ہی کی طرح وہ دھیمے دھیمے لہجہ میں بات کرتے رہے ہیں۔ ان کے موضوعات اور ان کا اسلوب قاری کو تبسم زیر لب سے زیادہ آگے نہیں لے جاتا۔ بعض اوقات آورد کا احساس بھی ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زبردستی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف رسائل میں ان کے متعدد مضامین اور خطوط بھی شائع ہوئے۔ آج کے دور میں خطوط کی صورت میں پیروڈی لکھنے میں غالباً" سب سے زیادہ مستقل مزاج ثابت ہوئے ہیں۔ چند رسالوں میں بالخصوص "فنون" (لاہور) میں ان کی ایسی کئی پیروڈیاں شائع ہوئیں۔ اسی میں پاکستانی درندوں پر ان کا ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا' جو ان

کے مخصوص اسلوب کا حامل رہا۔ اگرچہ ان کے اسلوب میں روانی ہے لیکن الفاظ کے انتخاب میں خاص احتیاط اور ہنرمندی کا عنصر نظر نہیں آتا۔ چنانچہ دوسرے مزاح نگاروں کے مقابلہ میں ان کی تحریریں کسی دیرپا تاثر اور شگفتگی کی حامل نہیں ہیں۔

سابقہ دہائیوں میں مزاح نگاری میں جو چند نئے نام ابھرے تھے اور جن کی ایک بڑی تعداد دراصل انشائیہ نگاری کے توسط سے طنزومزاح کی طرف آئی ہے، مثلاً" نظیر صدیقی، باقر علیم، منصور قیصر، مشتاق قمر، اسرار اشفاق، انور سدید وغیرہ، ان مزاح نگاروں نے کوئی مستقل اہمیت کی تصنیف پیش نہیں کی، متفرق مضامین اور انشائیوں میں طنز و مزاح کی مختلف صورتوں کی تخلیق ضرور کرتے رہے۔ لیکن اب ان مزاح نگاروں کا حاوی رجحان طنز و مزاح سے قطع نظر انشائیہ نگاری کی طرف ہے۔ گو منصور قیصر، سجاد نقوی، مشتاق قمر، انور سدید نے بعض اچھے مزاحیہ مضامین بھی تحریر کیے۔ غلام جیلانی اصغر، رضیہ فصیح احمد، فرخندہ لودھی، احسان ملک گاہے گاہے مزاحیہ مضامین تحریر کر لیتے ہیں لیکن ان ناموں میں زیادہ نام ایسے ہیں جنھوں نے دراصل انشائیہ ہی میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ مشکور حسین یاد بھی بیک وقت طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری کے حوالہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ "دشنام کے آئینے میں"، "جوہر اندیشہ"، اور "اپنی صورت آپ" اس عرصہ میں شائع ہونے والی ان کی طنزیہ و مزاحیہ اور انشائیہ تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ان کی تحریریں بالعموم شگفتہ اسلوب کی حامل ہوتی ہیں۔ ان تصانیف میں انھوں نے بطور خاص معاشرتی ناہمواریوں اور شخصی بوالعجبیوں کو ہدف بنایا ہے۔ "ستارے چہچہاتے ہیں" ان کی حال میں شائع ہونے والی دلچسپ تحریروں پر مشتمل تصنیف ہے۔ اس میں مصنف نے مزاحیہ زائچے تحریر کر کے بہت شستہ مزاح تخلیق کیا ہے۔

سجاد نقوی نے مزاحیہ ادب میں چند اچھے طنزیہ و مزاحیہ ڈراموں کا اضافہ کیا ہے۔ اس عرصہ میں بھی انھوں نے ایسے کچھ ڈرامے تخلیق کیے اور اس روایت کو آگے بڑھایا جسے ڈراموں یا تمثیلوں میں خواجہ معین الدین، اصغر بٹ اور مرزا ادیب نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ ڈراموں سے تشکیل دیا تھا۔ خواجہ معین الدین کے مقبول، دلچسپ اور طنزیہ و مزاحیہ ڈرامے "لال قلعہ سے لالو کھیت تک" اور "مرزا غالب بند روڈ پر" اس عرصہ میں کتابی صورتوں میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے یہ ڈرامے موضوع اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے عام دلچسپی اور مثالی مقبولیت کا باعث بنے۔ ان کے موضوعات تمام تر معاشرتی زندگی اور قومی تہذیب کے نشیب و فراز پر مبنی ہیں۔ اس لیے ان میں زندگی کی حقیقی عکاسی ہے اور خارجی اثرات اور قومی نظریات کی ہم آہنگی نمایاں ہے۔ ہر ڈرامہ کے کردار عملی زندگی کے جیتے جاگتے افراد اور ان کے مکالمے ان ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی طنز نگاری میں ندرت بیان اور شوخی کا انوکھا انداز پایا جاتا ہے۔ مکالموں میں الفاظ کے الٹ پھیر سے وہ بہت گہرے اور تیکھے طنز کا کام لیتے ہیں۔

مسٹر دہلوی نے، جنھوں نے زیادہ شہرت اپنی مزاحیہ شاعری کے سبب پائی، اس عرصہ میں اپنی مزاحیہ نثری تحریروں کے دو مجموعے "سوء ادب" اور "سپرد قلم" ترتیب دیئے۔ ان کے یہ مضامین اس اعتبار سے ان کی کامیاب کوششیں ہیں کہ انھوں نے ان کے ذریعہ عصری رجحانات، حالات اور شخصیات کا پرمزاح اور متنوع جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں طنز و مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش ہے۔ ان کا لہجہ بہت دھیما دھیما اور محض تبسم زیر لب کا حامل رہتا ہے لیکن عام طور پر وہ ایک بات کو بہت وضاحت اور تفصیل سے اور اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کا تاثر محدود ہو جاتا

ہے۔ اگر ان میں اختصار سے کام لیا جاتا تو وہ زیادہ شگفتہ اور دلچسپ ہو سکتے تھے۔ چونکہ ان کے موضوعات بھی بہت "بھاری بھرکم" اور "ثقیل" ہوتے ہیں اس لیے بھی اسلوب میں شگفتگی کی صفات زیادہ ہونی چاہییے تھیں۔ ضمیر جعفری بھی بنیادی طور پر ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن نثر میں بھی ان کی چند تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ خصوصاً سابقہ دہائی میں فکاہی مضامین کا ایک مجموعہ "اڑتے ہوئے خاکے" اپنی شگفتہ تحریر کے سبب لوگوں کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ اس عرصہ میں مزاحیہ نثر میں ان کی دو کتابیں "آنریری خسر" اور "کتابی چہرے" شائع ہوئیں۔ اول الذکر ایک مزاحیہ اور دلچسپ ناول ہے اور دوسری کتاب شخصی خاکوں اور تعارفی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں میں ضمیر جعفری نے اپنی شگفتہ نگاری سے نثری اسلوب میں اپنی قائم کی ہوئی روایتوں میں مزید کئی خصوصیات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی تحریر بہت شگفتہ اور دلکش اور وہ بعض اوقات لفظوں کی نشست و برخاست سے اپنے اسلوب کو کہیں زیادہ توانائی اور نکھار دیتے ہیں۔

اس عرصہ میں نئے لکھنے والوں میں ایک خاصی بڑی تعداد ان مزاح نگاروں کی ہے، جو فوج سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے بھی بعض محض فوجی زندگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں افواج پاکستان کے مجلّہ "ہلال" کو امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس کے توسط سے افواج پاکستان میں سے ایسے اہل قلم اور مزاح نگار عام ادبی دنیا کو فراہم ہو رہے ہیں، جو بالخصوص طنز و مزاح میں آج ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ اس روایت میں، جس کا ایک اچھا آغاز سید ضمیر جعفری، کیپٹن شفیق الرحمان اور کرنل محمد خاں سے ہوا تھا، اب متعدد ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ کیپٹن صولت رضا، کیپٹن اشفاق حسین، کیپٹن محمد ادریس، کرنل مسعود اور میجر صدیق سالک کی کاوشوں کو مزاحیہ ادب میں خوشگوار

اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ ان مزاح نگاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ سے موضوعات کے تنوع اور اسلوب میں خاصہ دلچسپ اور مفید اضافہ کیا ہے۔ کیپٹن صولت رضا کی تصنیف "کاکولیات" پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول' (نوارد فوجیوں کی تربیت گاہ) میں زیر تربیت ایک جنٹلمین کیڈٹ کی دلکش آپ بیتی ہے۔ مصنف نے اس میں نہایت شگفتہ اور شائستہ طریقہ سے دوراز نگاہ دنیا کی سیر کرائی ہے۔ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو بیان کرنے کے لیے مصنف نے نہایت پرکشش زبان استعمال کی ہے۔ متعدد مقامات پر دلکش تراکیب اور پرمزاح بندش الفاظ سے کام لیا ہے۔ بے ساختہ انداز بیان' استعاروں اور جملوں کا برمحل استعمال بھی ان کے اسلوب کی خوبیاں ہیں۔ کیپٹن اشفاق حسین کی تصنیف "جنٹلمین بسم اللہ" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ بھی فوجی تربیت اور فوجی زندگی سے پیدا ہونےوالے مزاح کی ایک عمدہ مثال ہے۔ مصنف نے اپنی فوجی زندگی کی ابتداء سے لے کر اپنی فوجی تربیت کے مکمل ہونے تک کے دوران پیش آنے والے واقعات' حادثات' مناظر' معمولات اور شخصیات کا تذکرہ بڑے دلچسپ اور پرمزاح انداز میں کیا ہے۔ مصنف کی زبان' الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ترتیب بھی ان کے طرز تحریر اور اسلوب کی انفرادی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ انھوں نے متعدد برمحل اشعار' پھر بعض معروف اشعار کی تضمین' کہاوتوں' محاوروں اور ضائع و بدیع سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب مزاح کی مثال ہے۔ صدیق سالک کی تصنیف "ہمہ یاراں دوزخ" مشرقی پاکستان کے المیہ کے زیر اثر وجود میں آئی۔ مصنف نے دو سال کا عرصہ ایک فوجی افسر کی حیثیت سے بھارت کی قید میں گزارا تھا۔ یہ تصنیف ان ہی مراحل کے واقعات اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ مصنف کا اسلوب شستہ اور دلچسپ ہے اور بالعموم واقعات' شخصیات اور

جملوں کے ذریعہ وہ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مزاح کا انداز دھیما لیکن پرکیف ہے۔ "قلم اور کوڑے" کرنل مسعود احمد کی مزاحیہ تحریروں پر مشتمل تصنیف ہے۔ مصنف نے اس میں زندگی کے عام مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ انداز شگفتہ ہے اور ان کا اسلوب اپنا مخصوص ہے۔ بالعموم الفاظ اور جملوں کی مدد سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ طنز کی آمیزش بھی موجود ہے لیکن بہت نمایاں نہیں۔

کچھ ایسے نام جو طنز و مزاح کی دنیا میں میں نئے ہیں لیکن اپنی کاوشوں کے سبب انھوں نے ایک عام ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے، اس عرصہ میں ابھرے اور بجاطور پر ان میں سے چند نام ایسے ہیں جن سے طنز و مزاح کے ادب کو بہت کچھ توقعات ہو سکتی ہیں۔ مرزا محمد منور معروف نقاد اور شاعر ہیں، لیکن اپنی نیم مزاحیہ تحریروں کے مجموعہ "اولاد آدم" کے توسط سے طنز و مزاح کی دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ تحریریں، جو مضامین اور قصوں پر مشتمل ہیں، مختلف وقتوں میں تحریر کی تھیں۔ ان کا مجموعہ سات سال قبل شائع ہوا تو بجاطور پر لوگوں کی توجہ کا باعث بنا۔ ان کی یہ تحریریں متنوع موضوعات کی حامل ہیں، جن میں کہیں احباب کا تذکرہ ہے، کہیں ذاتی وارداتوں کا ذکر ہے اور کہیں معاشرے کے مختلف کرداروں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ سب تحریریں نیم مزاحیہ موضوعات کی حامل ہیں، جن میں مصنف نے پختہ اسلوب اور منجھے ہوئے انداز کا ثبوت دیا ہے۔ مزاح کی تخلیق کے لیے زیادہ تر الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کے استعمال اور لفظی تحریف و تضمین سے کام لیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے بعض مضامین اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے قابل قدر اضافہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

عصمت اللہ خاں کا مجموعہ مضامین "گندم نما" بھی طنز و مزاح میں

مصنف کی چونکا دینے والی تحریروں پر مشتمل ہے۔ چونکا دینے والی اس اعتبار سے کہ مصنف نے بعض اچھوتے اور انوکھے موضوعات کو موضوع بنایا ہے اور بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ انھیں بیان کیا ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے وہ سب ہی ہماری عام معاشرتی زندگی اور اس کے متنوع مسائل کے بارے میں ہیں اور ان مضامین میں جو کردار اور حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ بھی ہم سے بہت قریب تر ہیں۔ مصنف نے ایسے مسائل کو بالخصوص منتخب کیا ہے جن پر عام افراد کی نظر کم ہی پڑتی ہے۔ اور پھر انھیں مزاح کے پیرایے سے بیان کرنا، یہ مصنف کی کامیابی کی دلیل ہے۔ انھوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے، وہ منفرد بھی ہے اور دلچسپ اور موثر بھی۔ زبان و بیان پر کامل قدرت کے ساتھ لفظی تحریف و تراکیب ان کے اسلوب کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ اس اعتبار سے "گندم نما" کے مصنف میں ایک اچھے اور کامیاب مزاح نگار کے بھرپور امکانات ظاہر ہوئے ہیں۔

"چودہ طبق" شمس کاشمیری کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ سب مضامین مختلف پہلوؤں سے ان مسائل کا احاطہ کرتے ہیں جن سے ہمارے معاشرے کی اکثریت دوچار رہتی ہے۔ زندگی کی متعدد دشواریاں اور ناہمواریاں ان مضامین میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ مصنف نے زبان کے استعمال میں بڑی جاذبیت اور مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ ان کا فطری انداز معلوم ہوتا ہے۔ گو مصنف کے قلم میں بڑی روانی ہے اور وہ بعض مقامات پر بہت تیز رفتاری کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور گو ان کے موضوعات ان کے انفرادی تجربات کی عکاسی کرتے ہیں، لیکن واقعات و حالات کے موضوعی اور معروضی تجزیے کے دوران قاری کو بھی وہ عام طور پر اپنے ساتھ ساتھ شریک رکھتے ہیں۔ "گستاخی معاف" مظفر بخاری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے --- جو

اولاً" فکاہی کالموں کی صورت میں ۱۹۷۴ء کے دوران روزنامہ "مغربی پاکستان" میں شائع ہوئے تھے اور بعد میں ترمیم و اضافہ کے بعد مضامین کی صورت میں لکھ کر شائع کیے گئے۔ یہ مضامین دلچسپ موضوعات' زندگی کے عام مسائل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حادثات' تمام واقعات اور کرداروں کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ مصنف نے بہت دلچسپ پیرایہ اور شگفتہ زبان استعمال کی ہے اور پرمزاح واقعات اور جملوں کا انتخاب کیا ہے۔ "دوست کون" آفتاب احمد شمسی کے مضامین کا مجموعہ ہے' جو بہت ہلکے پھلکے اور تیکھے انداز میں لکھے گئے عام موضوعات اور عام مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے اسلوب پر خاصی گرفت اور مہارت ہے۔ تحریر میں بے ساختگی اور چابک دستی' جو کامیاب مزاح کی خصوصیات میں سے ہیں' ان کی تحریروں میں عام طور پر ملتی ہیں۔ ماجد صدیقی کی نثری کاوش "صورت احوال آں کہ" بظاہر مصنف کی زندگی کے ایک مخصوص دور کے واقعات پر مشتمل ہے لیکن یہ نہ ان کی آپ بیتی ہے اور نہ سوانح عمری' کتاب کے تمام ابواب باہمی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ ان واقعات کو' جو سادہ اور بہت عام ہیں' ایک بھرپور اور متنوع ماحول کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مصنف نے نفس مضمون کے ساتھ ساتھ لطف زبان کا بھی خیال رکھا ہے ۔ کرم الٰہی فاروقی کے کا مجموعہ "خندہ زیر لب" متنوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان میں مصنف نے سادہ اور سلیس زبان میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعہ کے بعض مضامین اپنے دلچسپ موضوع کے سبب جاذب نظر ہیں۔ اقبال ساغر صدیقی کے مضامین کا مجموعہ "شوخی تحریر" عصری مسائل سے متعلق ہے۔ مصنف نے اس میں خطابیہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ بظاہر یہ تحریریں کسی اخبار کے کالم کے انداز میں لکھی گئی ہیں' لیکن دراصل یہ مضامین ہی ہیں۔ مصنف نے مزاح پیدا کرنے کے لیے بالعموم

الفاظ کے استعمال سے اور کہیں کہیں اشعار کے استعمال سے بھی مدد لی ہے۔
صلاح الدین حیدر نے "حماقتیں میرے مقدر کی" اپنی ایسی ہی تحریروں پر مشتمل کتاب ترتیب دی۔ ان کے موضوعات میں تنوع اور اسلوب میں دلکشی ہے۔ "باتوں کے خربوزے" مختار زمن کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے واقعات و حالات کے ساتھ کرداروں کو بھی ظرافت کا موضوع بنایا ہے۔ یہ مضامین مصنف کے سماجی شعور کی پیداوار ہیں، جس کے تحت وہ واقعات، مسائل اور کرداروں کو طنز و مزاح کے پہلو سے دیکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ مضامین دلکش اور متنوع ہے اور اس بات کا مظہر ہے کہ طنز و ظرافت سے مصنف کو خاص اور فطری لگاؤ ہے۔ لفظوں کی تحریف اور الفاظ کی بندش سے بھی انھیں مزاح پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔

اس عرصہ میں طنز و مزاح میں مستقل تصانیف اور مضامین کے مجموعوں کے علاوہ بعض ایسی کتابیں بھی منظرعام پر آئیں جن میں کہیں زیادہ اور کہیں کم، طنز و مزاح کا شائبہ ملتا ہے۔ اس قسم کی مثالوں میں بعض بہت عمدہ طنز و مزاح کے نمونے بھی تخلیق ہوئے۔ مرزا ظفر الحسن کی تصانیف اور مشفق خواجہ کے تحریر کردہ بعض دیباچے اس ضمن میں خصوصی تذکرہ کے متقاضی ہیں۔ مرزا ظفر الحسن نے اپنی معروف اور مقبول تصنیف "ذکر یار چلے" میں جس دلکش نثر اور پر لطف انداز بیان کو تخلیق کیا تھا، اسی روایت کا اظہار ان کی حالیہ تصانیف میں بھی ہوا ہے۔ "عمر گزشتہ کی کتاب اور "ذکن اداس ہے یارو" میں تبسم زیر لب کے حامل مزاح کو متعدد مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنف نے دلچسپ واقعات کو دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ان کی نثر خوبصورت اور اسلوب بے ساختہ ہے۔ ان کے بعض مضامین بھی، جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے، ان کے ایسی دلکش اور خوبصورت اسلوب کے حامل

ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو مزاح سے فطری لگاؤ ہے اور جو مزاح وہ تخلیق کرتے ہیں وہ اکتسابی نہیں۔ مشفق خواجہ نے اس نوعیت کے حامل جو مضامین لکھے وہ دیباچوں یا شخصی خاکوں کی صورت میں ہیں۔ مثلاً" حمزہ فاروقی کے سفرنامہ "زمان و مکان اور بھی ہیں" پر ان کا لکھا ہوا مقدمہ یا پھر اسی طرح مرزا ظفرالحسن کی کتاب "دکن اداس ہے یارو" پر جو مقدمہ انھوں نے تحریر کیا' بہت دلکش اور پرکیف مزاح کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی سلسلہ میں ابن انشاء پر ان کی تاثراتی تحریر اور غالب کے انداز میں مرزا ظفرالحسن کے تعلق سے لکھا ہوا ان کا مکتوب بھی کامیاب اور دلکش مزاح کے نمونے ہیں۔ ان کے مزاح کی امتیازی خصوصیت ان کا منفرد اور پرکیف اسلوب ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب اور جملوں کے استعمال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ذومعنی الفاظ کا استعمال وہ بکثرت کرتے ہیں اور یہ ان کی امتیازی خصوصیت ہے اسی خصوصیت کے ساتھ وہ طنز بھی کرتے ہیں جو بہت تیکھا اور چبھتا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں طنز و مزاح کا نہایت دلکش امتزاج ملتا ہے۔

دیگر مصنفین میں جن کی تصانیف میں طنز و مزاح کا شائبہ ملتا ہے' رحیم گل کا بھی ایک نام قابل ذکر ہے۔ ان کی ایک دو کتابوں بالخصوص ان کے تحریر کیے ہوئے شخصی خاکوں کے مجموعہ "پورٹریٹ" میں جا بجا مزاح کا پہلو نظر آتا ہے۔ ان خاکوں میں مصنف نے مختلف افراد کے ساتھ وابستہ مزاح کو دلچسپ پیرایہ میں تحریر کیا ہے۔ سید مشتاق علی کی کتاب "یادوں کی خرافات" اسی نوعیت کی تصنیف ہے۔ یہ ذاتی یادوں اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ اور مصنف کے بقول جوش ملیح آبادی کی تصنیف "یادوں کی برات" کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی ہے۔ اسی مصنف کی ایک دوسری تصنیف "چنیا بیگم سے تمباکو بہادر تک" بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔

کالم نگاری

اس عرصہ میں کالم نگاری میں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ابراہیم جلیس، نصراللہ خاں اور ابن انشاء اپنی گزشتہ عرصوں کی قائم کی ہوئی روایتوں پر کم و بیش قائم رہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس عرصہ میں "امروز" کے علاوہ "جنگ" میں بھی کالم لکھنے شروع کیے اور کچھ عرصہ تک روزانہ اور پھر اب ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ "امروز" کے کالم لکھتے ہوئے انھوں نے جن خصوصیات کا اظہار کیا تھا' وہ طنز و مزاح کے تعلق سے جنگ میں برقرار نہ رکھ سکے۔ اب ان کی تحریریں اس لحاظ سے شگفتگی اور انفرادیت کی حامل نہیں رہیں۔ امروز میں "حرف و حکایت" کے زیر عنوان ان کے جو کالم اس عرصہ میں شائع ہوئے وہ ان کے مخصوص اسلوب کے حامل رہے۔ ان کے انداز میں جو نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ لفظوں کے الٹ پھیر سے معنویت پیدا کرنے میں بڑی خلاقی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ انتظار حسین نے طنزومزاح کو کالم نگاری میں بڑی شائستگی اور بڑا نکھار دیا ہے۔ وہ اخبار مشرق میں "لاہور نامہ" کے عنوان سے جو کالم لکھتے رہے ہیں' وہ اب ان کے نام اور اسلوب کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کے بعض منتخب کالموں کے کا ایک مجموعہ "ذرے" چند سال قبل شائع ہوا ہے۔ کالموں میں انتظار حسین کا لب و لہجہ بڑا دھیما اور متین اور انداز واقعہ نگاری اور قصہ گوئی کا سا ہے۔ تہذیبی اور معاشرتی مسائل ان کے خاص موضوعات ہیں' جو ان کے کالموں میں تبسم زیر لب مزاح اور کبھی کبھی شوخی آمیز طنز کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ متناسب الفاظ' روزمرہ اور محاوروں کا برمحل استعمال اور مکالمہ نگاری ان کی تحریر کو شگفتگی اور دلکشی عطا کرتے ہیں۔

ابن انشاء نے کالم نگاری میں بڑی جاذبیت اور شگفتگی کا اظہار کیا ہے۔ کالم نگاری میں ان کا اسلوب ان کی ایک بڑی انفرادیت کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ وہ

اپنے معاصر کالم نگاروں سے اس لحاظ سے مختلف نظر آتے ہیں کہ وہ بالکل سادہ اور معمولی واقعات سے بھی طنز و مزاح پیدا کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ سنجیدہ اور خشک مسائل کو سیدھے سادے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک طرف ان کے الفاظ اور جملوں کی برجستگی اور دوسری طرف ان کا گہرا طنز قاری کے لیے بڑا موثر اور دلنشیں ہوتا ہے اور وہ اسے فکر انگیز بھی محسوس کرتا ہے۔ ان کے کالموں کی ایک خاص علمی سطح بھی ہوتی ہے، جس میں ان کے مزاح اور طنز میں چھپے ہوئے لطیف اشارے پنہاں ہوتے ہیں، چنانچہ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے بعض اوقات قاری کا ان کے پس منظر سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اپنی متعدد خصوصیات کے لحاظ سے انھوں نے مزاحیہ کالم نگاری کو نئی جہت دی تھی، افسوس کہ وہ انہی پر ختم بھی ہوئی۔

ابراہیم جلیس کے کالموں میں بالعموم معاشرتی اور تہذیبی مسائل کے مقابلہ میں سیاسی موضوعات کی کثرت ہوتی ہے۔ ان کے طنز و مزاح کا نشانہ عام طور پر سیاسی قائدین اور سرکاری افسر بنتے رہے ہیں۔ ان کے انداز میں لطیف اشاروں کے بجائے پھبتی کا عنصر نمایاں ہے اور پھر وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے پوری وضاحت سے کام لیتے ہیں، چنانچہ قاری کو پورا کالم پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ بسیار نویس رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے طنز کی چبھن اور مزاح کی شادابی ہمیشہ برقرار رہی۔ ان کے کالموں پر مشتمل اس عرصہ میں ان کی کچھ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ نصراللہ خاں بھی اپنے کالموں کے سبب خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے کالموں میں، جو وہ اخبار "حریت" میں لکھتے ہیں، واقعات اور شخصیات کے اعمال و افعال سے مزاح پیدا کرنے کا عنصر نمایاں ہے۔ لیکن یہ مزاح ہلکی مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتا اور اس میں بالعموم شائستگی اور متانت کی ایک

فضا موجود رہتی ہے۔ الفاظ اور جملوں سے بھی مزاح کی تخلیق میں وہ مدد لیتے ہیں۔ ان کے کالموں کا ایک انتخاب "بات سے بات" کچھ عرصہ قبل شائع ہوا ہے۔ دیگر کالم نگاروں میں ایک نام ارشاد احمد خاں کا بھی ہے جو عوامی مزاج کے حامل موضوعات پر مشتمل مزاحیہ کام لکھ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، کراچی کے اخبار "مشرق" اور "اخبار خواتین" میں ان کے کالم مستقبل شائع ہوتے ہیں۔ بالعموم مختلف سماجی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں اور معاشرے کے مختلف طبقات اور افراد کے مضحک پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ وہ اکثر مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور اسی کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کالم نگار مزاحیہ کالم نگاری کے باب میں اپنی ممتاز حیثیت و اہمیت کے حامل ہیں۔ انھیں کالم نگاری کی جو روایات ملی تھیں، ان میں زیادہ تر سیاسی مسائل، واقعات یا شخصیات کی ناہمواریوں سے مزاحیہ نکتے اخذ کرنا تھا، لیکن انھوں نے کالم نگاری کے میدان کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ اب زندگی کے عام معاشرتی اور تہذیبی مسائل بھی خاطر خواہ جگہ پا رہے ہیں۔ کالم نگاروں کے موضوعات میں اتنی وسعت آگئی ہے کہ وہ اب سیاسی مسائل کو تمام تر اہمیت دینے کے بجائے انھیں وسیع تر معاشرتی اور تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھنے لگے ہیں۔ چنانچہ ان کے زیر اثر ان کے دیگر معاصر کالم نگاروں اور نو وارد کالم نگاروں کا زاویہ نگاہ ہی بڑی حد تک مختلف ہو گیا ہے۔ طنز و مزاح کے اسلوب اور انداز میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور نئی نئی علامتیں اور استعارے اختیار کیے جانے لگے ہیں۔ کالموں کے عنوانات میں بھی اب دلکشی اور جاذبیت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس عرصہ میں جن نئے کالم نگاروں نے اپنی تحریروں سے شگفتہ اور متنوع طنز اور مزاح کی اچھی مثالیں پیش کیں، ان میں رفیق ڈوگر، مشفق خواجہ، عطاالحق قاسمی کے نام اہمیت کے حامل ہوئے۔ ان کالم

نگاروں نے اپنے اسلوب نگارش کے توسط سے اس عرصہ میں بہت تازگی اور تنوع کا ثبوت دیا ہے۔

رفیق ڈوگر کی تحریروں کے ان عرصہ میں دو مجموعے شائع ہوئے۔ "دید شنید" ان کے ان کالموں کا ایک انتخاب ہے جو انھوں نے مختلف جریدوں میں لکھے۔ مزاحیہ کالم نگاری میں جو چند نام ان دس برسوں میں دنیائے صحافت اور ادب میں ابھرے اور اپنی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کے سبب نامور ہوئے ان میں ان کا نام بہت ممتاز اور مقبول ہوا۔ ان کے موضوعات زیادہ تر سیاسی ہیں اور ان کے مزاح میں طنز کا عنصر زیادہ حاوی نظر آتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ صحافتی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ایسا ہو--- لیکن ان میں تخلیقی عنصر کی کہیں کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے کالموں کی انفرادیت مشاہدے کی بے پناہ تازگی ہے۔ ان کا اسلوب بہت تازہ ہے اور ان کے جملے بہت تیکھے اور چست ہیں۔ "دید شنید" کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ "چالیس چہرے" بھی ان کے مخصوص اسلوب نگارش کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ شخصی خاکے سیاستدانوں کے ہیں جو دلچسپ اور شگفتہ انداز سے لکھے گئے ہیں۔ ان خاکوں میں رفیق ڈوگر کا قلم بہت تیکھا اور کاری ہے۔ ان کے الفاظ بہت جچے تلے اور جملے بہت بھاری ہیں۔

مشفق خواجہ نے "غریب شہر" کے فرضی نام سے اخبار "جسارت" میں "اندیشہ شہر" کے عنوان کے تحت کالم تحریر کیے۔ یہ کالم طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری میں بہت دلچسپ، شگفتہ اور پرکیف ثابت ہوئے۔ اب جبکہ یہ سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، اس کالم کی شگفتگی، طنز کی گہرائی اور اسلوب کی تازگی ایک یادگار بن گئی ہے۔ ایک عرصے تک یہ کالم پاکستان صحافت میں دھوم مچاتا رہا ہے۔ خوش دلی کا اس کا آراستہ اور دل نشیں اسلوب ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کر

دیتا تھا اور اسی سے یہ کالم پہچانا بھی جاتا تھا۔ نکتہ آفرینی، بذلہ سنجی، اختصار اور برجستگی اس کالم کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ چنانچہ قاری اس سے تادیر لطیف اٹھاتے تھے۔ گو اس میں طنز اور مزاح کی ایک متناسب آمیزش رہتی تھی لیکن بسا اوقات اس میں مزاح کا عنصر غالب رہتا۔ موضوعات زیادہ تر روزمرہ کے سیاسی واقعات اور احوال ہوتے، لیکن ان کی کوئی قید بھی نہیں تھی۔ ادبی اور علمی مسائل، واقعات اور شخصیات بھی طنز و مزاح کا نشانہ بنتے تھے۔ چنانچہ اس لحاظ سے اس سلسلہ کے بعض کالم اپنی ایک مستقل اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے مزاحیہ کالم نویسی کو بلاشبہ ایک نئی زندگی اور توانائی بخشی۔ انھوں نے مزاح کے روایتی اسلوب اور اس کے لوازمات کو اختیار نہیں کیا اور نہ محض مضحک واقعات اور کردار تلاش کیے ہیں، بلکہ عام واقعات اور کرداروں میں مزاح تلاش کیا ہے۔ برجستہ جملے اور ذو معنی الفاظ کا نہایت موثر استعمال ان کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔

عطاالحق قاسمی کے کالم اخبار "نوائے وقت" میں "روزن دیوار سے" کے عنوان کے تحت چند سالوں سے شائع ہو رہے ہیں۔ اور اسی نام سے ان کالموں کا ایک انتخاب بھی شائع ہوا ہے۔ جو مزاح نگار اس عرصہ میں اپنی کالم نگاری کے توسط سے پہچانے جاتے ہیں، ان میں عطاالحق قاسمی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں یہ اہمیت ان کے موضوعات اور ان کے اسلوب دونوں کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ موضوعات کا تعلق ہماری تہذیبی اور ادبی زندگی سے زیادہ ہے اور کہیں کہیں سیاست بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اسلوب کی حد تک انھیں جو خصوصیت حاصل ہوئی، اس میں ان کے تیکھے اور مؤثر جملوں کا عمل دخل زیادہ ہے، جو دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور بامعنی اور گہرے بھی۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہے اور اسی وجہ سے ان کے کالم بھی موضوعات کے

لحاظ سے متنوع ہوتے ہیں۔

اس عرصہ میں فکاہی کالم نگاری میں کچھ اور نئے اور پرانے نام جو اپنی خصوصیات کے سبب نمایاں رہے' ان میں ظفر اقبال' خافی خاں (پروفیسر محمد اقبال؟) کو ان کے دلچسپ اور منفرد اسلوب کے سبب اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کالم نگار "زندگی" (ہفت روزہ) اور دوسرے جرائد میں گاہے گاہے کالم لکھتے رہے ہیں۔ لالہ صحرائی نے بھی اس عرصہ میں کئی اچھے کالم مختلف جرائد میں تحریر کیے۔ یہ سب کالم نگار زندگی اور معاشرے کے متنوع اور متعدد مسائل اور موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کالم نگاروں نے کچھ زیادہ' اچھی اور قابل توجہ تحریریں بھی طنز و مزاح کے ادب کو دی ہیں۔

شاعری

شاعری میں طنز و مزاح کے تعلق سے یہ دس سال کسی تازہ روایت کے حامل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اس میں تنوع اور دلچسپی ضرور برقرار رہی۔ اور اس کے منظر پر بالعموم نامور مزاح نگار شعرا ہی چھائے رہے۔ ضمیر جعفری' سید محمد جعفری اور دلاور فگار کی حیثیت تو پہلے ہی سے مستحکم تھی' اس عرصہ میں بھی یہ ممتاز اور نمایاں رہے۔ لیکن اس دہائی کے نصف میں سید محمد جعفری کی رحلت طنز و مزاح کی شاعری کے لیے المیہ ثابت ہوئی۔ معاشرتی کمزوریوں کو شگفتہ انداز میں نظم کے پیرایہ میں بیان کرنے میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ وہ اجتماعی زندگی کی کمزوریوں اور سیاسی حالات کے اضطراب اور ناہمواریوں پر بڑے شوخ انداز میں ہنستے اور ہنساتے رہے ہیں۔ گو معاشرے کے دوسرے مسائل سے وہ بے نیاز کبھی نہ رہے لیکن سیاسی بے اعتدالیاں ان کا خاص موضوع رہیں۔ ان کے طنز کا انداز بہت شائستہ اور ان کا مزاح بہت پرکیف ہوتا

تھا۔ اسلوب میں شوخی اور زندہ دلی کا عنصر بالعموم غالب رہا۔ غالب اور اقبال کے اشعار کی تضمین اور انھیں نئے معنی دینے میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی اور مہارت کا ثبوت دیا ہے' اس عرصہ میں اپنے انتقال تک انھوں نے متعدد دلچسپ نظمیں لکھیں' لیکن ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

سید ضمیر جعفری نے طنز و مزاح میں نظم اور نثر پر یکساں قدرت کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ اس دہائی کے اوائل میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ کلام کا مجموعہ "مافی الضمیر" شائع ہوا اور پھر انگریزی ادب کی منتخب مزاحیہ نظموں کے ان کے منظوم تراجم کا مجموعہ "ولایتی زعفران" بھی شائع ہوا۔ بلاشبہ انھوں نے اس عرصہ میں کامیاب مزاح نگاری کی اپنی قائم کی ہوئی روایتوں کو بخوبی برقرار رکھا۔ انھوں نے سماجی ناہمواریوں اور انسانی حماقتوں کو اپنی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے موضوعات متنوع اور دلچسپ ہیں۔ اور ان کا اسلوب برجستگی کا حامل ہے۔ اس اسلوب کے تحت وہ نئے مضحک الفاظ اختراع کر کے مزاح کی صوتی کیفیت تشکیل دیتے ہیں اور یہ انداز ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ان کے ساتھ ساتھ دلاور فگار کے موضوعات مقابلتاً" زیادہ متنوع اور ہمہ جہتی ہیں۔ یہ کسی خیالی دنیا یا فرضی ماحول سے ماخوذ نہیں بلکہ وہ معاشرتی حقائق' حادثات اور نشیب و فراز کی متعدد صورتیں ہیں جنھیں مخصوص طنزیہ و مزاحیہ پیرایہ میں نظم کیا گیا ہے۔ "انگلیاں فگار اپنی" اس دہائی کے اوائل میں اور "مطلع عرض ہے" اس دہائی کے آخر میں شائع ہونے والے ان کے شعری مجموعے ہیں۔ زندگی کے عام اور روزمرہ کے مسائل ان کے موضوعات میں بہت زیادہ دخیل رہے ہیں' ان کے علاوہ قومی اور سیاسی سطح پر بھی ان کے احساس کو مضطرب دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک عام قاری کو ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے ان کے مخصوص ماحول اور اس کے مسائل سے اچھی طرح

واقفیت ہو جاتی ہے۔ طنز و مزاح کا ان کا اپنا مخصوص اسلوب ہے' ان کے الفاظ بھی ایک حد تک ان کے اپنے ہیں' جنھیں وہ مختلف معنی دیتے رہتے ہیں۔ یہی تنوع اور ہمہ جہتی مسٹر دہلوی کے کلام کا بھی خاصہ ہے۔ "عطر فتنہ" ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک امتیازی وصف اس کا اخلاقی پہلو بھی ہے۔ مسٹر دہلوی کو معاشرے کی اخلاقی اقدار کی زبوں حالی اور ان کے ادبار کا بڑا قلق ہے' چنانچہ ان کے طنز کا ایک حاوی پہلو اخلاقی موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے آج کے دور میں انھوں نے مزاح میں نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ اس سے قطع نظر بھی ان کے کلام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک بھر پور معاشرے میں ہو سکتا ہے۔ ان کا اسلوب بہت دھیما اور محض زیر لب مسکراہٹ کا متقاضی ہے۔ یہی اسلوب انعام احسن حریف کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کی منظومات کا ایک مجموعہ "چشم دید" اس دہائی کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ ان کے کلام میں طنز کا پہلو قدرے معدوم ہے اور جو نظر آتا ہے وہ معاشرتی اور سیاسی دونوں موضوعات پر مشتمل ہے۔ مزاح میں شائستگی کا عنصر غالب ہے۔ لہجہ بہت دھیما اور بعض مقامات پر بوجھل بھی ہو گیا ہے۔

دیگر مزاح نگار شاعروں میں نذیر احمد شیخ کا نام بھی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن انھوں نے اس عرصہ میں کوئی مستقل چیز طنز و مزاح کے ادب کو نہیں دی' پھر اس دہائی میں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ بعض اور شاعروں نے وقتاً فوقتاً طنزیہ و مزاحیہ نظمیں تحریر کیں لیکن بہت نمایاں نام اور ان کے شہ کار سامنے نہیں آئے۔ رئیس امروہوی اور ابن معصوم صحافت کے توسط سے طنز و مزاح تخلیق کرتے رہے ہیں۔ رئیس امروہوی کی منظومات اور ان کے قطعات معاشرتی اور سیاسی مسائل اور واقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ابن معصوم بھی معاشرتی' مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ سیاسی واقعات کے نشیب و فراز پر طنزیہ

اور مزاحیہ نظمیں لکھنے کی روایت بھی اس عرصہ میں دیکھنے میں آئی ہے، لیکن ظاہر ہے یہ اس موضوع پر اردو میں قائم قدیم روایات کا عشر عشیر بھی نہیں۔ بعض اخبارات اور جرائد میں گاہے گاہے مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن کوئی بہت مستحکم اور نمایاں روایت نظر نہیں آئی۔

فروغ بادہ اقبال ---- ماہر القادری

ماہر القادری ہماری شاعری کے ایک ایسے عہد میں پروان چڑھے ہیں جسے ہم رجحانات، موضوعات اور اسالیب کے لحاظ سے قدیم اور جدید کی دو مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ شاعری کے قدیم اسالیب اور عناصر اپنی توانائیوں اور کمزوریوں کے باوجود اپنے سفر کے ارتقائی مراحل میں تھے اور حسرت، یگانہ، جگر اور فانی جیسے متعدد شاعر اسے میسر تھے، اور اقبال جوش اور فراق، حفیظ وغیرہ جدید شعری میلانات کے ساتھ قدیم و جدید کی فطری آمیزش اور شاعری کے صحت مند اسالیب کے ساتھ جدید اردو شاعری کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے۔ ماہر القادری اس وقت ان شاعروں میں تھے، جنھوں نے اپنی شاعری کا آغاز قدیم رنگ تغزل کے ساتھ کیا۔ نہایت پر اثر اور یادگار رومانی نظمیں تخلیق کیں اور اولاً" شہرت انہی کی بنیاد پر پائی۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی ادبی و سماجی تحریکات کے زیر اثر اپنی شاعری کو مستقلاً" الگ نہ رکھ سکے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں، جہاں ایک طرف کلاسیکی اردو شاعری کے مکمل اور حسین نمونے موجود ہیں اور انھوں نے قدیم استعاروں اور قدیم مضامین کو انوکھے اور پرکشش انداز میں پیش کیا ہے، وہیں

بالخصوص ان کی منظومات فکر و حکمت، علم و دانش، قومی و ملی حمیت اور جوش و جذبہ سے بھی آراستہ ہیں۔ اپنے موضوعات سخن اور اسلوب کے لحاظ سے ان کا نظریہ شاعری یوں اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "شاعری قلب میں تسکین اور روح میں انقلاب پیدا کر سکے۔" چنانچہ ان کی شاعری اسی نظریہ اور مقصد کی تابع نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ ان شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے اقبال کے اثرات کو واضح طور پر قبول کیا ہے اور ان اثرات کو اپنی شاعری کے موضوعات اور لہجہ اور مقصد سے بھی ظاہر کیا ہے۔ شاعری میں انھوں نے کسی سے تلمذ اختیار نہیں کیا۔ لیکن وہ معنوی طور پر اقبال ہی کو اپنا استاد سخن سمجھتے تھے اور اقبال کی شاعری اور شخصیت سے اپنے آغاز شعور ہی سے متاثر تھے۔ گو انھیں اقبال سے بلواسطہ استفادہ کے مواقع نہیں ملے۔ ان سے صرف اپنی ایک سرسری ملاقات کا تاثر بڑی والہانہ عقیدت اور نیاز مندی سے بیان کیا ہے جو ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ دہلی میں ہوئی تھی۔ لیکن اس ملاقات سے قطع نظر اور بہت پہلے جب اقبال کی غزل "کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں" ان کی نظر سے گزری تو بقول خود انھوں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ فکر و سخن کی نئی دنیا میں آگئے ہیں۔ انھیں "اقبال کا یہ آہنگ دوسرے شعرا کی صداؤں سے ممتاز اور ان کی لے دوسروں کی لے سے نرالی محسوس ہوئی۔" اس کے بعد وہ اقبال کے کلام کے شیدائی بن گئے اور ان کا کلام شوق و عقیدت سے پڑھتے۔ انھوں نے چاہا بھی کہ اقبال سے باقاعدہ تلمذ حاصل کریں، لیکن اقبال نے ان کے لیے کسی استاد کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ امر مولانا ماہر کے لیے مایوسی کا باعث نہ بنا کیونکہ ان کے خیال میں "عقیدت و محبت کی دنیا میں بعد انھیں مکانی نا معتبر تھا کہ اصل اعتبار تو قرب روحانی کا ہے اور وہ انھیں ہمیشہ حاصل رہا۔"

اقبال سے ان کی محض ایک ملاقات ہوئی جو پہلی اور آخری ملاقات

تھی۔ اس کے بعد کتنے ہی بڑے آدمیوں سے یہاں تک کہ حکمرانوں سے بھی وہ ملے، لیکن اقبال کے ساتھ جو چند لمحے گزرے، مولانا ماہر کے الفاظ میں "ان کے نقش کسی ملاقات میں دب نہیں سکے"۔ یہ احساس اور یہ تاثر مولانا ماہر کی شخصیت اور شاعری میں ہمیشہ جاگزیں رہا۔ چونکہ آغاز شعور ہی سے وہ اقبال کے عقیدت مند اور اقبال کی شاعری سے متاثر رہے اس لیے ان کی اس عقیدت اور ان کے اس تاثر نے ان کی شاعری اور ان کے لب و لہجہ پر ہمیشہ اپنے اثرات قائم رکھے۔ بہت بعد کی ان کی ایک نظم اقبال سے ان کی عقیدت اور ان کے جذبہ احترام کو ظاہر کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال ان کے لیے کیا معنی رکھتے تھے:

کارواں خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے
ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے
محفل رومی و عطار تھی مدت سے خموش
تیرے نغموں نے بنایا اسے ہنگامہ جوش
علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ
کس نزاکت سے ہم آغوش کیے شیشہ و سنگ
فکر افسردہ کو پرواز عطا کی تو نے
لب خاموش کو آواز عطا کی تو نے

اپنی ایک اور نظم میں بھی انھوں نے اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا تھا:

قرآن ترا ایماں، قرآن تری دنیا
تو شعر نہیں کہتا، الہام سناتا ہے
جس نقش کو مغرب کے ہاتھوں نے ابھارا تھا

اس نقش کو مشرق کی ٹھوکر سے مٹاتا ہے
جس لے نے کیا زندہ عطار کو رومی کو
اقبال اسی مے کے پیمانے پلاتا ہے

یا پھر ان کا یہ شعر اقبال سے ان کی نسبت کو ایک اور صورت میں پیش کرتا ہے:

بسوز رومی و اقبال و خسرو
ملا ہے مجھ کو جذب عارفانہ

اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید اور وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں موجودہ صدی میں ان کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب کا جائزہ لیا تھا اور ان کی تشخیص کے بعد انھوں نے اسلام کے تصور حیات اور اس کی بنیادی اقدار کو ان کی اصل شکل میں پیش کیا۔ اسلام کی جو تشریح و توضیح اقبال نے کی ہے اس کی امتیازی خصوصیت اس کا حرکی اور انقلابی پہلو ہے۔ اپنے مقصد کے تحت انھوں نے ایک تو اسلامی فکر کی تشکیل جدید کی، مغربی افکار اور ان کے زیر اثر رونما ہونے والی مختلف تحریکوں پر سخت تنقید کی اور قوم کو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اسلام کی تعلیمات کو اختیار کرنے کی تلقین کی اور ان کے جذبہ عمل کو بیدار کیا۔ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں عشق رسول، جذبہ عمل اور رد تہذیب مغرب و فکر فرنگ کو دوسرے تمام موضوعات میں اس طور پر الگ کیا جا سکتا ہے کہ ان موضوعات پر لکھی گئی ان کی نظمیں ان کے بے پناہ جذبہ عقیدت و خلوص کی مظہر ہیں۔ عشق رسول اقبال کی حد درجہ عقیدت و وارفتگی کا اظہار ہے، اور عمل انکا اصل مطمح نظر ہے جو مسلمانوں میں وہ عام دیکھنا چاہتے تھے۔ عشق رسول مولانا ماہر کی شاعری کا بھی بنیادی بلکہ اصل وصف

ہے۔ مولانا ماہر نے کسی موضوع اور جذبہ کو اتنے تواتر اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ نہیں بنایا جتنا کہ عشق رسالت ان کی شاعری میں سرتا سر موجزن نظر آتا ہے۔ بلکہ یہی عشق مولانا ماہر کے نزدیک مرد مومن کے لیے ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی:

مرد مومن را محمد ابتدا است
مرد مومن را محمد انتہا است

جذبہ عمل کا اظہار بھی مولانا ماہر کی شاعری کا ایک نمایاں موضوع ہے۔ اس جذبہ کے اظہار میں ان کا تخاطب راست انسان سے اور مسلمانوں سے رہا ہے:

توحید کا اقرار زباں سے یہ کہاں تک
دے اپنے عمل سے بھی تو اے دوست گواہی
تجھے تو خاک ذروں سے کام لینا ہے
فلک کے چاند ستاروں کو دیکھتا کیا ہے
خدا جمود کی ہرگز مدد نہیں کرتا
ترے لبوں پہ یہ ہنگامہ دعا کیا ہے

عمل، اقبال کی پیروی میں، مولانا ماہر کے نزدیک اس کائنات کی اصل و بنیاد اور مظہر تخلیق ہے:

یہ حادثات کی دنیا یہ کار زار حیات
عمل کے جذبہ سرگرم کے سوا کیا ہے
تدبیر کے دامن میں ہے تقدیر کا مقصود
کرتا ہے عمل دہر میں ناپید کو موجود

رد تہذیب مغرب بھی اقبال کی شاعری کا ایک اہم موضوع تھا۔

اقبال نے تہذیب مغرب کو ہر مقام پر رد کیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے۔ مولانا ماہر نے بھی تہذیب مغرب کو ہر جگہ اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے معائب پر نظر ڈالی ہے:

ہو روس کی تہذیب کہ لندن کا تمدن
یہ فتنہ نمرود ہے وہ مکر عزازیل
مٹا ہوا ہے تو عقل فرنگ و یوناں پر
ہماری آنکھ کا سرمہ ہے خاک راہ حجاز
دیکھ پھر دنیا نے کروٹ لے کے اک انگڑائی لی
ہوشیار اے نخوت تہذیب حاضر' ہوشیار
خون انساں سے تری تاریخ لکھی جائے گی
ہر کھنڈر مغرب کا ہے تیرے جنوں کی یادگار

تہذیب مغرب کے علاوہ مولانا ماہر نے مغربی استعمار اور مغرب کے سیاسی و معاشی نظام کی بھی مذمت کی ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو اقبال کی شاعری میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ بلکہ اقبال کی فکر اور شاعری کا ایک بڑا حصہ مغربی استعمار کے خلاف آزادی کی خواہش اور حمایت اور مغرب کے فکری' سیاسی اور معاشی نظام پر کڑی تنقید سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا ماہر کی شاعری میں ان موضوعات کی کمی نہیں۔ آزادی اور غلامی کا فرق ان کی نظر میں بہت واضح تھا:

محکوم کا انداز تبسم بھی ہے ماتم
آزاد کے آنسو میں جھلکتی ہوئی عشرت
محکوم کو ہے صلح و خوشامد سے سروکار
آزاد کو ہر جور سے ٹکرانے کی عادت

محکوم کو محرومی تقدیر کا شکوہ
آزاد کی کوشش سے بدل جاتی ہے قسمت
مجھے زندگی کی خاطر نہیں ذلتیں گوارا
مجھے راحتیں مصیبت' مجھے موت ہے غلامی

اور چونکہ جمہوریت ان کی نظر میں تہذیب نو کی دین ہے اس لیے بھی انھیں یہ گوارا نہیں:

تہذیب نو کا یہ بھی ہے اک خوشنما فریب
جمہوریت کی آگ سے دامن ذرا بچا

اقبال نے اشتراکیت پر بھی سخت تنقید کی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کے نظریہ اور اس کے نظام کو اپنی شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے کلام اور ان کے بیانات میں اشتراکیت کی تنقید اور مذمت پر ان کے خیالات بہت مستحکم اور مستقل ہیں۔ مولانا ماہر بھی اشتراکیت کے نقاد رہے اور ان کے کلام میں اشتراکیت کے بارے میں ان کے تنقیدی خیالات موجود ہیں۔ اپنے ان خیالات کے لحاظ سے بھی وہ اقبال کے بہت قریب ہیں:

بے یقین و بے ضمیر و کم نگاہ
منکر اخلاق و آیات الہ
عصمت کردار در راہش غبار
مذہب او را شکم پروردگار
در مساوات جہاں مصروف کار
زاں مساواتے کہ فطرت شرمسار

اقبال کا ایک اہم کام یہ تھا کہ انھوں نے اسلامی قومیت کے حقیقی تصور کو اجاگر کیا تھا اور وہ برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں پہلے مفکر تھے

جنھوں نے اسلام کے حقیقی تصور قومیت کو پیش کیا اور دنیائے اسلام کو ناقابل تقسیم قرار دیا۔ اور اسی لحاظ سے انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا تھا کہ وہ خود کو ترکوں، عربوں، ایرانیوں اور افغانیوں میں تقسیم نہ کریں۔ مولانا ماہر کی شاعری میں بھی اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ ان کا برملا اظہار یہ تھا کہ:

ہندی ہے میرا جام
حجازی ہے اس کے مے

اور پھر وہ اقبال کی پیروی میں کہتے ہیں:

توحید کا پیغام نہ ہندی نہ عراقی
اسلام کے نقشہ میں نہ قندھار نہ جمرود
آزاد بھی ہو جائے تو آزاد نہ ہوگا
ہے خاک وطن جس کی تمناؤں کا معبود

یا:

رشتہ ملت ہے اے جان عزیز
خون کے رشتہ سے بڑھ کر استوار

اقبال نے دین اور سیاست کے ناقابل تقسیم رشتہ پر بھی متعدد مرتبہ اظہار خیال ہے۔ ان کی نظر میں اگر سیاست سے دین کو جدا کر دیا جائے تو صرف چنگیزی رہ جاتی ہے۔ مولانا ماہر بھی اس قسم کے نظام کو مسلمانوں کے لیے ناموافق قرار دیتے ہیں:

دین سے جس سلطنت کا ہو نہ ربط
ہے وہ مومن کے لیے ناسازگار

اقبال کا نظام فکر و فلسفہ، جسے خودی کا عنوان دیا گیا ہے، موجودہ صدی میں دنیائے اسلام کا ایک نمائندہ نظام فکر ہے، جو دور حاضر کے اسلامی

فلسفہ اور فکر و دانش میں مستقلاً" زیر بحث رہتا ہے۔ اسی لحاظ سے اقبال کی استعمال کردہ یہ اصطلاح بھی اب بہت مروج ہو گئی ہے۔ غالباً اردو شاعری میں اقبال کے بعد اس اصطلاح کو جس کثرت سے مولانا ماہر نے استعمال کیا ہے کسی اور شاعر کے کلام میں اس کا استعمال اس تواتر کے ساتھ نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ فلسفہ خود مولانا ماہر کے خیالات میں ایک ذاتی اصطلاح کے طور پر رائج ہو گیا ہے اور اسے خود مولانا ماہر نے بھی اپنے فکر و خیال کے ایک عنوان کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً ان کی نظموں کے عنوانات ہیں "احترام خودی"، "پیام خودی" وغیرہ۔ اور ان کے وسطی دور کے کلام میں متعدد اشعار، جن میں جابجا خودی کا لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

خودی کی موت ہے بندوں کے سامنے جھکنا
ملیں جو قیصر و کسریٰ بھی تو سلام نہ کر

سنو سنو کہ خودی کی بلند چوٹی سے
سنا رہا ہے کوئی نغمہ مبارکباد

جس قوم کی خودی کے شرارے ہوئے ہیں سرد
چھینی گئی ہے اس سے حکومت کی باگ ڈور

اس کے علاوہ مومن اور مرد مومن جیسے الفاظ بھی مولانا ماہر کے کلام میں اقبال کی استعمال کردہ معروف اصطلاحوں کی پیروی میں استعمال ہوتے نظر آتے ہیں۔ صرف ان اصطلاحات کا استعمال ہی نہیں، مولانا ماہر نے اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر اور متعدد صورتوں میں اقبال کے چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ وہ اقبال کے خیالات اور اسلوب سے اتنے متاثر رہے کہ کئی مصرعے اور تراکیب محض معمولی ردو بدل سے ان کے کلام کا حصہ بن گئے ہیں اور متعدد خیالات اور موضوعات ان کی شاعری میں اس طرح آئے ہیں کہ ان پر

اقبال کے سایہ فگن ہونے کا احساس قوی ہوتا ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے مولانا ماہر کی شاعری اقبال کی شاعری کا ایک پرتو ہے اور "فروغ بادہ" بھی۔ خود مولانا ماہر نے اقرار کیا ہے کہ:

بہ فیض حضرت رومی سفال ماہر میں
فروغ بادہ اقبال کے سوا کیا ہے

شوقی کا آئینہ اعتبار

اردو شاعری میں رباعیات کا متعدبہ ذخیرہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں درد، سودا، میر، غالب، انیس، دبیر، حالی، اکبر، داغ، رواں، محروم اور امجد حیدر آبادی، جوش، اثر لکھنوی، فراق، عدم وغیرہ ایسے شعراء ہیں جو اردو رباعی کی تاریخ میں مجموعی طور پر نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ ویسے فنی صعوبتوں کے پیش نظر، دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں، رباعی پر کم شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ رباعی کہنے کے لیے اس کے فنی لوازمات کا جاننا اور فن عروض سے کما حقہ، واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ اور جو شعراء محض موزونیت طبع پر صاد کرتے ہیں، ان کا رباعی سے گریز یقینی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے شعرائے رباعی کی طرف کم راغب نظر آتے ہیں۔

رباعی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا غزل کی طرح ایک مخصوص مزاج ہے۔ اسی لیے اس کے خالق کا بھی ایک خاص مزاج کا حامل ہونا فطری ہے۔ اردو رباعی کی تاریخ میں بہت کم شعراء ہیں جنھوں نے محض رباعی کو اپنے لیے بطور ذریعہ اظہار منتخب کیا ہے۔ سطور بالا میں جن رباعی گو شعراء کے نام آئے ہیں ان میں سے ہر ایک پر محض رباعی گو ہونے کا حکم نہیں لگایا جا

سکتا، صرف رواں اور امجد ہی دو نام ایسے ہیں جو محض رباعی کی بنیاد پر شہرت و اہمیت رکھتے ہیں۔ شاید آج کے شعراء میں تو اقبال شوقی کے علاوہ کوئی ایسا نام نہیں جس نے صرف اس صنف کو خصوصیت کے ساتھ اپنے اظہار و بیان کے لیے منتخب کیا ہو۔ ان کی اب تک کی طبع آزمائی کا نتیجہ دو مجموعہ رباعیات "صحیفہ دل" اور "آئینہ اعتبار" کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ زیر نظر سطور میں شوقی کے نئے مجموعے "آئینہ اعتبار" کی روشنی میں ان کے مشاہدہ انفس و آفاق کا ایک سرسری جائزہ مقصود ہے۔

اردو رباعی کی تاریخ میں موضوعات کی بو قلمونی، ہمہ گیری، تنوع اور نیرنگی کے اعتبار سے جو انفرادیت جوش اور فراق کو حاصل ہے، وہ کسی اور رباعی گو کو نہ مل سکی۔ لیکن اگر "آئینہ اعتبار" پر نظر ڈالی جائے تو اس میں شوقی کے تاثرات، جذبات اور کیفیات کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔ حمد و ثنا، نعت و منقبت، غیب و شہود، تغزل و تصوف، تموج و تعشق، حکمت و معرفت، فنا و بقاء، طلب و تمنا، سکوت و صدا، فکر و فیض، ہاؤ ہو، سیری و تشنگی، حیرت و درماندگی، رنگ و بو سب ہی کچھ ہے۔ لیکن ان تمام متنوع موضوعات میں جو خصوصیت نمایاں اظہار کرتی ہے وہ شاعر کا مشاہدہ انفس و آفاق ہے۔ اس مشاہدے کے تحت شاعر جن داخلی اور خارجی واردات اور حادثات سے گزرتا ہے اور اس طرح اس کے قلب و ذہن پر جو ارتسامات مرتب ہوتے ہیں ان کو وہ آفاقی اور انفسی فطرت کی نوعیت سے دیکھتا ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کے پیش نظر کائنات و مافیہ کے دونوں رخ ہوتے ہیں۔ خارجی یا معروضی اور داخلی یا موضوعی۔ آفاق اور انفس قرآن حکیم کی اصطلاحات ہیں۔ وہ ان دونوں کو علم کا موضوع قرار دیتا ہے۔ اس تعلق سے اس کا ارشاد ہے کہ آیات الہیہ (نشانیوں) کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے

ہو یا باطن کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ (سنریھم آیتنا فی الافاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انه الحق)

مشاہدے کے نقطہ ہائے نظر دو ہوتے ہیں۔ معروضی (Objective) اور موضوعی (Subjective) ۔ مدرکات و محسوسات کو معروضی نقطہ نظر میں خارج سے لیکن موضوعی نقطہ نظر میں بذریعہ باطن دیکھا جاتا ہے۔ اس میں اشیاء کا مشاہدہ بلا تجزیہ و تقسیم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں تجزیہ و تقسیم کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مشاہدہ موضوعی میں کسی شے کی حقیقت وہ ہوتی ہے جو ہمارے باطنی شعور کے ذریعہ متعین ہو۔ کائنات کا معروضی رخ مرئی ہے اور زمان و مکان کے نظاروں کی جلوہ گاہ۔ اس کے برعکس موضوعی رخ باطنی ہے۔ جس کی اکمل و احسن صورت نفس انسانی ہے۔ آفاقی اور انفسی مشاہدے کا مقصد معرفت و حقیقت ہے۔

کائنات کا معروضی پہلو آفاق، جسے ہم مادی قرار دیتے ہیں، بذات خود مادہ نہیں، بلکہ جزیوں کا ایک نظام ہے وہ جزیے اپنی ماہیت کے اعتبار سے حسوں سے مماثل ہیں اور فی الواقع، اکثر اوقات، سچ مچ کی حسیں اپنے زمرے میں شامل رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ مواد، جس سے طبعی اشیاء بنتی ہیں، اس مواد سے اپنا رشتہ استوار کر لیتا ہے جس سے کم از کم ایک حد تک، ہماری نفسی زندگی بنتی ہے۔ فرد کا شعور پہلے کائنات کے خارج کی طرف، جو بہ آسانی قابل ادراک ہے، راغب ہوتا ہے۔ اس کے شعور میں کوئی حس یا شے جاگزیں ہوتی ہے، اس کے تہیج پیدا کرنے سے وہ اس کی جانب متوجہ ہوتا ہے پھر اپنے تاثر یا نفسی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس مشاہدہ باطن (introspection) ایک خاص ذہنی عمل ہے جو ارتقائے شعور کا ایک انتہائی مرحلہ ہے۔ اس لحاظ سے ایک شاعر کا ذہنی اور مشاہداتی سفر خارج سے

باطن یا معروض سے موضوع کی طرف ہوتا ہے، جو اصل حقیقت ہے۔ اگر اس کے اس انداز کے مشاہدے کا جائزہ لیا جائے تو اس میں مدرکات و محسوسات کے لاتعداد پہلو نظر آئیں گے۔ مثلاً یہ چند رباعیاں دیکھئیے:

تنویر سحر ہے غنچہ رنگ شہود
ہے جلوہ گل ساز ہم آہنگ شہود
معمورہ زندگی ہے منشور نما
آفاق ہے شیرازہ ارژنگ شہود

پابند زماں اور نہ محصور جہات
ادراک کی دسترس سے باہر ہے یہ بات
ہر چند مجرد ہی سہی ذات مگر
عالم ہے تمام جلوہ حسن صفات

خلوت سے ہوا عالم جلوت پیدا
جلوت نے کیا طلسم حیرت پیدا
وحدت سے منور ہے شبستان وجود
آئینے کیا کرتے ہیں کثرت پیدا

ایک فلسفی کی بہ نسبت شاعر کے ہاں حقائق، جذبات کے سوز و گداز میں سموئے جاتے ہیں۔ فلسفہ دماغ سے تعلق رکھتا ہے اور شعر دل سے۔ شاعر ہر عقلی نتیجے کو تاثر کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اور جس عقلی نتیجے سے وہ متاثر نہ ہو، اس کی حقیقت پر ہی اس کے علت و معلول، اثر و سبب کی کڑیاں اس کے

ادراک میں آ سکتی ہیں۔ اسی ادراک کی بدولت وہ فطرت کی تسخیر کر کے اسے انسانی مقاصد کے حصول میں استعمال کرتی ہے۔ لیکن حیات و کائنات اور اسرار وجود کی کوئی انتہا نہیں۔ عالم مظاہر صفات کا کچھ حصہ ' جو انسانی زندگی سے بالواسطہ یا بلا واسطہ ہو سکتا ہے ' انسان کے ادراک میں آ سکتا ہے۔ لیکن حقیقت کلی حواس ' عقل اور تصور سب سے ماوراء ہے۔ مذکورہ بالا رباعیات انسانی ذہن کے اسی تاثر کا اظہار کرتی ہیں جب وہ قابل ادراک اشیاء پر اپنی رائے دیتا ہے۔ مسلمانوں کی صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری میں اور خدا کی حمد میں جابجا اس عجز کا اعتراف کیا گیا ہے۔ دیگر اکابر شعراء کی طرح شوقی کے کلام میں بھی اکثر مقامات پر ملتا ہے کہ اسرار حیات کا انکشاف پوری طرح کسی پر نہیں ہو سکتا۔ اس قدر ظہور کے باوجود حقیقت مستور ہے۔ فلسفے میں یہی نظریہ لادرنیت (Agnosticism) ہے کہ کائنات میں موجود حقیقت کا کلی ادراک ممکن نہیں۔ جیسا کہ غالب کا شعر ہے:

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

شوقی کی چند رباعیاں اس مضمون کی دیکھیے:

تاروں کی چمک' پھول کی بو' جیٹھ کی دھوپ
ہر رنگ نرالا ہے ہر اک روپ انوپ
ہر شے میں چھپا ہر ایک شے سے ظاہر
اک جلوہ کہ جس کا نہ کوئی رنگ نہ روپ

میں ہی نہیں جادہ وفا میں تنہا

تو بھی ہے مقام منتہا میں تنہا
میں تو تیری جستجو میں ہوں سرگرداں
تو کیوں ہے ورا و ماورا میں تنہا

انگشت بدنداں ہے ہر اک عاقل بھی
مضطر ہے ہر ایک عارف کامل بھی
غایت بھی ہے ایک مسئلہ غور طلب
ہے حشر طلب حیات کا حاصل بھی

ہر راز کے بعد دوسرا پاتے ہیں
رازوں کا بھی ایک سلسلہ پاتے ہیں
پایا جو تجھے تو خود کو کھو بیٹھے ہم
ہر گام پہ مرحلہ نیا پاتے ہیں

شوقی کے کلام میں جا بجا ان کا نظریہ حیات ملتا ہے۔ مثلاً ان کی یہ رباعی:

کیا فرق ہے نور و نار میں اے ساقی؟
کیا شے ہے نگاہ یار میں اے ساقی؟
آئینہ اعتبار ہے ہر عالم
نظارہ ہے کس شمار میں اے ساقی؟

سردیوان ان کا یہ کہنا کہ: آئینہ اعتبار ہے ہر عالم ' اور: نظارہ ہے کس شمار میں اے ساقی؟ ' اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ شاعر کا نظریہ حیات ہے۔ وہ زندگی کی یہی ماہیت سمجھتے ہیں۔ ان کا "آئینہ اعتبار" صرف فرد کے

متعلق نہیں بلکہ ساری موجودات یا نقوش کائنات کے متعلق ہے۔ انھوں نے یہ اعتبار اپنے وجدان و تفکر سے اختیار کیا ہے۔ وجود ایک وحدت ہے۔ یہ عقیدہ مختصر طور پر دو لفظوں میں بیان ہو جاتا ہے لیکن اس کے سمجھنے اور سمجھانے میں صوفیانہ وجدان' شاعرانہ تخیل اور منطقی استدلال کے ذریعے صدیوں سے طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے گئے ہیں۔ یہی مسئلہ ہے جس میں مابعد الطبعیات اور تصوف کا موضوع مشترک ہوگیا ہے۔ اس نظریے کا مبحث یہ ہے کہ اصل ہستی یا ذات واجب الوجود صرف ایک ہے۔ وجود کا اطلاق صرف اسی ایک ہستی پر ہو سکتا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ ہست نما نیست ہے۔ موجودات کی کثرت یا توصفاتی ہے یا اعتباری۔ خود ذات واحد میں' جو کثرت صفات اور تنوع تجلیات سے ہے' اس کا تعلق ذات واحد سے کس قسم کا ہے' اس کی بابت صوفیا و حکماء میں طرح طرح کے اختلافات ہیں۔ موجودات کو اعتبار اور نیست کہنے کے باوجود بھی وجودی موحد اس کا قائل ہے کہ جو کچھ ہے وہ ایک ہی ذات کا شہود اور جلوہ ہے۔ اگر موجودات میں خدا ہی موثر فی الوجود ہے تو موجودات مطلقاً موہوم اور معدوم نہیں ہو سکتے۔ بقول غالب:

کب وصف احاطہ بیاں میں آیا
ہر حمد و ثنا سے تجھے برتر پایا
خود میرا وجود تیری ہستی کی دلیل
ہے مہر' کہاں کی دھوپ کیسا سایا؟

تنزیہ ہے کیا شے کوئی تفسیر تو ہو
اے حسن مجرد کوئی تنویر تو ہو

بے چون و چرا ہے تری ہستی کا یقین
لیکن کوئی پیکر کوئی تصویر تو ہو

یہ امر طے شدہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ کچھ حس کے ذریعے سے، کچھ علم کے واسطے سے اور کچھ وجدان کی بدولت باطن کا مسلسل انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہر باطن کے اندر ایک دوسرا باطن ہے اس لیے انکشاف کہیں حقیقت کلی سے دو چار نہیں ہوتا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وجود ایک کھلی ہوئی حسی اور ادراکی حقیقت ہے۔ جو کچھ ظاہر ہے بس اتنا ہی ہے اور غائب کچھ نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی غلط ہے کہ ہستی راز ہی راز ہے، جس سے کوئی آشنا نہ ہو اور نہ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ، جسے اقبال نے اس تشبیہ میں ادا کیا ہے:

کسوت مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے

ہستی کا یہ عالم ہے کہ وہ نہ پورے اسرار کھول کر رکھ دیتی ہے اور نہ بالکل خاموشی ہے۔ ٹینی سن اپنی نظم (In Maumoriam) میں الفاظ کے متعلق کہتا ہے کہ الفاظ بھی فطرت کی طرح ہیں، جن کے اندر روح نیم ظاہر اور نیم پوشیدہ رہتی ہے۔ غالب کا شعر ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عالم و عارف کا کام یہ ہے کہ ظاہر اشارات سے باطن کے رموز تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس پر جاہل کے مقابلے میں بہت زیادہ انکشاف ہوگا۔ لیکن جس قدر انکشاف ہوگا اسی حد تک زندگی کے راز ہونے کا احساس بھی اس میں بڑھتا جائے گا۔ علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ حیرت میں بھی اضافہ ہوگا۔ افلاطون کہتا ہے کہ علم حیرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسری جگہ وہ فلسفے کو

انسان کی حیرت رفع کرنے کا سبب قرار دیتا ہے۔ انسان اپنے ذہن کی اس حالت میں کائنات و مافیہ کو عموماً اپنے سوالات کا نشانہ بناتا ہے اور پھر اپنے علم کے مطابق ان کے جوابات دیتا ہے۔ دیکھیے شوقی کی رباعیوں میں ذہن کا کون سا مرحلہ ہے؟ اس ذیل میں ان کی یہ مندرجہ مسلسل رباعیاں شاید اردو میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جن میں پہلے شاعر ایک سوال کرتا ہے اور پھر اس کا جواب دیتا ہے:

تخصیص مکان و لامکاں سے پہلے
تخلیق زمین و آسماں سے پہلے
کس شمع سے روشن تھا یہ فانوس وجود
مہر و مہ و انجم و کہکشاں سے پہلے

عالم تھا دھواں دھواں جہاں سے پہلے
اڑتا تھا غبار کارواں سے پہلے
خود عرش کو بھی قرار حاصل نہ ہوا
تکمیل حدیقہ زیاں سے پہلے

کیا دور تھا اس دور زماں سے پہلے؟
تھی کون سی منزل اس جہاں سے پہلے
کیوں خلعت مستعار بخشا ہے ہمیں؟
ہم کیا تھے حیات ناگہاں سے پہلے

صحرا کا عمل تھا گلستاں سے پہلے
اٹھتے تھے بگولے سے یہاں سے پہلے
طاری تھا جہاں پہ ایک ہو کا عالم
گل کاریٔ دست ناتواں سے پہلے

یہ مسلسل رباعیاں ہیں جن میں شاعر نے اپنے طور پر ان سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ لیکن ایسی بیشتر رباعیاں ہیں جہاں شوقی سراپا سوال ہیں۔ عقل اور تجربہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ اس لیے جواب کی طرف سے سکوت ہے:

خاصیت حسن کائناتی کیا ہے؟
کیفیت جوہر حیاتی کیا ہے؟
دل درپے آسودگی نفس ہے کیوں؟
ماہیت ارتقائے ذاتی کیا ہے؟

اور پھر اسی موضوع کی ان کی یہ مسلسل رباعیاں ملاحظہ فرمایئے:

اس عالم ایجاد کی غایت کیا ہے؟
اس جوہر اضداد میں حکمت کیا ہے؟
پختہ ہو شعور تو سمجھ میں آئے
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

یہ پیچ و خم گیسوئے فطرت کیا ہے؟
اس پردگی راز میں حکمت کیا ہے؟
انسان ہے مبتلائے صد ظن و گماں

یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

عالم کی حقیقت و ماہیت سے متعلق کچھ نظریات عقلی ہوتے ہیں اور کچھ ایسے جن کا مدار احساس تاثر یا وجدان پر ہوتا ہے۔ شوقی کے کچھ خیالات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ عالم محسوسات کا اعتباری یا معدوم ہونا بطور ایک وجدان یا احساس کے ان پر طاری ہوتا ہے۔ مثلاً وہ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

کیا فرق ہے نور و نار میں اے ساقی؟
کیا شے ہے نگاہ یار میں اے ساقی؟
آئینہ اعتبار ہے ہر عالم
نظارہ ہے کس شمار میں اے ساقی؟

اس کے مقابلے میں ان کی ایک اور رباعی ہے:

بے زاری و بیگانہ شعاری کب تک؟
دعوائے جنون ہوشیاری کب تک؟
ہر چیز پکارتی ہے میں ہوں میں ہوں"
دنیا کو کہے گا اعتباری کب تک؟

تو عقل و احساس میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ عالم کے متعلق جس زاویہ نگاہ کا اظہار ان کی رباعیوں میں ہے وہ ایک نفسی کیفیت ہے جو کبھی کبھی حکما، صوفیاء اور شعراء پر طاری ہوتی رہتی ہے۔ یک بیک ان میں ایک استفہامی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ یہ عالم اور اس کے حوادث و مظاہر حقیقی ہیں یا اعتباری، یہ بیداری ہے یا خواب، اصلی ہے یا سیمیائی، مستقل خارجی حقیقت ہے یا فریب ادراک، اصل ہے یا وہم۔ ایسے حکماء جنھوں نے دنیا کو خواب قرار دیا ہے، یہ ان کا عقلی نظریہ نہ تھا، بلکہ مخصوص لمحات میں حقیقت عالم کے

متعلق ایک وحشت انگیز احساس تھا۔ احساس وہم کے مقابلے میں یہ ایک علیحدہ قسم کا احساس ہے:

بالیدگی شوق کا بھی پاس رہے
شائستگی ذوق کا بھی پاس رہے
عکاسی زندگی ہے مقصود مگر
تمثیل میں مافوق کا بھی پاس رہے

کیا تکملہ شوق کی تدبیر کریں؟
ایوان حیات کیسے تعمیر کریں؟
ہر خواب ہے شرمندہ تعبیر مگر
اس زیست کو کس خواب سے تعبیر کریں؟

جب کوئی شخص حرص و ہوس کی کشمکش اور زندگی کی جدوجہد میں مبتلا ہوتا ہے' اس حالت میں کسی چیز کے وہمی ہونے کا گمان اس کے دل میں نہیں گزرتا۔ نفس کو اشیاء و حوادث سے الگ ہو کر مظاہر کو بے تعلق تماشائی کے طور پر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ تعلقات کے الجھاؤ میں نفس گم ہوتا ہے۔ لیکن زندگی کے بہت سے نشیب و فراز اور حرص و ہوس کے عبرت خیز نتائج دیکھ کر وہ خیر و شر کی اصلیت' اسباب و علل اور فطرت پر غور کرتا ہے:

قلب اور ضمیر کی فضیلت کیا ہے؟
اے مصحف نفس روئے فطرت کیا ہے؟
انسان فرشتہ بھی ہے شیطان بھی ہے
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

اک شعبدہ نظر ہے رنگت کیا ہے؟
کیفیت ذہنی ہے بصارف کیا ہے؟
اک دام زمیں رنگ ہے ایثار و خلوص
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

سرمایہ ناز عیش و عشرت کیا ہے؟
اک آذر بتساز ہے دولت کیا ہے؟
کیوں زر سے تمام عیب چھپ جاتے ہیں؟
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

نسیان و تصور کی رعایت کیا ہے؟
انعام گراں بار امانت کیا ہے؟
ہر لغزش پا موجب تعزیر ہے کیوں؟
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

آئین سعات و نحوست کیا ہے؟
معیار شرافت و ذلالت کیا ہے؟
کچھ علم عطا ہو صاحب لوح و قلم

یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

خارجی مظاہر اور نفسی کیفیات کا بڑا قریبی تعلق ہے۔ وہ دونوں ہم آہنگ ہیں۔ عام نفسیات یہ کہتی ہے کہ خارجی فطرت جذبات سے معرا ہے۔ انسان عام طور پر اور شعراء خاص طور پر اپنے جذبات اس کے مظاہر میں ڈال کر ایک لطیف دھوکے سے اپنے اور دوسروں کے لیے لذت پیدا کر لیتے ہیں' لیکن جو لوگ ہستی کی اساس وحدت کے قائل ہیں' وہ اسے دھوکہ نہیں بلکہ عین حقیقت سمجھتے ہیں۔ ورڈز ورتھ کو بہت زیادہ وحدت فطرت کا احساس تھا اور وہ نباتات کو بھی جانداروں کی طرح حساس سمجھتا تھا۔ بلکہ مادی فطرت کو بھی وہ روحی مظاہر تصور کرتا۔ ان مظاہر سے انسانی روح میں جو وجد و مستی پیدا ہوتی ہے وہ اس لیے ہے کہ انسانی روح ان مظاہر کی روح سے اپنی ہم آہنگی محسوس کرتی ہے۔ فطرت کے تمام مظاہر میں حسن موجود ہے اس لیے یہ مظاہر حسن بن کر روح کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ شوقی کی بیشتر رباعیوں میں یہ کیف حسن موجود ہے:

قرطاس گل و لالہ پہ یہ نقش و نگار
یہ جلوہ رنگ و بو یہ اعجاز بہار
موجوں کی سبک روی میں نغموں کا سرور
فطرت بھی ہے کتنی سادہ کتنی پرکار

اک لعبت صد رنگ نظر آتی ہے
اک صفحہ ارژنگ نظر آتی ہے
نیرنگ طلسم ہے یہ دنیا لیکن

کچھ خارج از آہنگ نظر آتی ہے

تاب رخ ساقی سے ہے گل رنگ سبو
نیرنگ نظر ہے شعلہ رنگ و بو
اک آئینہ تمثال ہے ہر جلوہ رنگ
دل حسن طلب سے نافہ صد آہو

سرخی ہی نہیں رنگ حنا میں تنہا
شوخی ہی نہیں گل کی ادا میں تنہا
ہے لرزش پوشیدہ رنگ و بو بھی
مستی ہی نہیں رقص صبا میں تنہا

احساس سے گردش میں ہے فانوس خیال
تخئیل سے روشن ہے طرب گاہ کمال
اک شے نظر افروز و مسرت انگیز
اک وحدت آہنگ و تناسب ہے جمال

مصور حقیقی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور زندگی سراپا تغیر ہے۔ کوئی چیز جمادات ' نباتات ' حیوانات ' انسان ایک لمحہ بھی اپنی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ انسان اس لامتناہی انقلاب میں ثبات تلاش کرتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ عارفان حقیقت کو ہستی کے کسی پہلو میں بھی کبھی جمود نظر نہیں آیا۔

ساری ہستی میں زندگی ہی کے مختلف مدارج پائے جاتے ہیں۔ جب کوئی صفت یا حالت ہم آہنگی کے دائرے سے باہر نکلتی ہوئی محسوس ہو تو وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے "شوخی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جاذب نظر و دل بھی ہے۔ ان رباعیوں کو دیکھیے' ان میں آپ کو شوخی حسن کے ایک پہلو کی طرح شاعر کے جذبات و احساسات کے روپ میں نظر آئے گی۔

یہ ان کی مسلسل رباعیوں میں سے چند ہیں:

تھی حسن میں اک کشش ادا سے پہلے
دل خون ہوا رنگ حنا سے پہلے
عشق ایک حقیقت ہے مگر جلوہ عشق
اک راز تھا شوخی حیا سے پہلے

ہنستے نہیں گل رقص صبا سے پہلے
کھلتے نہیں رخ رنگ حیا سے پہلے
شمعیں رخ گل رنگ کی لو دینے لگیں
افسوں گری مہر وفا سے پہلے

نیرنگی شوخی ادا سے پہلے
رعنائی جلوہ قبا سے پہلے
کیوں جامہ سے باہر ہوئی جاتی ہے کلی؟
آوارگی رخت صبا سے پہلے

جب سے انسان نے حیات و کائنات پر غور کرنا شروع کیا ہے' آج

تک اس کے لیے سب سے زیادہ اہم مشکل، تشنہ حل مسئلہ یہ رہا ہے کہ وقت یا زمان کیا ہے؟ اگرچہ اس سے مکان کا مسئلہ بھی وابستہ رہا لیکن زمان کی ماہیئت جاننا اس سے زیادہ ضروری سمجھا گیا۔ نیوٹن نے وقت کی جو ماہیئت سمجھی اور اپنی طبعیات کی بنیاد اس پر رکھی، زمانہ حال میں آئین سٹائین نے اسے غلط قرار دیا اور اپنے نظریہ اضافیت کی اساس اس عقیدے پر رکھی کہ زمان و مکان ایک ہی اضافی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ آئین سٹائین کے علاوہ اس کے ایک معاصر فلسفی برگساں نے وقت کی ماہیئت ہی پر سارے فلسفہ حیات کی تعمیر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی تغیر اور ارتقاء کا نام ہے اور زمان ہی اس کی ماہیئت ہے۔ گویا زندگی اور وقت ایک چیز ہیں۔ اردو شاعری میں محض چند شعراء جیسے غالب اور اقبال نے زمان کو شاعری میں اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ یہ خصوصیت کسی حد تک شوقی کی شاعری میں بھی ہے کہ انھوں نے زمان یا وقت کے تاثر کے ساتھ یا اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس ضمن میں ان کی چند رباعیاں دیکھیے:

گرداب کی گود میں جو رہ سکتے ہیں
موجوں کے تھپیڑے بھی وہ سہہ سکتے ہیں
ہے وقت کے دریا کو پکڑنا تو محال
ہاں اس کے ساتھ ساتھ بہہ سکتے ہیں

مستقبل و ماضی کی حقیقت معلوم
دیروز ہے معدوم تو فردا موہوم
امروز ہے مہر کار گاہ مکاں!

آئینہ مہر ہے کتاب مکتوم

کب دائرہ وہم و گماں سے نکلے
کب کشمکش سود و زیاں سے نکلے
گردش میں رہے دخت صہبا کے مانند
کب سلسلہ دور زماں سے نکلے

پیمانہ وقت اختیاری تو نہیں؟
یہ طول یہ عرض، اعتباری تو نہیں؟
کچھ وزن نہ میزان نہ مسطر نہ شمار
انسان کی یہ دسیہ کاری تو نہیں؟

کیا شے ہے تصور زماں اے ساقی؟
کیا چیز ہے تعبیر مکاں اے ساقی؟
پیمانہ وقت ہے مکان کا مسطر
خود وقت ہے بحر بے کراں اے ساقی

چونکہ "زماں" آفاق کے پس منظر میں انسانی حیات کے سکون اور تعطل کو توڑتا رہتا ہے اس اعتبار سے اسے باطن بھی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ رات کے تسکین افزا اندھیرے اور دن کے تحرک انگیز اجالے میں اپنا اظہار بھی کرتا رہتا ہے اس لحاظ سے وہ ظاہر ہے۔ اصل یہ ہے کہ حقیقت

آفاق، زمان اور انفس سب ہی میں جلوہ نما ہے، لیکن ان کی معرفت کے لیے نظر کے التفات، مشاہدے اور ذہن و فکر کی ضرورت ہے۔ وقوف حقائق کے لیے مشاہدہ آفاقی ناگزیر ہے۔ اور مشاہدے کا حاصل معرفت حقیقت ہے۔ اگر کوئی فن کار یا شاعر کائنات کے کسی پہلو اور اس سے متعلقہ حقائق کو بیان کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ اس کے مشاہدہ آفاقی کا ایک جزو ہے۔ جب کہ فن کار یا شاعر کی کوئی تخلیق یا شعر محض کسی معروضی یا موضوعی پہلو ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ دونوں ہی کا اتصال اس کی ترجمانی میں موجود رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر فن پارہ یا شعر پر نقد و نظر کی جائے تو اس میں شامل آفاق اور انفس کے پہلوؤں کو الگ کیا جا سکے۔

عام طور پر مشاہدہ اس کو کہا جاتا ہے کہ انسان محسوسات سے معلومات حاصل کرے اور پھر معلومات کی اس کثرت کو معقولات کے کلی تصورات میں منسلک کرتا جائے۔ محسوسات کا مشاہدہ بھی ابتداء میں جزئی رہتا ہے۔ اور ان سے حاصل کردہ معقولات بھی اپنی ظاہری کلیت کے باوجود جزئی ہی رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذریعے سے کسی چیز کی حقیقت مکمل طور پر منکشف نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلے میں حکماء کہتے ہیں کہ علم، جو مشاہدے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اس کے حصول کا ذریعہ کثرت معلومات اور کثرت کلیات نہیں بلکہ تزکیہ نفس ہے۔ اس لیے کہ روح کے اندر تمام حقائق حیات مضمر ہیں۔ حرص اور ہوا و ہوس کی وجہ سے اور اغراض کی کج بنی کے باعث آئینہ دل زنگ آلود ہو جاتا ہے اور حقیقت اس میں منعکس نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ حقیقت تک پہنچنے کا مرحلہ اول تزکیہ نفس ہے۔ مظاہر فطرت کے ظاہری روابط کا علم جسے سائنس کہتے ہیں، وہ تزکیہ نفس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن حکماء کے نزدیک یہ صحیح علم نہیں۔ علم وہ ہے جس سے انسان کو اپنی

حقیقت معلوم ہو۔ سقراط جیسے حکیم نے بھی یہی کہا تھا کہ ریاضیات اور طبعیات کا علم بہت ثانوی چیز ہے۔ اصل معرفت وہ ہے جو انسان کو اپنی ماہیئت کے متعلق ہو کہ میں کیا ہوں؟ میرا مقصد حیات کیا ہے؟ میرا وظیفہ زندگی کیا ہونا چاہیے اور حقیقت ازلی سے میرا کس قسم کا تعلق ہے؟ یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات غور و فکر کرنے والے ہر فرد کے ذہن میں اضطراب پیدا کرتے ہیں۔

شوقی کے اضطراب اور استفسار کو دیکھیے:

یہ نفس یہ ذات کیا ہے معلوم تو ہو؟
یہ نقش حیات کیا ہے معلوم تو ہو؟
کیوں تابع گردش فلک ہے مری خاک؟
تدبیر نجات کیا ہے معلوم تو ہو؟

فانوس خیال تک رسائی تو ہے
معراج کمال تک رسائی تو ہے
کاش اپنی حقیقت سے بھی واقف ہوتے
دنیائے مثال تک رسائی تو ہے

ہے جبر کہ اختیار فطرت کیا ہے؟
اس خاک کے پتلے کی جبلت کیا ہے؟
بالیدگی انا سے فطرت کو ہے کد
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

تن اور بدن کی قدرو قیمت کیا ہے؟
اس تن کے بغیر جان کی صورت کیا ہے؟
ہستی بھی عدم بھی ارتقا کی منزل
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

مرقومہ رباعیوں میں دوسری رباعی موضوعی تصوریت (Subjective Idealism) کی بہترین مثال ہے۔ اس نظریے کا مبحث یہ ہے کہ حقیقت محض انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور ساری کائنات و مافیہ اسی نفس کا ظاہری اور مثالی پیکر ہے۔ چنانچہ اگر انسان خارجی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ اس طرح خود اپنے نفس کے ظاہری وجود کا علم حاصل کرتا ہے' نہ کہ کسی غیراز خود وجود کا' جو کہ وجود ہی نہیں رکھتا۔ گویا ساری کائنات انسان کے لیے اس کا اپنا ظاہری روپ یا اپنے نفس کا پرتو ہے۔ نفس انسانی کو کبھی مطلق تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔ نفس متحرک تصاویر کا پردہ ہے۔ یعنی ایک "فانوس خیال" ہے۔ رنگا رنگ تصاویر کچھ گویا کچھ خاموش اس پردے پر منعکس ہوتی رہتی ہیں۔ خیالات ہجوم کرتے ہیں۔ کبھی غیروں سے کبھی اپنے آپ سے بے آواز گفتگو چلتی رہتی ہے۔ جس طرح ان رباعیوں میں:

لذت کش کیف رنگ و بو رہتے ہیں
شائستہ ذوق آرزو رہتے ہیں
دل ہم سے محو گفتگو رہتا ہے
ہم دل سے محو گفتگو رہتے ہیں

عرفان ہے خود آگہی نفس کا نام

ایمان ہے تابندگی نفس کا نام
گھنٹی کی سی آواز چلی آتی ہے
الہام ہے خود کلامی نفس کا نام

دنیا میں جو بھی وجود یا مظہر ہے اس کی ایک تو صورت ہوتی ہے اور ایک اس کے معنی۔ حکمت کا تقاضا اور اس کی فطرت یہ ہے کہ صورت سے معنی کی طرف یا ظاہر سے باطن کی طرف آیا جائے۔ اس اصول کے مطابق فرد کا ذہن آخری مرحلے پر لامحالہ اپنی ذات 'نفس' باطن یا انفس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے گا۔ یہاں اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا نفس کیا ہے؟

دیکھا ہے حقیقت کو بہ انداز مجاز
ہے پیش نظر ناز ، بہ اعجاز نیاز
ہستی بھی فسانہ ، نیستی بھی افسوں
ہم بھی ہیں طلسم راز در پردہ راز

خنداں افق صبح بہاراں کی طرح
دل کش کسی سایہ گریزاں کی طرح
مت پوچھ کہ یہ بت کدہ نفس ہے کیا
اک عالم راز ہے شبستاں کی طرح

گل رنگ نگار فتنہ ساماں کی طرح
شب رنگ کسی کی زلف پیچاں کی طرح
کیا تم سے کہوں حقیقت نفس ہے کیا

اک دشمن جاں ہے ناز جاناں کی طرح

چونکہ نفس ایک آئینے کی طرح ہے جس میں کائنات کے حقائق جوں کے توں منعکس ہوتے ہیں' اس لیے حکما تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بغیر نفس کے مشاہدے کے کائنات کی حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ آفاق اور انفس میں موجود حقیقت کے ادراک کے لیے آفاق کا درجہ ثانوی ہے۔ فرد کا مقصود حقیقت کا عرفان ہے' جو اصل ہے۔ لیکن حقیقت کا عرفان خود اپنے نفس کے عرفان کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ بعض عرفانے تو یہاں تک کہہ دیا کہ عرفان نفس ہی عرفان خدا (ماورائی حقیقت) ہے۔ اگرچہ خدا نہ نفس ہے نہ مادہ۔ بلکہ اسے ان تمام منازل سے آگے بڑھ کر اپنے نفس کی ماہیت پر غور کرنا ہے۔ شوقی نفس کو جس حد تک اہمیت دیتے ہیں' اس کے ثبوت کے لیے ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ فرمایئے:

بوجھل سا سکوت تھا ندا سے پہلے
تھا ہوش کسے بانگ درا سے پہلے
آئینہ رنگ و بو مسلم لیکن
بے رنگ تھا اظہار انا سے پہلے

ادراک کی سطح سے ابھر کر دیکھو
احساس کی وادی سے گزر کر دیکھو
کس دولت بے بہا کا گنجینہ ہے؟
پنہائی نفس میں اتر کر دیکھو

بے گانہ پیچ و خم ہے ناواقف راہ
تو اپنی حقیقت سے نہیں خود آگاہ
ہے اجر و سزا خود آگہی پر مبنی
ہر فعل عبادت ہے ہر اک فعل گناہ

پھولوں کے تبسم سے گلستاں روشن
تاروں کی ضیا سے چرخ گرداں روشن
معراج خود آ گہی ہے عرفان انا
عرفان انا سے دل یزداں روشن

جدید فلسفہ جن اساسی نظریات پر قائم ہے ان میں سے ایک تصوریت (Idealism) ہے، جس کی دو قسمیں ہیں۔ موضوعی اور معروضی۔ اول الذکر میں بارکلے اور موخرالذکر میں ہیگل اہم نام ہیں۔ دونوں نظریات علیٰ الترتیب نفس اور مادہ کو اہمیت دیتے ہیں۔ موضوعی تصوریت کی رو سے فطرت بجائے خود کوئی مستقبل حیثیت نہیں رکھتی، اور یہ کہ حقیقت اپنی ماہیت میں نفسی ہے۔ جب کہ معروضی تصوریت کا یقین ہے کہ نفس فطرت کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اور جو کچھ حقیقت فطرت کے پس پشت اور فطرت کے اندر ہے، نفسی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں نظریات بالآخر اپنی انتہا پر پہنچ کر تصور الٰہ کو اخذ کرتے ہیں۔ یہاں ہیگل کا وہ نظریہ تشکیل پاتا ہے جس کو اس نے منطقی اثباتیت (Logical Positiveism) کے تحت بیان کیا ہے۔ ان نظریات کا ماحصل بالآخر یہ ہے کہ فطرت میں جگہ "نفس" بذاتہ موجود ہے۔ شوقی کی یہ رباعیاں دیکھیے:

ہر خار ہزار گل بدامن نکلا
ہر گل بجمال خویش گلشن نکلا
دل چیر کے دیکھا جو ہر اک ذرے کا
اک مہر جہاں تاب کا مسکن نکلا

آمیزش رنگ میں اثر پوشیدہ
پیر اہن تنگ میں ہنر پوشیدہ
اک طرفہ قیامت ہے کشیدہ قامت
ہے سینہ سنگ میں شرر پوشیدہ

ہر موج میں طوفاں بھی ہے ساحل بھی ہے
ہر ذرے میں دھڑکنیں بھی ہیں دل بھی ہے
ہر منزل ارتقا میں ہے اک عالم
ہر اک عالم خود ایک منزل بھی ہے

قرآن حکیم اور صوفیائے کرام کے ہاں قلب بمعنی نفس بھی استعمال ہوا ہے۔ صوفیا کا سلوک تزکیہ نفس سے شروع ہو کر ولایت تک پہنچتا ہے۔ ان کا یقین ہے کہ حقیقت جو نور الہٰی ہے عاصی کے قلب میں منعکس نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اغراض و حسد کے باعث اس کا دل زنگ آلود رہتا ہے۔ نفس جو قلب یا دل بھی ہے، ساری کائنات و مافیہ کا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں کائنات کے مختلف روپ نظر آتے ہیں:

تنویر رخ حیات کہیے تو بجا

تقدیر تعینات کہیے تو بجا
دل مہر جہاں فروز دل ماہ تمام
آئینہ کائنات کہیے تو بجا

کیا کیا اسے خود پہ ناز ہے کیا کہیے
ہر شے سے وہ بے نیاز ہے کیا کہیے
سر چشمہ ہے خود حقیقت اشیاء کا
دل ایک طلسم راز ہے کیا کہیے

تمہید تجلیات بھی ہے ساقی
دیباچہ واردات بھی ہے ساقی
محتاج توجہ ہے ہر اک باب اس کا
دل مرکز کائنات بھی ہے ساقی

شوقی کثرت کے اندر وحدت کی جلوہ فرمائی کے قائل ہیں اور کثرت بے وحدت کو عنقا اور عدم تصور کرتے ہیں۔ تمام مخلوقات ہستی محض اور عین وجود کی بدولت ہیں۔ اور اس کی یکتائی کو ظاہر کرتی ہیں۔ زندگی کی تمام کثرتیں ایک ہی وحدت سے مستعار ہیں۔ خود نفس جو ایک وحدت بھی ہے اور کثرت کا ایک جزو بھی، اپنے اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ شوقی کی اس رباعی میں وحدت اور کثرت کے رشتے دیکھیے:

خلوت سے ہوا عالم جلوت پیدا
جلوت نے کیا طلسم حیرت پیدا

وحدت سے منور ہے شبستان وجود
آئینے کیا کرتے ہیں کثرت پیدا

اور وجودی فلسفے میں یہ امر قابل غور ہے کہ ایک طرف وہ ماسوایا موجودات کو عدم کہتا ہے اور دوسری طرف وہ یہ کہتا ہے کہ شہود و ظہور سب خدا ہی کا ہے۔ تصوف میں فریب ہستی یہ ہے کہ نفس کو خدا سے الگ کوئی مستقل وجود تصور کیا جائے۔ اگر ہستی کو ذات الٰہی کی تجلی سمجھ لیں تو وہ ظاہر دباہر بات ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔ شوقی کی یہ رباعی اس امر کو بیان کرتی ہے:

کب وصف احاطہ بیاں میں آیا
ہر حمد و ثنا سے تجھے برتر پایا
خود میرا وجود تیری ہستی کی دلیل
بے مہر کہاں کی دھوپ کیسا سایا

اس عقیدے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب فرد اپنے نفس کی حقیقت سے واقف ہو کر اسے محض خالق کا پرتو اور تجلی جان لیتا ہے اور حیقیت مطلقہ کی موجودگی میں اپنے نفس کو وحدت مطلقہ قرار دے کر خدا سمجھ لیتا ہے۔ یہ وحدت کثرت کے مقابلے میں 'مختلف پہلوؤں سے' انفرادیت کے احساس سے سرشار ہوتی ہے۔ اگر فرد اس انفرادیت کو محسوس کرلے تو وہ اپنی ذات "میں" کو کثرت کی موجودگی میں اہمیت دینے لگتا ہے:

مستی کا تقاضا ہے کہ مستی میں ہوں
ہستی کی تمنا ہے کہ ہستی میں ہوں
میں جاری و ساری ز ازل تا بہ ابد
لاریب محیط اوج و پستی میں ہوں

ہوں خوگر گل بانگ تعلی میں بھی
ہوں اپنے لیے وجہ تسلی میں بھی
میں جاری و ساری ز ازل تا بہ ابد
لاریب محیط اوج و پستی میں ہوں

ہوں خوگر گل بانگ تعلی میں بھی
ہوں اپنے لیے وجہ تسلی میں بھی
یہ حیرت آئینہ بھی حیراں کن ہے
ہوں تیرا ہی پرتو تجلی میں بھی

اس ذہنی مرحلے کے بعد فرد میں جو احساس پیدا ہوتا ہے، اس کے دو رخ ہیں۔ ایک مثبت ایک منفی۔ یہاں فرد کا نفسیاتی ماحول اور عوامل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ فرد کون سا مثبت یا منفی رخ اختیار کرتا ہے۔ مثبت رخ خودی اور انا کو تشکیل کرتا ہے۔ اور منفی رخ شعور کم تری کا باعث ہوتا ہے۔ کسی فرد میں محض ایک ہی رخ رونما ہوتا ہے یا کسی میں دونوں۔ شوقی کے ہاں اس سلسلے کے دونوں رخ موجود ہیں، لیکن منفی رخ کی مثالیں، ان کی رباعیوں میں زیادہ نہیں۔ مثبت رخ کی یہ دو ایک مثالیں دیکھیے:

معلوم نہیں کہ ہم ہیں نیرنگ وجود
میزان جہاں ہیں یا ہیں پاسنگ وجود
رہ رہ کے مگر دل سے صدا آتی ہے
ہم ہی سے ہے آرائش ارژنگ وجود

ہر غنچے کو کر دیا تبسم کا مجاز
ہر بت کو سکھائے شوخیوں کے انداز
ہر شے میں دھڑک رہا ہے میرا ہی دل
ہر سمت سے آ رہی ہے میری آواز

اک عالم بے مثال میں رہتا ہوں
یعنی بزم خیال میں رہتا ہوں
بے گانہ دہر بے نیاز شب و روز
سرشار انا ہوں حال میں رہتا ہوں

منفی رخ کی بھی ایک مثال دیکھیے:

ہر سنگ ملامت کا نشانہ میں ہوں
ہر سودوزیاں کا شاخسانہ میں ہوں
ما زصبح نخستین ازل تا بہ ابد!
جولانگہ عالم ہوں زمانہ میں ہوں

زندگی علائق کا نام ہے اور ان کی کوئی انتہا نہیں۔ طبیعت کو بیک وقت کئی کئی چیزوں سے علاقہ ہوتا ہے۔ ہر تعلق نفس کو پابہ زنجیر کرتا ہے۔ اگر کسی شاعر کے موضوعات شعر کا تعین کرنا ہو تو وہ سارے موضوعات انفس و آفاق کے عنوانات کے تحت آ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں شوقی کے کلام میں انفس و آفاق کے جائزے کے باوجود بڑی حد تک محدود رہ کر صرف ایسے ہی موضوعات کو زیر بحث رکھا گیا ہے جو بظاہر اور واضح طور پر ان عنوانات کے تحت آ سکتے تھے۔ یہ ایک طائرانہ اور مختصر جائزہ تھا' جب کہ ان کے کلام میں انھی

موضوعات کے تحت اور بھی گوشوں کی تلاش ممکن ہے۔

اقبال شوقی کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف ان کا مشاہدہ ہے۔ ویسے اگر "آئینہ اعتبار" پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ایک شاعر کے تاثرات اور جذبات کے مختلف عکس متحرک نظر آتے ہیں۔ لیکن ان تمام متنوع موضوعات میں جو موضوع زیادہ نمایاں ہے، وہ ان کا مشاہدہ انفس و آفاق ہی ہے۔ اس وقت ان دونوں پہلوؤں کے باہمی رابطے سے پیدا ہونے والی ایک کیفیت "جمالیات" کا سرسری مطالعہ مقصود ہے۔ اس لیے کہ اس پہلو اور موضوع کا مطالعہ دراصل شوقی کی شاعری کے اصل موضوع کا تعین کرتا ہے۔

جمال یا حسن ایک مخصوص صفت ہے جو معروض اور موضوع کی ایک خاص حالت کے باہمی رابطے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی کیا ماہیئت ہے؟ کائنات میں اس کا کیا مقام ہے؟ انسانی نفس سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اور انسانی زندگی پر جمال پرستی کا کیا اثر پڑتا ہے؟ ان تمام سوالات پر حکیموں، عارفوں اور شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر ایک نے لطیف نکات پیدا کیے ہیں۔ شوقی حسن پسند اور حسن کار ہیں اور اس اعتبار سے ایک جمال پرست شاعر ہیں ---- یہی ان کی زندگی کا سرمایہ اور یہی ان کی شاعری کا وظیفہ رہا ہے۔ وہ حکمت پسند بھی ہیں لیکن تحقیق حقائق ان کا مخصوص شغل نہیں ۔ پھر بھی یہ صفت ان کی رباعیوں میں خاصی جھلکتی ہے ۔ اب دیکھیے حسن کی ماہیئت کے ضمن میں وہ خود کس طرح سوچتے ہیں:

خاصیت حسن کائناتی کیا ہے؟
کیفیت جوہر حیاتی کیا ہے؟
دل درپے آسودگی نفس ہے کیوں؟
ماہیئت ارتقائے ذاتی کیا ہے؟

اگر کسی شاعر کے موضوعات فکر و نظر کا تعین کرنا ہو تو وہ سارے موضوعات انفس و آفاق کے عنوانات کے تحت آ جاتے ہیں۔ ان کے مشاہدے کے تحت شاعر جن داخلی اور خارجی واردات و تجربات سے گزرتا ہے اور اس طرح اس کے قلب و ذہن پر جو نقوش و تاثرات مرتسم ہوتے ہیں، ان کو وہ آفاقی اور انفسی فطرت کے لحاظ سے دیکھتا ہے۔ اس اعتبار سے شاعر کے پیش نظر کائنات و مافیہ کے دونوں رخ ہوتے ہیں:

اس عالم ایجاد کی غایت کیا ہے؟
اس جوہر اضداد میں حکمت کیا ہے؟
پختہ ہو شعور تو سمجھ میں آئے
یہ حسن کرشمہ مشیت کیا ہے؟

خارجی یا معروضی رخ مرئی ہے اور زمان و مکان کے نظاروں کی جلوہ گاہ۔ اس کے برعکس موضوعی رخ باطنی ہے جس کی اکمل و احسن صورت نفس انسانی ہے۔ آفاقی و انفسی مشاہدے کا مقصد و منتہا عرفان و حقیقت ہے ۔ اس لحاظ سے ایک فرد کا ذہنی اور مشاہداتی سفر خارج سے باطن یا معروض سے موضوع کی طرف ہوتا ہے جو اصل حقیقت ہے۔ حقیقت ایک کل ہے جس کی اصل وحدت ہے۔ جب یہ اپنے آپ کو معرض اظہار میں لاتی ہے تو اس کی وہ صفات نمودار ہوتی ہیں جن کی کثرت سے یہ وحدت کچھ اس طرح گھل مل جاتی ہے کہ شہود میں غیب اور ظاہر میں باطن کے جلوے پیدا کرتی ہے۔ کائنات مختلف النوع نظاروں کا مرقع ہونے کے باوجود وحدت کی آئینہ دار ہے:

خلوت سے ہوا عالم جلوت پیدا
جلوت نے کیا طلسم حیرت پیدا
وحدت سے منور ہے شبستان وجود

آئینے کیا کرتے ہیں کثرت پیدا

حقیقت چونکہ اپنی ذات میں منزہ ہے اس لیے اس کا مشاہدہ یا ادراک ہمیشہ اس کی اضافی حیثیت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور یہ اضافی حیثیت وہ ہے جسے مجاز کہتے ہیں۔ مجاز کے دو رخ ہیں جنھیں مختلف نام دیے جاتے ہیں۔ مثلاً اسی کے ظاہری رخ کو خارجی یا معروضی بھی کہتے ہیں اور اسی طرح کے باطنی رخ کو داخلی یا موضوعی بھی کہا جاتا ہے۔ ویسے فی الاصل حقیقت اپنی مطلق حیثیت میں محض موضوعی ہے اور اس موضوعیت کے ادراک و احساس کا جو ذریعہ ہے وہ قلب ہے۔ قلب کا ایک معروضی رخ بھی ہے جسے حواس کہتے ہیں۔ حواس اور قلب کی باہمی حیثیت ایک دوسرے کے لیے فعل و انفعال کی ہے۔ حواس زندگی کے مشاہدے کے اثرات کو قلب کی انفعالی قوت کے سرچشمے یعنی دل پر مرتسم کرتے ہیں؛ جیسے اس رباعی میں:

تزئین شبستاں بہ تب و تاب جمال
آرائش بزم دل بہ فانوس خیال
زخمہ وری ساز بہ اندازہ ذوق
صورت گری ناز بہ انداز کمال

زندگی دو عناصر کا مرکب ہے۔ ان میں سے ایک فعلی ہے اور دوسرا انفعالی۔ فعلی قوت کا خلاصہ جذب ہے اور انفعالی قوت کا انجذاب۔ قوت جذب کا مظہر جلال ہے اور قوت انجذاب کا اظہار جمال سے ہوتا ہے۔ جو نظر افروزی و سرور انگیزی کی ایک منزہ نامصور کیفیت ہے۔ اب خود شوقی نے حسن کی جو تعریف کی ہے وہ اس سے کسی طور پر بھی مختلف نہیں ہے:

احساس سے گردش میں ہے فانوس خیال
تخئیل سے روشن ہے طرب گاہ کمال

اک شئے نظر افروز و مسرت انگیز
اک وحدت آہنگ و تناسب ہے جمال

مظاہر فطرت کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہستی مطلق حسن پسند اور حسن پرور ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خود حسین ہو گی۔ اگر اس میں حسن مطلق نہ ہوتا تو دنیا کے مظاہر میں عارضی اور مجازی حسن بھی کہاں سے آتا۔؟:

آہنگ بھی ہے شعلہ آواز بھی ہے
خود حسن بھی ہے حسن صنم ساز بھی ہے
جس کی ہر ادا ہوئی ہے عالم شوقی
وہ صدر نشین پردہ راز بھی ہے

تنویر شرر سنگ سے ہے جلوہ نما
ہر رنگ عجب رنگ سے ہے جلوہ نما
ہے عالم بے صوت و صدا پیش نگاہ
ہر نقش کس ارژنگ سے ہے جلوہ نما

تاروں کی چمک پھول کی بو جیٹھ کی دھوپ
ہر رنگ نرالا ہے ہر اک روپ انوپ
ہر شے میں چھپا ہر ایک شے سے ظاہر
اک جلوہ کہ جس کا نہ کوئی رنگ نہ روپ

پابند زماں اور نہ محصور جہات
ادراک کی دسترس سے باہر ہے یہ بات
ہر چند مجرد ہی سہی ذات مگر
عالم ہے تمام جلوہ حسن صفات

بعض حکیموں اور صوفیوں نے اظہار حسن ازل ہی کو وجہ تخلیق قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں اس حدیث کو پیش کیا جاتا ہے کہ ----"خدا کہتا ہے' میں ایک گنج مخفی تھا۔ پھر میں نے چاہا کہ جانا پہچانا جاؤں ----" اسی حکمت کو ابن عربی نے "فصوص الحکم" میں اس طرح بیان کیا ہے کہ خدا حسن مطاق اور تجلی ازل تھا لیکن اپنے آپ کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے انسان کو تخلیق کیا اور اس نے اس کا نام انسان اس لیے رکھا کہ وہ خدا کی آنکھ ہے۔ اس کی غرض یہ تھی کہ وہ ان آنکھوں کے ذریعے خود اپنے آپ کو دیکھے۔ اس حکمت کو شوقی کی ان رباعیوں میں اس طرح دیکھیے:

ہم مشربی رنگ حنا سے پہلے
جرعہ کشی آب بقا سے پہلے
دشوار تھی ہر کاوش خود یابی حسن
سحر نگہ عقدہ کشا سے پہلے

ہر عشوہ ہے ناز کج ادائی کی ترنگ
ہر غمزہ ہے خوئے دل ربائی کی ترنگ
آئینہ بھی ہے مورد الزام مگر
عالم ہے ادائے خود نمائی کی ترنگ

گویا حسن مطلق نے خلق کو اپنے حسن کی قدردانی کے لیے پیدا کیا اور مخلوق کا اصل وظیفہ یہی ہے کہ وہ حسن ازل کو پہچانے اس سے لطف اندوز ہو اور جہاں تک ہو سکے اس حسن کو اپنے اندر بھی جذب کر کے خود حسین ہو جائے۔ کائنات ایک بود کی نمود ہے جس میں کچھ ظاہر ہے اور کچھ مستور ---- اگر مراد اظہار حسن ہو تو کائنات میں کوئی حجاب، حجاب مطلق نہیں ہو سکتا---- اگر حجاب، حجاب مطلق ہو تو حسن کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے:

جب گیسوئے شب رنگ بکھر جاتے ہیں
ہے طرفہ ستم یہ کہ سنور جاتے ہیں
کملاتے ہیں جس قدر تری سیج کے پھول
رخسار اسی قدر نکھر جاتے ہیں

تنویر سحر ہے غنچہ رنگ شہود
ہے جلوہ گلساز ہم آہنگ شہود
معمورہ زندگی ہے منشور نما
آفاق ہے شیرازہ ارژنگ شہود

کائنات میں ایک پہلو ایسے حسن کا بھی ہے جو آشکار ہے، جیسے شوقی کی اس رباعی میں:

گر جرات شوق آئینہ ساماں ہو جائے
ہر ماہ مبیں مہر درخشاں ہو جائے
جلوے ہوں نظر کے سامنے یوں رقصاں
دل روکش آئینہ حیراں ہو جائے

اس کے علاوہ وہ حسن ہے جو نیم آشکار ہے۔ اس حسن پر ایک طرح کی نقاب ہے۔ لیکن یہ نقاب پوری طرح حجاب نہیں بن سکی۔ یہ نقاب بھی خود حسین ہے:

ذوق نظر آئینہ کامل ہو جائے
نظارہ بھی خود نظر میں شامل ہو جائے
کاش آپ الٹ دیں رخ زیبا سے نقاب
دنیا کا ہر امتیاز باطل ہو جائے

جو کچھ کہ تصور میں عیاں ہوتا ہے
وہ عالم ہستی میں کہاں ہوتا ہے
ہر نقش نظر آتا ہے دھندلا دھندلا
ہر چیز پہ سائے کا گماں ہوتا ہے

یہ نیم آشکار حسن جو حسن ازل کا غماز ہے' بعض اوقات اہل نظر کے لیے پوری طرح حسن مجازی سے بھی زیادہ دلکش بن جاتا ہے۔

فطرت کی ماہیئت ایک وحدت ہے' اسی لیے اس سے جو کثرت نمودار ہوتی ہے اس میں ہر مظہر دوسرے مظہر کا آئینہ ہوتا ہے۔ ویسے فی الحقیقت آفاق اور انفس اپنی کیفیت میں ہم آہنگ ہیں۔ عام نفسیات کا یہ مسئلہ ہے کہ خارجی مظاہر جذبات سے معرا ہیں۔ انسان عام طور پر اور شعراء خاص طور پر اپنے جذبات اس کے مظاہر میں تحلیل کر کے ایک لطیف دھوکے سے اپنے اور دوسروں کے لیے لذت پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ہستی کی اساس وحدت کے قائل ہیں وہ اسے دھوکا نہیں عین حقیقت سمجھتے ہیں:

اک لعبت صد رنگ نظر آتی ہے
اک صفحہ ارژنگ نظر آتی ہے
نیرنگ طلسم ہے یہ دنیا لیکن
کچھ خارج از آہنگ نظر آتی ہے

تاب رخ ساقی سے ہے گلرنگ سبو
نیرنگ نظر ہے شعلہ رنگ و بو
اک آئینہ تمثال ہے ہر جلوہ رنگ
دل حسن طلب سے نافہ آہو

عشق حسن کی طلب ہے۔ کائنات حسن و عشق ہی کے مظاہر سے آراستہ ہے۔ حسن و عشق کا باہمی رابطہ اس طرح کا ہے کہ ہر ایک' ایک دوسرے کا آئینہ اور ایک دوسرے کا جواب ہے:

تھی حسن میں اک کشش ادا سے پہلے
دل خون ہوا رنگ حنا سے پہلے
عشق ایک حقیقت ہے مگر جلوہ عشق
اک راز تھا شوخی حیا سے پہلے

حسن عشق آفریں ہے اور عشق حسن آفریں۔ حسن کو اپنے آپ سے بھی عشق ہے اس لیے وہ اپنی افزائش و آرائش میں بھی مصروف رہتا ہے۔ حسن آفرینی کا فعل مسلسل جاری ہے اور حسن کا خزانہ اس حد تک لامتناہی ہے کہ اس کی آفرینش کے کام سے فطرت ابھی فارغ نہیں ہوئی۔ اس خیال کے اشعار اردو شاعری میں متعدد شاعروں نے پیش کیے ہیں۔ شوقی نے

اس خیال کو بہ انداز دیگر بیان کیا ہے:

تقصیر نگاہ رونما سے پہلے
احساس متاع بے بہا سے پہلے
رہتا تھا کس کے روبرو آئینہ
انداز و کرشمہ ادا سے پہلے

تنویر رخ حیات ہے شعلہ عشق
صورت گر کائنات ہے شعلہ عشق
ہے عقل و خرد باعث تزئین حیات
آئینہ حسن ذات ہے شعلہ عشق

خلاق تصورات ہے شعلہ عشق
آفاق تجلیات ہے شعلہ عشق
معراج کمال. بندگی کی سوگند
میثاق تعینات ہے شعلہ عشق

عشق ہمیشہ اس شے سے ہوتا ہے جسے انسان حسین سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر حسین شے میں ہر فرد اتنی شدت سے کشش محسوس نہیں کرتا جتنی شدت سے دوسرا، بلکہ وہ اس سے متاثر ہوتا ہے جو اس کی نظر میں اسی قدر حسین ہوتی ہے جس قدر اس کا قلب اس سے طمانیت و سرور حاصل کرتا ہے۔ چونکہ ہر فرد اپنی موضوعی انفرادی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے ہر شخص کا یہ مثالی نمونہ بھی مختلف ہوگا:

مہر و مہ و انجم و گل و لالہ کہیے

یا موجہ رنگ و کیف صہبا کہیے
اک واہمہ اک خیال اک پرتو نور
اس حسن گریزپا کو کیا کیا کہیے

آنکھوں میں ہے تابانی سیمائے جمال
دل میں ہے سرور موج مینائے جمال
یوں بزم تصور میں ہے کوئی جیسے
دامن میں ہو گلدستہ رعنائے جمال

اک پیکر انوار کے سادہ سے خطوط
اک شوخ طرحدار کے سادہ سے خطوط
دعوائے ہنر بجا ہے شوقی لیکن
کھینچیں تو رخ یار کے سادہ خطوط

فردوس نظر ہے بزم امکان خیال
ارژنگ بنا ہوا ہے دامان خیال
جب اس گل نورستہ کی یاد آتی ہے
شوقی مہک اٹھتا ہے شبستان خیال

درج ذیل رباعیوں سے شوقی کے اس احساس جمال کا قدرے اندازہ ہو سکتا ہے جو معروضی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی آنکھیں اپنے

اطراف کے مظاہر و موجودات پر گرم تماشا ہیں۔ وہ ہر وجود کی کیفیت و تاثیر سے لطف لیتا ہے۔ یہ لطف محض انفعالی نہیں بلکہ شاعر کے نفس میں پہنچ کر خود فعال ہو جاتا ہے:

قرطاس گل و لالہ پہ یہ نقش و نگار
یہ جلوہ رنگ و بو یہ اعجاز بہار
موجوں کی سبک روی میں نغموں کا سرور
فطرت بھی ہے کتنی سادہ کتنی پرکار

تابانی مطلع سحر کی مانند
تاریکی سینہ گہر کی مانند
ہے داد طلب حیات کا ہر پہلو
رعنائی شوخی نظر کی مانند

وطن کا قرض:

اردو افسانہ اور پاکستانیت

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی فن یا ادب اپنے ماحول سے بے نیاز رہ کر تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ فن کار یا ادیب اپنی تخلیق کا کل مواد اپنے گرد و پیش سے حاصل کرتا ہے اور جس معاشرے میں وہ زندگی بسر کرتا ہے' اس کے بالعموم تمام عناصر اس کی شخصیت میں محفوظ رہتے ہیں۔ اسی بات کو یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ انسانی ذہن اور تجربہ پچھلی نسلوں کے تجربات' احساسات اور مزاجی کیفیات کو بھی اپنے شعور میں محفوظ رکھتا ہے اور جب ذہن یا جذبے میں کوئی تحرک پیدا ہوتا ہے تو صدیوں سے جمع ہونے والے احساسات و تجربات اظہار کی سطح پر نمودار ہو جاتے ہیں اور انسانی ذہن اور تجربے کو بہت سے زاویے مہیا کر دیتے ہیں۔ گویا اپنی تمام تر فکری و ذہنی بے نیازی کے باوجود فن کار یا ادیب ان تجربوں سے صرف نظر نہیں کر سکتا' جن کا مشاہدہ اس نے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی زندگی سے کیا ہے یا جو اس کے مزاج میں شامل رہے ہیں۔ ایک حساس اور صاحب بصیرت فرد ہونے کی حیثیت سے اسے اس کے گرد رونما ہونے والے واقعات و حوادث' سیاسی' تہذیبی اور

معاشی عوامل اپنے اپنے زور و اثر کی حد تک اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ اس ماحول یا اس کی ارضیت کو، جو اس کے وجود میں رچ بس جاتی ہے ---- اپنی شخصیت سے جدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کے رگ و پے سے منسلک ماحول اس کی تخلیق میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔

ادیب اپنے ماحول میں اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ اس طرح پیوست رہتا ہے کہ جہاں وہ اپنے باطن کا اظہار کرتا ہے وہیں وہ اپنے ماحول کو بھی اپنے محسوسات کا روپ دے کر پیش کرتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا ماحول یا اس کے حوادث و واقعات کہیں راست، واضح اور قابل فہم صورت میں سامنے آئیں اور کہیں تجرید یا علامت کے پردے میں چھپ کر اپنی جھلک دکھا دیں۔ پھر یہ موجودہ ذرائع ابلاغ میں ادیب کے ماحول کی وسعت ہی ہے کہ وہ اپنے ملک کے ہر گوشے اور خطے بلکہ بیرون ملک دنیا کے دور افتادہ و دور دراز علاقوں کے حوادث کی بازگشت بھی اپنے وجود میں محسوس کرتا رہتا ہے اور انھیں اپنی فکر اور تخلیقات کا موضوع بناتا ہے۔

ہم اپنے ملک کے تناظر میں بھی یہی بات بڑے اعتماد اور اصرار کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں نہ صرف یہاں کی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے بلکہ اس ملک کے تمام معاشرتی و سیاسی نشیب و فراز، المیے و طربیے اور اہم اہم حادثات و سانحات کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہیں۔ مگر کہیں واضح اور کہیں علامت اور استعارے کا لبادہ اوڑھے ہوئے۔

ایک عرصہ قبل ادب میں پاکستانیت کے مسئلے نے بہت سے ذہنوں کو سوچنے پر آمادہ کیے رکھا تھا۔ جو کچھ اس مسئلے پر کہا گیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ہمارا ادب ہماری روحانی قدروں اور امنگوں کا ترجمان ہو، اس میں ہمارے

نظریہ حیات کی روح موجود ہو اور وہ ان مقاصد کی ترغیب دے، جو اس ملک کے قیام کے وقت پیش نظر تھے، اور جو اس ملک سے محبت کے جذبات پیدا کرے۔ یا مختصر لفظوں میں پاکستانیت کے عام معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ادب میں وہ قومی روح منعکس کی جائے جو نظریہ پاکستان میں موجود ہے۔ اس کے برعکس یہ تعریف بھی کی گئی کہ پاکستانیت ارضی رشتوں سے اس طرح منسلک رہے کہ اس کے سلسلے موہن جو دڑو اور گندھارا تک پہنچیں اور مذکورہ تہذیبوں کے نام نہاد کلچر کو بھی اپنا کلچر قرار دیا جائے! ان تعریفوں سے قطع نظر۔۔۔۔ کہ جن کا یا مزید ایسی تعریفوں کا یہاں میں نے احاطہ بھی نہیں کیا، پاکستانیت محض ایک سیاسی جغرافیائی اصطلاح نہیں بلکہ یہ ایک وسیع تہذیبی نظریاتی معنی بھی رکھتی ہے، جن کا تعلق ہماری مسلم قومیت اور نظریہ پاکستان سے بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے ادب میں پاکستانیت سے وہ مفہوم وابستہ نہیں کیا جا سکتا جو اس کی محض ارضیت پر زور دیتا ہے۔ یہاں یہ مراد نہیں کہ پاکستانی ادیب ارضی وابستگی کے منکر رہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ارضیت میں وہ سپردگی جو ارض کی پرستش کے ذیل میں آتی ہے پاکستانیت کے مفہوم میں شامل نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اگر ارضیت سے مراد ملک کا ارضی و جغرافیائی ماحول، رسم و مناظر، باشندے، رسم و رواج اور تہذیب و معاشرت وغیرہ ہیں تو یہ پاکستانیت کے اہم عناصر ہیں اور اس طور پر اس سے متلازم بھی۔ یہ تمام عناصر ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں افسانہ اور ناول میں کہیں زیادہ مجتمع دیکھے جا سکتے ہیں۔ بالخصوص افسانہ ۔۔۔۔ جس میں موضوعات کا تنوع زیادہ ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے اس میں پیش کیے جانے والے اجزا اور عناصر کو اگر یکجا کیا جائے تو ایک بڑا "کل" ہمارے سامنے متشکل ہوتا ہے، جو ادیب اور افسانہ نگار کے اس احساس اور مشاہدے کا مظہر ہے، جس کے توسط سے ماحول سے اس کی نسبت و تعلق کی

نوعیت اجاگر ہوتی ہے۔

پاکستانیت کے حوالے سے بھی ہمارا افسانہ، دیگر اصناف یہاں تک کہ ناول کے مقابلے میں بھی زیادہ باثروت ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کی جو مکمل اور واضح تصویر ہمیں افسانہ میں نظر آتی ہے وہ دوسری تمام اصناف کے مقابلے میں مثالی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کا ہندوستانی افسانہ اپنے عصری مسائل، اظہار حقائق اور ہندوستانیت کے عناصر کو پیش کرنے میں بھی اسی طرح مثالی رہا۔ پاکستان میں لکھے جانے والے افسانہ کو ورثہ میں یہی صفات ملیں لیکن اب موضوعات، ماحول اور کردار اس کے اپنے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ بھارت میں لکھے جانے والے افسانہ کے ارضی و جغرافیائی ماحول میں متعدد مماثلتیں مل جائیں اور ایسے ماحول کے نتیجے میں ابھرنے والے کردار بھی قدرے یکساں نظر آئیں، لیکن پاکستان میں لکھا جانے والا افسانہ اپنے مخصوص کلچر، نظریہ حیات، طرز فکر اور اپنے ماحول کے رویوں سے وجود میں آنے والے کرداروں کے اعتبار، سے بھارتی افسانے سے کہیں نہ کہیں مختلف ضرور ہے۔ مثلاً فسادات کو دوسری ہجرت، انتظار حسین ہی کہہ سکتے تھے ---- بھارت کے کسی، افسانہ نگار نے شاید فسادات کو اس نقطہ نظر سے نہ دیکھا ہو۔ کرشن چندر اور رامانند ساگر وغیرہ سے قطع نظر کہ جنھوں نے فسادات کے موضوع پر اپنے افسانوں سے ذہنوں کو متوازن کرنے کی غیر فطری کوشش کی یا خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، جو ایسے افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتے رہے جنھوں نے حالات کی تبدیلیوں کو یکساں ماحول کے مشترک کرداروں کے حوالے سے دیکھا یا منٹو، جلیس، قدرت اللہ شہاب جن کی فسادات کے موضوع پر لکھی گئی تحریروں میں فسادات تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان کی کامیابی کا ایک شاخسانہ محسوس ہوتے ہیں ----

فسادات سے قبل آزادی کی جدوجہد مختلف موضوعات اور کردار اور نقاط نظر کے ساتھ اردو افسانوں میں نظر آتی ہے اور تقسیم ہند کے بعد بھی اس کے اثرات اردو افسانوں میں عہد ماضی کی یاد اور اس کے زیر اثر وجود میں آنے والے احساسات سے بنتی بگڑتی زندگی کے متعدد روپ بھی افسانہ میں جھلکتے ہیں، لیکن عنایت اللہ کے افسانہ "ایک پیاز دو روٹیاں" کے حمید کا المیہ شاید بھارت میں تخلیق نہ ہو سکتا۔ یا بعد میں ۱۹۷۱ء کے المیہ مشرقی پاکستان کے نتیجہ میں قیصر قصری کے افسانہ "تھوتھو" کے کردار تھوتھو کی تخلیق کے لیے بھارت یا وہاں کا انھی دنوں کا ماحول کبھی سازگار نہ ہو سکتا تھا۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں پر افسانے بھارت میں بھی لکھے گئے لیکن اول تو یہ جنگیں بھارت میں وہ موثر فضا پیدا نہ کر سکیں جو عمدہ یا بڑے ادب کی تخلیق کے لیے ضروری تھی۔ یہ دونوں جنگیں نظریاتی لحاظ سے اور ذہنی و قلبی کرب و احساس کے نقطہ نظر سے پاکستان اور پاکستانی قوم کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ کیونکہ ان کے پس پشت دو قومی نظریہ کار فرما تھا ---- جب کہ بھارت کے لیے یہ جنگیں محض سیاسی اہمیت کی حامل تھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے جہاں پاکستانیوں کو اس جوش و خروش سے ہمکنار کر دیا تھا، جس کی تصویر انتظار حسین کے افسانہ "سیکنڈ راؤنڈ" میں نظر آتی ہے ---- وہیں ندیم قاسمی کے افسانہ "کپاس کا پھول" کی مائی تاجو کے احساسات کا وہ کفن بھی نظر آتا ہے، جس پر ہندو جارحیت کے نتیجے میں راحتاں کے جسم کا کرب بھی ہے جو اس کفن پر منتقل ہوتا رہا۔ یہ کرب ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستانیوں کے جذبہ و احساس کو کہیں زیادہ متاثر کرنے کا باعث ہوا اور اسی اعتبار سے اس المیہ پر لکھے جانے والے افسانے اپنے احساس و تاثر کے لحاظ سے زیادہ گہرے اور پاکستانیت سے اپنے رشتے کے حوالے سے زیادہ قریب بھی ہیں۔ ان میں پایا جانے والا درد و

احساس پوری قوم کے درد و احساس کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔

ان جنگوں کے بعد لکھے جانے والے افسانوں کا ایک نمایاں رجحان حب الوطنی کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان جنگوں نے افسانہ نگاروں کو ایک ایسے نئے قومی شعور سے آشنا کیا جس نے افسانوں میں ملک و وطن کو در پیش متنوع قومی و معاشرتی مسائل ایک اہم موضوع کی صورت اختیار کر گئے۔ ان جنگوں کے نتیجے میں جو فوری اور شدید احساس انسان کی مسرتوں کے چھن جانے، گھر، معاشرہ اور ملک سے بچھڑ جانے اور انسانی رشتوں کے بے حقیقت ہو جانے کا تھا۔ اپنی اجتماعی شناخت کا رجحان بھی افسانوں میں نظر آنے لگا اور متعدد افسانوں میں ایسے کردار جنم لینے لگے جو اپنے علیحدہ قومی تشخص اور منفرد تہذیبی کردار کی تصویر کشی کرتے ہیں؛ پھر انھی پر آشوب ادوار میں کرداروں کی وہ متضاد نوعیتیں بھی افسانوں میں بالعموم نظر آتی ہیں جو سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے باعث بدلتے بنتے معاشرے میں تعمیر و تخریب کی متنوع صورتیں پیش کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانہ "شہادت" کا وہ، انور عنایت اللہ کے "صلہ شہید" کا میں، نثار زبیری کے "اذان" کا رازی، اگر ایک طرف مثبت قومی کردار کے مظہر ہیں تو دوسری طرف اختر جمال کے "ایک پاکستانی لڑکا" کا استاد، مسعود مفتی کے "اپنے" کا پٹواری، اسی پاکستان میں رہنے بسنے والے کردار ہیں، جو اپنے اپنے طبقے کی خیر و شر کے حوالے سے نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ ایک مستحسن صورت حال ہے جو اب پاکستانی افسانوں میں عام نظر آتی ہے۔ ورنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے قبل، جس نے ہمارے قومی جذبات کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا، افسانہ نگاروں سے یہ توقع ہی کی جاتی تھی کہ وہ اپنے افسانوں میں ایسے مثبت موضوعات اور کردار پیش کریں جو ہمارے تصور حیات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ لیکن تحریک آزادی اور فسادات کے دوران

لکھے جانے والے محض چند افسانوں سے قطع نظر بیشتر افسانے منفی رجحانات پر مشتمل ہوتے تھے اور جو بسا اوقات جنسی تلذذ، قنوطیت، شکست خوردگی اور بے مقصدیت جیسے غیر صحت مند رجحانات پیدا کرتے رہے۔

فسادات اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کا المیہ ہمارے لیے اتنا بڑا حادثہ تھا کہ اس کا ہمارے ادب میں عکس ریز ہونا ناگزیر تھا۔ اس کا ثبوت ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کے المیہ کے حوالے سے لکھے جانے والے افسانوں کی تعداد اور معیار سے بھی ملتا ہے۔ اس المیہ کے نتیجے مین افسانہ نگاروں نے انفرادی اور اجتماعی تجربوں کو اپنے مخصوص سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس منظر میں رکھ کر نئے نئے زاویوں سے اور کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے افسانے ملک میں رونما ہونے والے واقعات، اجتماعی جبر سے انفرادی رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، مصائب و مشکلات میں انسانی امید و بیم کی کیفیات اور نفرت کے ماحول میں پیدا ہونے والے انسانوں کی بربریت کے اظہار سے پر ہیں۔ یہ افسانے تاریخ تو نہیں لیکن تاریخی سچائیوں اور تاریخی عمل سے جنم لینے والے واقعات اور کردار کے رد عمل کے مظہر ہیں۔ مگر ان واقعات اور کرداروں کے جمالیاتی پہلوؤں اور فنی اظہار نے ان کو تاریخ کا حصہ بنا دینے کے بجائے ادب کے ذیل میں شامل کیا ہے۔ المیہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے جانے والے افسانے یوں نشان عبرت بھی ہیں کہ جب انسان پر سے تہذیب کا لبادہ اترتا ہے تو کس طرح اس کے اندر چھپی ہوئی وحشتیں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ افسانے ہمیں یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ ہم اپنی داخلی قوت کو مجتمع کریں، دشمن کے پھیلائے ہوئے جال سے ہوشیار رہیں اور بے مقصدیت، انتشار اور بدگمانی سے بچ کر انسانی رشتوں کو مضبوط کریں۔

"وطن کا قرض" ایسے ہی نمائندہ افسانوں پر مشتمل ہے، جو بنیادی طور پر اپنے موضوعات اپنے مسائل اور کرداروں کے توسط سے پاکستان کی تہذیب و معاشرت، سیاسی نشیب و فراز، المیوں اور امنگوں اور اس کے ارضی و سماوی ماحول کو پیش کرنے میں اپنا حق ادا کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہماری قومی زندگی اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کی مناسبت سے اپنی تمام کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ متنوع صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ اور یہ افسانے کم و بیش ان محرکات و عوامل کا احاطہ بھی کرتے ہیں جن سے ہماری قومی اور تہذیبی زندگی متاثر ہوتی رہی ہے۔ ان افسانوں میں ہمیں اپنے متنوع قومی کردار کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور ارضی رشتوں کی اہمیت اور نوعیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ہم اس میں اپنے عہد ماضی کے ہیجانات بھی دیکھ سکتے ہیں اور یہ اپنے عہد کا آئینہ بھی ہے جس میں مستقبل کے امکانات بھی جھلکتے ہیں۔ ان افسانوں کا مجموعی ماحول تحریک پاکستان سے لے کر ۱۹۷۱ء میں تقسیم پاکستان اور اس کے بعد تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے المیہ نے جس کرب و احساس سے پاکستانی قوم اور معاشرے کو آشنا کیا اور اس سانحے کے جو اثرات ہماری نظریاتی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر مرتسم ہوئے ---- یہ اس مجموعے میں شامل متعدد افسانوں کا موضوع ہیں۔ اس سانحے کے بعد بھی ہماری قومی اور سیاسی زندگی نسبتاً ہمارے قریبی ماضی سے آج تک متعدد عصبیتوں، علاقائی، لسانی اور صوبائی مسائل اور منافرتوں کا شکار ہوتی آئی ہے اور ان دنوں ہمارے معاشرے کا حساس طبقہ اس صورت حال میں جس انتہائی کرب اور یاس کی کیفیتوں سے گزر رہا ہے ---- اس نے ہمارے ادیبوں کے قلب و ذہن کو یوں لگتا ہے ابھی ماؤف کر رکھا ہے۔ چند افسانے ان تازہ مسائل کے نتیجے میں تخلیق بھی ہوئے ہیں، لیکن ابھی غالباً کوئی بڑا افسانہ تخلیق نہیں ہو سکا۔ سکوت کی یہ کیفیت دیرپا

نہیں ہو سکتی' یقیناً وطن کا یہ قرض بھی جلد ادا ہوگا----

ایوان ادبیات' کراچی کے زیر اہتمام قیصر قیصری' نثار زبیری اور نورالعین نوید کے مرتبہ "وطن کا قرض" کا ایک تاثر

علم و ادب کی موجودہ کساد بازاری

پاکستان میں علم و ادب کے فروغ اور ادبی تحقیق کی موجودہ صورت حال اور رفتار بحیثیت مجموعی قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ معاشرتی اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ قوم کی ایسی کاوشوں کو --- جو تخلیق و تحقیق کے ضمن میں آتی ہیں، نہ صرف ملک کی عام ترقیوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا بلکہ انھیں ترقی کے زیادہ بلند مقام پر پہنچنا چاہیے تھا، اس سے قطع نظر کہ ملک معاشی، دفاعی اور سائنسی و تعلیمی ترقی کے کن کن مراحل کو طے کر چکا ہے اور اس کی مجموعی حیثیت و قوت کس قدر قابل اطمینان ہے ----- ہمیں ادب اور تخلیق و تحقیق کی مجموعی صورتحال سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ قوم اور معاشرہ کی مجموعی ترقی اور خوشحالی کا اندازہ ان کے تہذیبی و ثقافتی مظاہر اور ان کی تخلیق و تحقیق کی سطح پر موجود رفتار سے لگایا جا سکتا ہے۔ تہذیب و ثقافت اور ان کے مظاہرے ہمارے ملی و قومی تشخص کی کس قدر عکاسی کرتے ہیں۔ یہ ہمارے ملی ورثہ کے کس قدر امین ہیں یا انھیں کس قدر ملی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے --- اس وقت یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ادبی تخلیق و تحقیق کی سطح پر ہم اس وقت جس صورتحال سے دو چار ہیں اور کساد بازاری

اور بے اطمینانی کی جو کیفیت آج نمایاں ہے---- وہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

تخلیق و تحقیق کے محرکات کا انحصار زیادہ تر لکھنے والے کی ذات پر ہوتا ہے، لیکن ان کی ترقی کے اسباب بالعموم معاشرتی اور اجتماعی ہوتے ہیں۔ تخلیق کار اور محقق کے لیے خوشحالی اور سرپرستی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ متعدد ذرائع سے ہو سکتی ہیں، لیکن حکومت اور علمی و ادبی اداروں کی سرپرستی زیادہ موثر اور قابل عمل ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں خود ادارے بھی مثبت اور موثر طور پر تخلیق و تحقیق کے ارتقا میں محرک ثابت ہوتے ہیں---- اور مناسب معاونت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں نجی طور پر جہاں چند شخصیات نے علم و تحقیق میں گراں بہا خدمات انجام دیں، وہیں بعض علمی و ادبی اداروں نے بلاشبہ تخلیق و تحقیق کی بھرپور تحریک پیدا کی ہے اور معاونت کی قابل تحسین خدمات بھی انجام دی ہیں، لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام اداروں کی کل خدمات ان کے حقیقی مقاصد کے تابع ہیں اور انھوں نے اپنا فریضہ دیانت داری کے ساتھ انجام دیا--- اور ان کی وجہ سے تخلیق و تحقیق کو کماحقہ، فروغ حاصل ہوا۔

تخلیق کی حد تک کہ یہ فرد ہی کی ذہنی اپج کا نتیجہ ہوتی ہے، صورتحال قدرے اطمینان بخش ہے--- اور خصوصاً ادب کے بعض مقبول اصناف مثلاً" غزل، افسانہ اور ناول ----- پڑوسی ملک بھارت کے مقابلہ میں جہاں اردو کی ادبی روایات اسی طرح اپنے پس منظر میں جاری و ساری رہیں جیسے پاکستان میں، لیکن یہ ہمارے ملک میں معیار کی بلندیوں تک پہنچیں۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ دونوں ممالک کے معاشروں میں بھی فرق نمایاں ہوا ہے۔ پاکستان کا معاشرہ انتشار، بحران اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دو چار

ہوتا رہا ہے' ابھی یہاں کی تہذیب ثقافت کا کوئی خاص رخ اس کے معاشرہ کی مناسبت سے متعین نہیں ہو سکا--- جس پر اس کا سفر جاری رہ سکے۔ یہاں تخلیق کو جس انتشار اور بحران کی فضا میں جنم لینا پڑا ہے---- وہ بھارت میں اس صورت میں موجود نہیں ہے۔ عمدہ تخلیق کے لیے انتشار اور بحران کی جو فضا درکار ہوتی ہے وہ پاکستان میں مل جانے کے سبب شاعری' افسانہ' ناول کو پرتاثیر لب و لہجہ اور قلب و ذہن کی صداقتوں کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام تاثر کے مطابق پاکستان میں تخلیق ہونے والا ادب بھارت کے ادب کے مقابلہ میں زیادہ جاذبیت اور اثر رکھتا ہے۔ بھارت کے معاشرہ میں چونکہ ایک عرصہ تک ٹھہراؤ اور استحکام رہا ہے' اس لیے وہاں تخلیق کی بجائے تحقیق نے زیادہ عروج حاصل کیا ہے اور بلند معیار تک پہنچی ہے۔

اس کے باوجود کہ پاکستان کے تخلیقی ادب کی مذکورہ اصناف میں معیاری ارتقاء نظر آتا ہے۔ تخلیقی کاوشوں کا انحصار ذاتی اپج اور فطری میلان ہی پر رہا ہے اور اگر حوصلہ افزائی کی خاطر خواہ اور مناسب روایت موجود ہوتی تو ظاہر ہے کہ یہ ارتقاء مزید بلندی حاصل کر سکتا تھا۔ سرکاری سرپرستی اعانت اور ستائش کی کوئی حوصلہ افزا مثال ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ حکومت اور اب "اکادمی ادبیات پاکستان" کی جانب سے ہر سال کچھ وظائف معمر اور ناآسودہ ادیبوں و شاعروں اور دیگر تخلیق کاروں کو ضرور دے دیئے جاتے ہیں' لیکن ایک تو اس اعانت کا حلقہ بہت محدود ہے اور دوسرے متعدد ضرورت مند اور مستحق افراد ایسی اعانتوں سے ابھی تک محروم ہیں۔ چند اداروں اور انجمنوں کی جانب سے چند انعامات کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے لیکن یہ خاصے تعطل اور تاخیر کا شکار رہتا ہے۔ پھر ان اداروں کی جانب سے انعامات کا اعلان تو

ہو جاتا ہے۔ لیکن کئی کئی سال ان کا اجراء اور فیصلہ نہیں ہوتا۔ لکھنے والوں کی ایک معروف انجمن بھی کئی سالوں سے متعدد ادبی انعامات تقسیم کرتی ہے--- لیکن مبینہ طور پر ان کے تعلق سے ایسی بے قاعدگیوں، گروہ بندی اور اقربا نوازی کی حکائتیں عام ہوئیں کہ لوگوں کا اعتماد مجروح ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اب سنجیدہ مصنفین استحقاق کے باوجود ان انعامات کے حصول کے خواہشمند نظر نہیں آتے اور اب وہ ان انعامات کو اپنے لیے باعث افتخار بھی نہیں سمجھتے۔

مناسب حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے نہ ہونے سے تخلیق سے کہیں زیادہ تحقیق متاثر ہوئی ہے۔ یہ تخلیق کے مقابلہ میں زیادہ جاں کاہی، دقت نظر اور مشقت و جستجو کا مطالبہ کرتی ہے---- اور اس کے لیے زیادہ مدت اور زیادہ وسائل بھی درکار ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہوتی ہے جب ضروری سہولتیں حاصل ہوں اور اس کے مطلوبہ تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ چونکہ اس کے تقاضے تخلیق سے کہیں زیادہ دقت طلب ہوتے ہیں، اس لیے بہت کم افراد اس میں اپنی دلچسپی برقرار رکھ سکتے ہیں اور اپنی کاوشوں کو منظر عام پر لا سکتے ہیں۔ تحقیق کے فروغ کے لیے مناسب سرپرستی کا ہونا ضروری ہے۔ یہ سرپرستی یا تو سرکاری اداروں کے سبب ہو سکتی ہے یا عام ناشرین و تاجر کتب کی علم دوستی کے باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرہ کی تاجرانہ ذہنیت کے پیش نظر تاجران کتب سے تجارتی مفاد اور مالی منفعت کے علاوہ کسی حوصلہ افزائی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ جامعات بھی تحقیق کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ جامعہ پنجاب کی مثال موجود ہے کہ جہاں تحقیقی مجلوں کی اشاعت کا اہتمام بھی ہوتا ہے اور کئی دیگر بلند پایہ عملی و تحقیقی منصوبے اساتذہ اور محققین کے پیش نظر رہتے ہیں۔ لیکن دوسری جامعات---- جبکہ اہل افراد کی ان میں بھی کوئی کمی نہیں، رقوم کی ناکافی

فراہمی کے سبب علمی و تحقیقی منصوبوں کی تکمیل سے قاصر رہتی ہیں۔ یہ صورتحال ان سے منسلک اہل افراد کے لیے نارسائی و مایوسی کا باعث ہوتی ہے اور یوں ان پر سکوت کی کیفیت طاری نظر آتی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن مختلف نوعیت کی عملی سرگرمیوں کی سرپرستی کے عنوان سے کروڑوں روپے کی تقسیم کا بجٹ بناتا ہے، لیکن ابھی تک اسے یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اساتذہ کی ترقی کے قواعد میں ایسی ترمیم کرے کہ جس سے تحقیق، تصنیف و تالیف کے رجحان اور شوق کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس نے اعلیٰ معیار کے علمی جرائد کے اجراء اور اشاعت کے لیے جامعات کو خصوصی رقم فراہم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ہماری سائنس اور ٹیکنالوجی کی وزارت نے بھی معیاری علمی و سائنسی جرائد کے اجراء کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی، بلکہ زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ پی سی ایس آئی آر کے تحت سائنس کا جو علمی جریدہ شائع ہوتا تھا اس کی اشاعت بھی روک دی گئی۔

ایسے ادارے جو حکومت کی ایماء پر قائم ہوتے ہیں یا جن کی اعانت حکومت کرتی ہے، علم و ادب کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ہو سکتے ہیں چنانچہ حکومت نے جو متعدد ادارے علم و ادب کے فروغ کے لیے قائم کئے ہیں وہ اپنے اپنے موضوع اور مقاصد کے تحت فرائض انجام دینے کے پابند ہیں۔ اس قسم کے بعض اداروں نے بعض بڑی قابل قدر اور دقیع خدمات بھی انجام دی ہیں، لیکن کسی ادارے کے بارے میں شاید مشکل ہی سے کہا جا سکے کہ اس نے اپنی ساری مدت میں اپنی کل کارکردگی کو اپنے مقررہ مقاصد کے تحت رکھا ہے اور اس کی مستعدی سے اس کے منصوبوں کا ہدف پورا ہوا ہے۔ متعدد وجوہات ہیں جن کے سبب ادارے اپنے کل مقاصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ ایک تو اداروں کی بدانتظامیاں ہیں، جن سے وہ یا تو مجہول ہو کر رہ جاتے ہیں یا مستعدی

برقرار نہیں رکھ سکتے۔ مالی امداد کی ناکافی فراہمی، اس کے بے محل استعمال اور خرد برد اور ارباب اختیار کی مصلحتوں اور دیگر مفاد پرستوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب ---- جو ایسے اداروں سے کسی طرح کا تعلق رکھتے اور ان سے اپنا مفاد وابستہ کر لیتے ہیں اور اقربا پروری اور دوست نوازی کے سبب، اداروں کا نظم زیر و زبر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح مناسب اور اہل افراد کو بہت کم کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور ایسے ادارے جو تحقیقی کاموں کی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں اور انھیں انجام بھی دے سکتے ہیں لیکن حکومت کی جانب سے سہولتوں کی عدم فراہمی اور مالی رکاوٹوں کے سبب اپنے مقاصد کی تکمیل سے قاصر رہتے ہیں۔

اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اداروں کو ایسے افراد کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو اس کے اہل ہی نہیں ہوتے۔ محض ان کی شہرت اور وابستگیوں کو ان کی تمام اہلیتوں کا حاصل سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ فی زمانہ شہرت زیادہ تر ایسے افراد کے حصہ میں آتی ہے جو رابطہ عامہ کے فن سے کام لیتے ہیں اور شہرت کے ذرائع کو مختلف حربوں سے اپنے حق میں استوار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اوقات مناسب اور اہل افراد کے مقابلہ میں، جن کا انتخاب و حصول کچھ مشکل بھی نہیں، ایسے ہی افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے جو شہرت کے حامل ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے ہی افراد ایک سے زیادہ اداروں کی قسمت کے مالک بھی بنا دیئے جاتے ہیں۔ یہی صورتحال ان کمیٹیوں یا مجلسوں میں بھی نظر آتی ہے جو حکومت گاہے گاہے علم و ادب کے فروغ اور متعلقہ مسائل کے حل کے لیے تشکیل دیتی ہے۔ بلکہ خود ادارے ایسی کمیٹیاں یا مجلسیں وضع کرتے ہیں۔ ایک اور افسوسناک بلکہ تشویشناک صورتحال یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض مفاد پرست افراد اپنے حلقہ اثر اور ذرائع ابلاغ میں اپنے اثر و نفوذ کے

باعث اداروں اور ساتھ ہی ارباب اختیار سے یا تو روابط بڑھا کر یا ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر بلیک میل اور اس طرح استحصال بالجبر کرتے ہیں اور ان اداروں یا ان کی مجلسوں میں شامل ہو کر خود کو اور اپنے حلقوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اداروں کی کارکردگی اور ان سے وابستہ افراد کی اہلیت کو جانچنے اور پرکھنے کا کوئی باقاعدہ طریقہ موجود نہیں۔ مالیاتی امور کی جانچ پڑتا تو شاید ہوتی ہو ---- لیکن کارکردگی اور استعداد کار کو گاہے گاہے پرکھنے اور پھر بازپرس کی کوئی مستقل روایت نظر نہیں آتی۔ کتنے ہی ایسے ادارے ہیں جو غیر متعلق کاموں پر زرکثیر صرف کر دیتے ہیں اور کوئی انھیں ٹوکنے والا نہیں۔ اس صورتحال میں ہم سب پر بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ ہم اس قومی زیاں کو روکیں اور علم و ادب کے فروغ کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور بدعنوانیوں کو دور کریں۔ اس ضمن میں حکومت کے ان متعلقہ افراد پر زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو اس قسم کی صورتحال کے تدارک کے ذمہ دار ہیں اور ایک طرح سے سارے ملک و ملت کی جانب سے علم و ادب اور تخلیق و تحقیق کی ترقی اور اس کے فروغ کے اداروں پر نگراں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چونکہ علم و ادب کے فروغ کا اہم اور موثر ذریعہ سرپرستی اور حوصلہ افزائی کا ہوتا ہے، اس لیے بالخصوص حکومت کو ایسے منصوبے تیار کرنے چاہیں اور مستقل مزاجی کے ساتھ ان کو روبہ عمل بھی لانا چاہئے---- جو تخلیق کاروں، مصنفین اور محققین کی اعانت اور حوصلہ افزائی کے باعث ہوں۔ اور ساتھ ہی ان کی کاوشوں کی مناسب اشاعت کا بندوبست بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ سنجیدہ، باوقار اور گوشہ نشین افراد کی کاوشیں منظر عام پر آتی

رہیں---- اور وہ اپنے مقابلہ میں نااہل افراد کی پذیرائی اور اپنی معیاری کاوشوں کے مقابلہ میں غیر معیاری کاوشوں کی ستائش کو دیکھ کر نارسائی اور محرومی کے مزید شکار نہ رہیں۔ اور پھر اداروں اور ان سے وابستہ اکابر کے احتساب کی کوئی تو روایت قائم ہونی چاہیے تاکہ ادارے تطہیر کے عمل سے گزر کر اپنے مقاصد کماحقہ پورے کر سکیں۔

کیا علم و ادب کی یہ موجود کساد بازاری ایسی غیر اہم ہے کہ اس سے ہم اسی طرح حسب حال صرف نظر کیے رہیں--- اور جو کچھ ہو رہا ہے اسے اسی طرح ہونے دیں، یا جو نہیں ہو رہا ہے، اس کی کوئی جستجو نہ کریں۔

پندار غزل

جناب احساس مراد آبادی نسبتاً گمنام شاعر ہیں۔ ان کی غالباً حد سے سوا نازک طبیعت نے انھیں اشتہار بازی کی دنیا سے بہت دور رکھا ہے۔ جناب احساس کے کلام کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو محض غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خالص غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزلوں میں رچے ہوئے انداز سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں جو فطرت ودیعت ہوئی ہے اس کے لیے غزل کے علاوہ اور کوئی ہیئت سازگار نہیں، چنانچہ "پندار غزل" کی شاعری غزل میں --- اور ان کی غزل خالص روایتی عشقیہ شاعری میں محدود ہے۔ اس کا ایک یقینی سبب جگر کی صحبت کا اثر بھی ہو سکتا ہے، جو انھیں حاصل رہی ہے۔ جناب احساس کی شاعری میں بھی وہی عشقیہ کیفیت، لطافت، سوز، یاس اور گم گشتگی موجود ہے جو جگر یا ان کے مزاج کے دیگر شعراء کے ساتھ مخصوص ہے۔

"پندار غزل" کا نمایاں موضوع عشق ہے جو جناب احساس کے نزدیک محض ایک انجانی کیفیت نہیں، یہ زیادہ تر روایات سے قطع نظر واردات کی کارفرمائی ہے۔ یوں ان کے تجربات، جو شعر کے سانچے میں ڈھلے ہیں، ان کی

آپ بیتی بھی ہیں اور ان کی شاعری ان کی سوانح عمری ہے' جسے شعریت نے رنگین بنا دیا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں عشق کی مجبوریاں بڑی دل نشیں اور اس کی کامیابیاں بڑی پر کیف ہیں۔ جسمانی اور مادی پہلوؤں سے متعلق ہوتے ہوئے بھی وہ ماورائی اور روحانی رفعتوں سے ہم آغوش ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ فرمایئے:

تمہارے در پہ میں پہنچا مگر نہیں معلوم
کہاں پہ دیر سے گزرا کہاں حرم آیا

منزل عشق میں تا حد نظر اے احساس
ایک دیوار تو ہے سایہ دیوار نہیں

سوچتا ہوں جو تو خدا ہوتا
تجھ سے پھر کتنا فاصلہ ہوتا

محبت ایک بحر بیکراں ہے
یہاں پہ دور تک ساحل نہیں ہے

مجھے تو وہ تجلی دیکھنا ہے
تیرے جلوؤں میں جو شامل نہیں ہے

اس عشق میں والہانہ سپردگی بھی ہے اور ایک حد بے نیازی بھی' کیفیت نشاط بھی ہے اور لذت غم بھی۔ یہاں یہ بات مابہ الامتیاز ہے کہ ہر واردات احساس کی تیزی اور تاثیر کی شدت سے شرابور ہے۔ یہ محض لفظ و بیان کی کرشمہ طرازی ہی نہیں' اس میں ایک رفعت ہے' ابتذال نہیں۔ جذبات کی صداقت ہے دماغ کی سیر کوشی نہیں:

حاصل زیست کہ سرمایہ جاں ہوتی ہے

اک نظر جو مری جانب نگراں ہوتی ہے

اے حسن یار اتنی بھی کیا تابش جمال
شک ہو کہ آئینہ میں صداقت نہیں رہی
ہر شے سے اب تو حیرت جلوہ ہے آشکار
اب تم کو آئینہ کی ضرورت نہیں رہی

موسم لالہ و گل، عہد بہار گلشن
یہ کہیں آپ کا انداز تبسم تو نہیں
آئینہ دیکھ کے اب پیار سا آ جاتا ہے
میری صورت سے نمایاں یہ کہیں تم تو نہیں

'حال' و ماورائے حال' کی کیفیت غیرفانی اور اس کی حسیات ابدیت و ازلیت سے ہم آغوش ہیں۔ اس کی کامیابیاں بھی بڑی ناکام سی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یاس، محرومی، غم اور کرب اسی کے نتائج ہیں۔ یوں جناب احساس کے غم میں ایک نشاط ہے اور الم میں ایک کیفیت۔ ان کے ہاں یاس میں امید اور امید میں حسرت ہے۔ یہاں آنسوؤں میں قہقہے بھی ہیں اور مسکراہٹ میں درد و غم۔ الغرض اس عشق کی کیفیتیں متناقض و متنوع سہی مگر اس میں آہنگ ہے اور دلکشی بھی۔ جستہ جستہ یہ چند مثالیں دیکھئے:

تم کیا ملے کہ مل گئیں ساری مسرتیں
اب یہ بتاؤ دیدہ گریاں کو کیا کروں

غم میں بھی انقلاب لائے ہیں
دیکھ کر ان کو مسکرائے ہیں

ہر ایک درد نے جینے کے حوصلے بخشے

بڑے سلیقے سے مجھ تک مذاق غم آیا
عظمت غم کا یہ نشان کم ہے
چہرہ خنداں ہے آب دیدہ ہوں

زندگی اگر ایک مجموعہ حسن و عمل ہے تو اس لحاظ سے یہ ایک کرب مسلسل بھی ہے، اور پھر جس کے حصہ میں حساس طبیعت آئی ہو، اس کی حسرتوں کا شمار کیوں کر ممکن ہے۔ جناب احساس کا المیہ اظہار روایتی نہیں بلکہ آویزش حیات کے مسلسل اور عمیق مشاہدے اور خود ان کی زندگی کے بے حد تلخ تجربات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ زندگی میں یہ تلخیاں واقعات کا اتفاقیہ تسلسل سہی مگر یہ کتنا منظم اتفاق ہے۔ یہ بھی سہی کہ مصائب حیات اتنے روح فرسا نہیں جتنا پیش کیے جاتے ہیں، لیکن جناب احساس کی المیہ شاعری میں صرف ان کے تلخ تجربات نہیں بلکہ انسانی اکثریت کی خستہ و بدنصیب زندگی اپنا اظہار کرتی ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہیں:

پھر اس کے بعد تو احساس رات آ نہ سکی
چھپا ہوا کوئی سورج شب سیاہ میں تھا

احساس کیسے کیسے ہوئی تھی سحر نصیب
پھر آ رہی ہے اب شب ہجراں کو کیا کروں

لذت درد شب ہجر جہاں ہوتی ہے
صبح کو نیند بھی آنکھوں پر گراں ہوتی ہے

سکوت کتنے مراحل کے بعد آتا ہے
وہ مطمئن ہیں مرے لب پر اب فغاں بھی نہیں

لیکن حیات انسانی کی معراج یہ نہیں کہ حالات کے نامساعد انقلابات

اسے اپنے سانچے میں ڈھالتے رہیں۔ انسان کا کمال تو یہ ہے کہ ان حالات میں بھی وہ عظمت انسانی کی بلند مقام سے نیچے کی طرف نظر نہ کرے۔ حالات اور تقاضوں کی اسی کشمکش میں انسان کا جوہر کھلتا ہے۔ غم کی آگ میں تپ کر جناب احساس کی خودی اور جلا پا گئی ہے۔ انسان قضا و قدر کے ہاتھوں جس حد تک بے بس ہے، اس کا اظہار ان اشعار میں موجود ہے۔

تیری نوازشوں نے بکھیرے ہزار گل
لیکن میں اپنی تنگی داماں کو کیا کروں

کن بہاروں کا آفریدہ ہوں
میں کہ جو اب خزاں رسیدہ ہوں
میرا ہونا بھی، ہے نہیں ہونا
میں عبارت ہوں خط کشیدہ ہوں

شاید میں اک عبارت خط شکست ہوں
لوگوں کو جس کے پڑھنے کی عادت نہیں رہی

غزل کے تعلق سے یہ ایک عام بات کہی جاتی ہے کہ اگر غزل میں ایک شعر بھی غیر معمولی نکل آئے تو ساری غزل کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ ادب میں کتنے ہی بڑے غزل گو شعرا نظر آتے ہیں جن کی متعدد غزلوں میں ایک شعر بھی متاثر کرنے والا نہیں ہوتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا کلام تمام و کمال منتخب اور غیر معمولی نہیں ہے۔ جناب احساس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، ان کے ہاں بھی رطب و یابس ہے، ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں تاثر کی کمی ہے، لیکن ایسی بھی غزلیں ہیں جن میں کئی کئی اشعار ایک سراپا ناز کی طرح اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں "پندار

غزل" کی اشاعت کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

منجدھار (افسانے)

منجدھار صادق الخیری کے افسانوں کا ایک خوب صورت اور دیدہ زیب نیا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل افسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب اول میں کل چھ افسانے ہیں اور کتاب دوم میں چھ۔ یہ افسانے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے دوران تخلیق ہوئے تھے۔ کتاب اول اور کتاب دوم کی تقسیم افسانہ نگار کی محض اپنی کوشش ہے، ورنہ موضوعات، فن اور کردار، دونوں حصوں میں ملے جلے اور مشترک ہیں۔

صادق الخیری کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس قریبی عرصے میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی دوڑ میں آگے آگے نظر آ رہے ہیں یہ مجموعہ ان کے دوسرے مجموعوں سے بہت مختلف تو نہیں مگر فنی اعتبار سے خاصا پختہ ہے۔ اب ان کے قلم میں موقلم کی سی باریکی اور نزاکت جھلکنے لگی ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے فنی اعتبار سے ذرا بھی نہیں کھٹکتے بلکہ ان افسانوں کے طرز نگارش میں ایک پختگی اور رچاؤ پیدا ہوا ہے جو یقیناً" ایک دن ان کو ایک ممتاز افسانہ نگار بنا کر رہے گا۔ اس کی مثال میں ان کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھئے:۔

"اباجی نے مڑ کر دیکھا' پالنے میں اس کا پھلر واسا لال ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یک بیک اس کا تنفس تیز ہو گیا اور اس کی آنکھیں میں وحشت ناچنے لگی-----" (حرام زادہ)۔

"کالج جاتے ہوئے بازار میں سے گزرنا پڑتا تھا-----" (حسن راہ گزر)۔

"پاربتی سونا کا سوال سن کر شرما گئی۔ دونوں بہت پرانی سہیلیاں ہیں اور عنقریب ماں بننے والی ہیں----" (پنچھی)۔

"دفعتاً" اس نے اپنے کلی دار پاجامے کے پائنچوں کو ٹخنوں سے اوپر اٹھالیا-----" (منجدھار)۔

یہ تمہیدیں اپنے میں تجسس کی وہ صفات رکھتی ہیں جو ایک اچھے افسانے میں لازمی ہیں۔ ان سے زیر نظر مجموعے کے افسانوں کی فنی پختگی اور دلکشی کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان افسانوں کی ایک اور خصوصیت' ان کے دوسرے افسانوں کی طرح' زبان پر ان کا عبور اور اس کی حلاوت اور شیرینی ہے' جن سے افسانہ نگار بالخصوص متصف ہیں۔ یہ بھی ایک افسانے کی تمہید ہے:۔

"آج خاقان کی باری تھی۔ ہم لوگ آتش دان کے قریب جمع ہو گئے تھے اور صاحب خانہ میوے اور قہوے سے ہماری تواضع کر رہا تھا۔ باہر خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی' اور ہولے ہولے گرنے والی برف کے نرم نرم گالے شاہ بلوط کے سریلے راگ کو مدھم کر رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ سنا چکا تھا۔ اس لیے آج ہم سب کی نظریں خاقان پر جمی ہوئی تھیں۔ قہوے کا آخری گھونٹ لے کر اس نے اپنی کہانی کا آغاز کیا" (تیرنیم

کش)۔

کہانی، منظر اور احساسات کو بیان کرتے ہوئے افسانہ نگار کی گرفت زبان پر کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پائی بلکہ وہ ان باتوں کے اظہار میں زبان کے استعمال پر کلی قدرت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں ان کے ہر افسانے میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ "کنول" سے اس کی چند مثالیں دیکھئے:۔

-----بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک، گویا دیدار محبوب کی جھلک اور دل مجروح کی آہ و بکا تھی------

-----اس کی نظریں آخر شب سہمے ہوئے شگوفوں کی مانند سقف رفعت پسند کی طرف اٹھ گئیں-----

-----کنول سرخاب کی بچھڑی ہوئی مادہ کی مانند مضطرب اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہی تھی۔ کئی کئی راتوں سے اس کا یہی حال تھا۔ گویا ابتدائے شب سے لے کر سحر کے طلوع ہونے تک فراق کی صعوبتیں اسے آتش زیر پا رکھتیں اور آج تو برشگال کی ہنگامہ خیزیوں نے اس کے جذبات خفتہ بیدار کر دیئے تھے----

-----وہ دریچے میں سے چاند کو دیکھنے لگی جو اپنی گولائی چھوڑ کر دوسری ہیئت اختیار کر رہا تھا۔ اے لو، وہ قلب کی صورت میں ڈھل گیا گویا رخ فلک پر خود محبت متشکل ہو کر نمودار ہوئی ہے!

---لیکن اس کے ساتھ ساتھ ندامت اور دکھ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، دبے پاؤں، ہولے ہولے، اس کی طرف بڑھتے آئے!

اس مجموعے میں افسانہ نگار نے شعوری طور پر اپنے موضوعات کو سنگین حقیقت پسندی کے عیب سے بچایا ہے۔ کسی بڑے موضوع پر لکھنے سے پہلے فنی پختگی ضرور آ جانی چاہئے۔ اور اب صادق الخیری سے کسی بڑے موضوع

کی توقع بجا طور پر کی جا سکتی ہے۔ اس مجموعے کے سارے افسانے واقعات کی بنیاد اور وہ بھی زندگی میں روز پیش آنے والے واقعات کی بنیاد پر ترتیب دیئے گئے ہیں۔ افسانہ نگار نے اس میں شامل افسانوں کو زندگی سے اس طرح قریب رکھا ہے کہ ان کو پڑھتے ہوئے سچ مچ کے کردار نظروں میں گھومنے لگتے ہیں۔ افسانہ نگار نے بالکل سامنے کے صاف اور سیدھے موضوعات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ انسان کے محسوسات ایک متنوع انداز میں نظر آنے لگتے ہیں۔ افسانہ نگار کو کہانی لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ بڑے موضوعات کو جگہ نہیں دیتے مگر چھوٹے چھوٹے انسانوں میں انھوں نے اپنے مشاہدے اور زندگی کی قربت کا جس قدر فن کارانہ اظہار کیا ہے---- وہ اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ حقیقت اور کہانی ان کے افسانوں میں ایک ہو جاتی ہے اور یہ چیز بھی آج کل بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ مجموعی طور پر یہ دلچسپ اور متوازن افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اسے بہت سلیقے اور نفاست سے پیش کیا گیا ہے۔

نمود

سحر انصاری آج کے ان جواں فکر شاعروں میں ہیں، جن کی شاعری نے پچھلے چند برسوں میں ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ "نمود" ان کی جدت طبع اور تخلیقی صلاحیتوں کا پہلا اور جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اپنے کلام کے اس مجموعے کے توسط سے وہ ہمیں اجتماعی زندگی پر نظر دوڑاتے اور اسے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہی جان لیوا کام ہے جس کے فن کارانہ اظہار میں آج کے اکثر شعراء ناکام ہیں۔ "نمود" کی تخلیقات میں یا یوں کہیے سحر کی شاعری میں جو خصوصیات انھیں معاصر شعراء سے قدرے الگ اور ممتاز کرتی ہیں، وہ ایک تو ان کی صداقت احساس ہے اور دوسرے ان کا دھیما سنجیدہ اور انفرادی لب و لہجہ ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا ایسا کوئی خاص تنوع نہیں ہے لیکن جن موضوعات کو بھی انھوں نے اپنے احساس میں جگہ دی ہے وہ پہلے ذاتی تجربہ کا جزو بنے ہیں اور پھر احساس کی شدت کیساتھ شعر کے قالب میں ڈھلے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جو اپنی کمیابی کے باوجود صرف سحر سے مختص ہو۔ شاعری میں ذاتی تجربے کی اولیت کے قائل کئی ایک مل جائیں گے اور اس نظریے کو عملی طور پر برتنے والے بھی ہمیں نظر آتے ہیں،

لیکن ان میں اکثر کے ہاں اظہار کا وہ حسن اور لہجہ کی وہ شگفتگی بہت کم ملتی ہے جو سحر کے کلام میں جا بجا موجود ہے۔ موجودہ شاعروں میں کئی ایک کے ہاں ذاتی تجربات پر اصرار بالعموم غیر سماجی داخلیت پسندی، شدید ہیئت پرستی اور ذہنی انتشار کا جواز بن جاتا ہے، لیکن سحر نے اس صداقت احساس اور فنی خلوص کو ایک صحت مند سماجی شعور کا بدل نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے شاعری میں ذاتی تجربے کی اہمیت و انفرادی نقطہ نظر کے قائل ہوتے ہوئے بھی اپنے دور کے سماجی اور اجتماعی مسائل سے گریز نہیں کیا ہے، لیکن ان کے ہاں ہر مسئلے کو محسوس کرنے کی سطح ہمیشہ خالصتاً" سیاسی اور سماجی نہیں ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات میں وہی مسائل ہیں جو سماجی حقیقت نگاری کا ایک خاص تصور رکھنے والوں کو بھی عزیز ہیں۔ لیکن یہ مسائل سحر کے ہاں ایک مختلف سطح پر محسوس ہوتے ہیں اور اپنا پیرایہ اظہار تلاش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سماجی مسائل موضوع بنتے ہیں مگر اس طرح کہ ان موضوعات کے بالواسطہ اظہار کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ ان کی شاعری---- واقعات سے زیادہ تاثرات کی شاعری ہے۔ اور یہ تاثرات اتنے تجریدی بھی نہیں ہیں کہ کسی سماجی اور اجتماعی تناظر سے بالکل کٹ گئے ہوں۔ "نمود" کی حد تک یہ سماجی اور معاشرتی تناظر ان کی نظموں "نسل زیاں گزیدہ" "یوحنا" "میرے خواب" "موہنجو داڑو" "جہان گزراں" اور "دوسرا غم" میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں غم ذات بھی ہے اور غم کائنات بھی۔ اور بعض تخلیقات میں ان دونوں غموں نے ایک دوسرے میں ضم ہو کر ان کی شاعری کو ایک عجیب دردمندانہ کیفیت سے دوچار کر رکھا ہے۔ کہیں کہیں یہ دردمندانہ لہر تیز ہو گئی ہے، لیکن زیادہ تر اس میں ٹھہراؤ، سنجیدگی اور فکر کی کیفیت ملتی ہے:

کمرے میں مرے کون ہے اے خلوت جاں بول

اب کا گل و عارض ہیں نہ افسانہ و نغمات
اب حکمت و دانش ہے نہ شعر و ہنر و رنگ
معمل ہے نہ معبد ہے، نہ آلات، نہ آیات
اک میں ہوں نگارندہ تقویم مہ و سال
اک سوزن ساعت ہے شمارندہ لمحات

"نمود" کا جائزہ ہم اس ماحول کے رشتے سے ہی کر سکتے ہیں، جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں آج کے اجتماعی معاشرے اور فرد کے ذہن کا وہ تمام کرب موجود ہے جس سے موجودہ عہد کا انسان دو چار ہے:-

وہ عہد جس میں ہماری نسل زیاں گزیدہ نے بار پایا
زمین کی آنکھوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا

میں اب بھی کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے ہوں
اور میرے دست و پا میں
مظالم و مصلحت کی کیلیں چبھی ہوئی ہیں

ادھر زمین پہ مقتل کا ہو رہا ہے گماں
فلک نے کھینچ رکھی ہے ادھر کماں دیکھو

وہ گردشیں ہیں کہ چھٹ جائیں خود ہی بات سے بات
یہ زندگی ہو تو کیا ربطہ جاں کسی سے رہے

محسوس کیوں نہ ہو مجھے بیگانگی بہت
میں بھی تو اس دیار میں ہوں اجنبی بہت

ہر نظر پریشاں ہے، ہر نفس ہراساں ہے

ہر خیال ویراں ہے، شہر ہے کہ زنداں ہے

یہ بظاہر سیدھے اشعار ہیں لیکن دراصل یہ اس وسیع و عریض کائنات میں انسانی زندگی اور وجود کے احساس کی علامات ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس مجموعہ میں جابجا ایسے اشعار بکھرے ہوئے ہیں جو حیات و کائنات کے تعلق سے سحر کی فلسفیانہ بصیرت اور آگہی کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں فرد کی ذات اور کائنات بسا اوقات الگ الگ نہ ہو کر ایک ہی تصویر کے دو رخ بن جاتے ہیں۔ اس بصیرت اور آگہی کا اظہار بعض شاعروں کے ہاں کبھی علامتوں کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی استعاروں کے ذریعے، لیکن سحر نے انھیں بڑھے سیدھے سادھے انداز میں بیان کر دیا ہے:۔

میں ہوں اپنا شہود، اپنی نمود
مجھ میں گم ہیں مرے زمان و مکاں

آساں نہیں ہے کشمکش ذات کا سفر
ہے آگہی کے بعد غم آگہی بہت

راز وجود کھل گیا آکے سواد ذات میں
نقطہ تیرگی ہوں میں اپنی تجلیات میں
رنگ سے روشنی جدا حرف سے کیف ماورا
ذات الجھ کے رہ گئی سلسلہ صفات میں

"نمود" کے مطالعے سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سحر نے نہ صرف شاعرانہ خصوصیات کو برقرار رکھا ہے بلکہ ارفع اور اعلیٰ شاعری بھی تخلیق کی ہے اور پھر چوں کہ انھوں نے اپنی شخصیت میں اجتماعی اور انفرادی زندگی کے مطالبات کو ایک دوسرے میں اس طرح مدغم کر لیا ہے کہ اجتماعی

زندگی کے دکھ انفرادی زندگی کے دکھ محسوس ہوتے ہیں اور انفرادی زندگی کی کیفیات و واردات میں اجتماعی زندگی کا تنوع اور رنگا رنگی سموئی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے اس خصوصیت کی وجہ سے سحر کے فن میں ایک تو شدت تاثیر کا وصف ابھر آیا ہے اور دوسرے شعری موضوعات میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ اپنے ماحول اور حیات و کائنات کی متعدد حقیقتوں کے ساتھ ساتھ انسانی محبت کی سرشاری کی صورت میں سحر کی ذات اور شاعرانہ کیفیت کا ایک اور رخ بھی ہمارے سامنے آتا ہے، جو نہایت دلاویز بھی ہے:۔

نہ چاند میں ہے وہ چہرہ نہ سرو میں ہے وہ جسم
گیا وہ شخص تو اس کی شباہتیں بھی گئیں

وہ پاس آئے تو، موضوع گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اسی سے رہے

اپنی بربادیاں بھی میرا ضرر
تیری افسردگی بھی میرا زیاں

محبتوں کے سلیقے مروتوں میں کہاں
جو بات تجھ میں ہے تیری شباہتوں میں کہاں

کچھ کرم ہم پہ برملا تو ہوئے
بندگان خدا، خدا تو ہوئے
دوستوں کی طرح ملے نہ مگر
دوستوں کی طرح جدا تو ہوئے

یہ کس نے پھر میری تحریر سے خطاب کیا

کہ حرف حرف میں انداز رازداں کے ہیں

سحر کا اسلوب صاف ستھرا، واضح اور پر اثر ہے۔ انھوں نے اظہار کے پرپیچ طریقوں سے شعر میں جادو پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی وہ اختصار برائے اختصار کے قائل ہیں۔ وہ شعر کے فن پر پوری طرح قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا ذریعہ اظہار ہر قسم کی کاریگری اور تصنع سے پاک ہے۔ ان کے شعر کی بنیاد چونکہ جذبات اور انسانی رشتوں کے فطری کردار پر رکھی گئی ہے اس لیے وہ غیرضروی تزئین کاری سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا اظہار نہایت نفیس، درد انگیز اور مؤثر ہے۔ اس میں سحر نے روایت اور جدید عصری تقاضوں کے باہمی رچاؤ سے بھرپور کام لیا ہے اور یوں فن کی ایک ایسی روش اختیار کی ہے جو زندگی کے قدرتی ارتقائی عمل کا خاصہ ہے۔ اپنی مجموعی صفات کے سبب "نمود" سادگی اور پرکاری کی انتہائی خوبصورت اور کامیاب مثال ہے۔

مضراب

اقبال عظیم آج کے ان شاعروں میں ہیں جن کی غزلوں کو لوگوں نے سنا اور پسند کیا ہے۔ "مضراب" انھیں کے کلام کے پہلا مجموعہ ہے، جس میں خاصی انفرادیت موجود ہے اور اس اعتبار سے زیادہ قابل توجہ بھی ہے۔ اس مجموعہ کو بڑی حد تک دردناک شاعری کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ شاعر نے رسمی طور پر غم کو شاعری کا موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ غم خود ان کی شاعری کا موضوع بن گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس مجموعے میں متنوع موضوعات کی کمی نظر نہیں آتی۔ یہ شاعری اس قدر ذاتی اور شخصی ہے اور احساسات اور تاثرات کی ایسی حامل ہے کہ اس کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ "مضراب" میں شاعر کی ذاتی زندگی ایک رستے ہوئے ناسور کی طرح بے نقاب ہے۔ عام طور پر ایسی شاعری اپنے وسیع امکانات کو محدود کر دیتی ہے کیونکہ شاعر اپنی ذات کے علاوہ کچھ اور دیکھنے کی سکت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے رشتے خارجی دنیا سے نہیں ملا سکتا۔ لیکن یہاں مضراب میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس مجموعے کا، جس کا بیشتر حصہ مشرقی پاکستان میں تخلیق ہوا، حاوی پہلو اجتماعی اور قومی ہیجانات، حادثات اور ہنگاموں کے زیر اثر نمایاں ہوا ہے۔ کتاب کا انتساب "مرحوم مشرقی پاکستان کے نام" ہے۔ سردیوان یہ انتساب اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ شاعر مشرقی پاکستان کے سقوط اور وہاں سے ہجرت کے احساسات و جذبات

سے کس قدر غمگین و ملول ہو سکتا ہے۔ ان احساسات کی حامل چند غزلوں کے یہ شعر دیکھئے:۔

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا
بے خطا حکم سزا ہو جائے تو ہم کیا کریں

میکدوں میں رند افسردہ ہیں پیمانے اداس
خانقاہوں میں غرور اتقا خاموش ہے

ملک کی اس صورت حال کے اظہار میں احساس کے خلوص اور اظہار کی دیانت بڑی شدومد کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے:۔

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

خود اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی مانگو
پرائے گھر کے چراغوں کا آسرا نہ کرو

اور ہر چیز بدل ڈالی وطن والوں نے
بس غریب الوطنی اپنی جگہ باقی ہے

تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے
بے سبب گردش ایام کو الزام نہ دو

ایک جگہ معاہدہ تاشقند کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

زخموں پہ تاکہ اوروں کی نظریں نہ پڑ سکیں
زخمی بدن سلیقے سے دفنا دیا گیا

جشن شکست ہم نے منایا بالاہتمام
غیرت کو دھوم دھام سے دفنا دیا گیا

ان غزلیات کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعر کے دل کی واردات ہونے کے باوجود دوسروں کے دل کی داستان بھی ہیں۔ شاعر ایک مخصوص معاشرے اور بحرانی دور میں رہ کر جن واردات قلبی سے دوچار ہوا ہے وہ اس دور کے اکثر انسانوں کی روداد بھی معلوم ہوتی ہے۔ غزل کے ہر شعر میں مخصوص جذباتی اور ذاتی تجربات کی کسک موجود ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے یہ درد اور یہ کسک شاعر کے وجود ہی کا ایک حصہ ہے۔ ان غزلوں کے ایک ایک شعر میں جو دل سوزی اور درد مندی ہے وہ دور حاضر کی غزل میں محض گاہے گاہے نظر آتی ہے۔ اس کی چند مثالیں دیکھئے:

اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کیے
زندہ رہنے کے لیے ہم خودکشی کرتے رہے
اس طرح اقبال گزری ہے ہماری زندگی
زہر غم پیتے رہے اور شاعری کرتے رہے

کچھ ایسے زخم بھی ہم دل پہ کھائے بیٹھے ہیں
جو چارہ سازوں کی زد سے بچائے بیٹھے ہیں
نہ جانے کونسا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

شکوہ مرا مزاج نہ ماتم مری سرشت
ہر چند مجھ سے خندہ لبی چھین لی گئی
آخری بار ہنسی آئی تھی کب، یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی اس کی تمنا بھی نہیں
قدرداں کوئی نہیں اس جنس کا بازار میں

یوں تو اشک گرم کو دل کا لہو کہتے ہیں لوگ

ان غزلیات کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں ہر جگہ احساس ذات اور اعتماد نفس کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ان غزلوں کے ذریعہ شاعر نے بڑے یقین، اعتماد اور خلوص سے انسانیت کی ان اقدار پر زور دیا ہے جو دردمندی، مروت، ایثار، احسان اور وضع داری جیسی صفات کی حامل ہیں اور جو ایک اخلاقی اور صحت مند معاشرے کا جوہر بھی ہوتی ہیں۔ شاعر نے بڑی صداقت اور دیانت سے زندگی کی ناہمواریوں، خودغرضیوں اور تلخ حقیقتوں پر پرخلوص تنقید کی ہے جو بڑی متاثر کن ہے:۔

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو اپنا چلن بدلیں
فقط ساقی بدل جانے سے میخانہ نہ بدلے گا
جو ممکن ہو تو سچ مچ کے اجالے ڈھونڈ کر لاؤ
چراغ مضمحل کی ضو سے غم خانہ نہ بدلے گا
کسی گوشے سے کوئی غزنوی اٹھے تو ہم جانیں
بتان خودتراشیدہ سے بت خانہ نہ بدلے گا

سحر نہیں ہے یہ شاید نظر کا دھوکا ہے
چراغ گل نہ کرو تیرگی کا ٹھیک نہیں
نہ جانے کون سی منزل پہ کارواں لٹ جائے
ذرا سنبھل کے چلو زندگی کا ٹھیک نہیں

نقاب پوشوں کو للہ رہنما نہ کرو
خطا کرو مگر اتنی بڑی خطا نہ کرو
جو ہو سکے تو تقاضائے وقت پہچانو

گھروں میں بیٹھ کے اوروں پہ تبصرہ نہ کرو

اس مجموعے کی غزلیات کے مطالعے کے بعد خود اقبال عظیم کی یہ بات صادق آتی ہے، جو انھوں نے مضراب کے مقدمے میں کہی ہے کہ----"میں نے اپنی غزل سے کچھ ایسے کام لینے کی بھی کوشش کی ہے جو عام طور پر غزل کے فرائض میں شامل نہیں سمجھے جاتے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے مجھے اکثر اپنا لہجہ بھی بدلنا پڑا ہے" غزلوں کی ترتیب میں زمانہ حال سے ماضی کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ اس طرح قاری کا ذہن حال کی تلخ حقیقتوں سے شاعر کی حسین یادوں کی لطافت اور رنگینی میں کھو جاتا ہے۔ ایسی غزلیں بڑا حسن اور دل بستگی رکھتی ہیں۔ ان میں تفکر اور کسک ہر جگہ تو موجود نہیں ہے مگر احساس کی شدت قریب قریب ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان میں مسائل نہیں ہیں بلکہ زندگی کا حسن اور اس کی دلکشی موجود ہے۔ اس قسم کی تمام غزلوں میں ایسے خوبصورت اور مناسب الفاظ کا امتزاج ملتا ہے جو رومانی اور لطیف جذبات کی جان ہوتے ہیں۔

غزلیات کے اس حصے میں اس قسم کے اشعار بکثرت ملتے ہیں:-

جب دل پہ گراں گزری ماحول کی خاموشی
بھولی ہوئی یادوں سے ہونے لگی سرگوشی

کتنی بامقصد ہے ان کی ہر نگاہ بے نیاز
دل شکن، پیماں شکن، توبہ شکن، ایماں شکن

آپ کے لطف و عطا نے ہمیں گستاخ کیا
ہم تو واقف بھی نہ تھے چشم و کرم سے پہلے

نشتر سا اتر جاوے ہے سینے میں ہمارے
جب ماتھے پہ بل ڈال کے تم بات کرو ہو

نہ جانے کونسی منزل ہے یہ محبت کی
نہ پرششیں نہ تخاطب نہ گفتگو نہ سلام

اک نگاہ پر تکلف' سو خطابوں کا خطاب
ایک زیر لب تبسم' سو جوابوں کا جواب

کتاب کی ابتداء میں پروفیسر وقار عظیم کا ایک مختصر لیکن جامع اجازت نامہ بطور دیباچہ اور اقبال عظیم کا خود نوشت مقدمہ ہے۔ جس میں شاعر نے اپنی زندگی کے مختصر حالات' اپنی شاعری کے رجحانات' نظریات اور موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ دیباچہ اور مقدمہ دونوں ان کے فن اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اور یہ پتہ چلتا ہے کہ "مضراب" دراصل اقبال عظیم کی شاعری کا ایک جامع اور حسین انتخاب ہے۔ ایک ایسا انتخاب جس کے ذریعہ انھوں نے غزل میں ایک خاص انداز اور مقام پیدا کر لیا ہے حال میں ہمارے شعری ادب میں ناصر کاظمی کے "دیوان" حفیظ ہوشیارپوری کے "مقام غزل" سے جو اضافے ہوئے ہیں "مضراب" اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بلکہ اس کو ایک لحاظ سے ان پر فوقیت بھی حاصل ہے اور یہ اس قابل ہے کہ اسے شاعری کا قابل قدر مجموعہ سمجھ کر پڑھا جائے اور تحفے میں دیا جائے۔

نظمانے

محسن بھوپالی موجودہ عہد کے معروف اور مقبول شاعر ہیں۔ بعض ادبی حلقوں میں تو ان کی ادبی مقبولیت اس حد تک ہے کہ ان کے بعض مصرعے، اشعار اور قطعات زبان زد عام و خاص ہیں، لیکن طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ انھیں موقع بہ موقع اپنی زبانوں سے ادا کرتے وقت بہت سے یہ نہیں جانتے کہ یہ ---- محسن کے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے "شکست شب" اور "جستہ جستہ" اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں کے ذریعے سے وہ اب تک ہمارے سامنے ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ابھرے ہیں جو اپنے ماحول کی عام اور سیاسی زندگی کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور پھر ان میں وہ ماحول کی کلفتوں اور زندگی کی دقتوں کو بڑی حوصلہ مندی اور کدوکاوش سے برتتا ہے۔ اپنی شاعری میں محسن نے کرب ذات کی مصنوعی وارداتیں طاری نہیں کی ہیں بلکہ بیان کی دلکشی اور نت نئے مضامین کی تلاش ان کے ہاں زندگی کے نشیب و فراز کے توسط سے آئی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا بیانیہ انداز اور اس میں واقعات کی اثر پذیری اسی سبب سے ہے۔ زیر نظر مجموعہ ان کے ایک اور شعری تجربے اور واقعات کی مزید اثر پذیری کا اظہار کرتا ہے۔ محسن نے قطعات اس سے قبل

بھی لکھے ہیں، بلکہ "جستہ جستہ" ان کے قطعات ہی کا مجموعہ ہے، اب وہ اس سے بڑھ کر "نظمانے" کے ذریعے اشاروں اور علامتوں کی مدد سے مختصر مختصر کہانیاں یا منظوم افسانے سنانے آئے ہیں۔

محسن کے ان نظمانوں میں اسلوب بیان اور شعری محاسن کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ پر اثر اور توجہ کے قابل ان کے طنز و تنقید کا انداز ہے۔ اپنے نظمانوں کے تناظر میں محسن نے زندگی کے تنوع کی متعدد جھلکیاں بڑی خوبی سے سموئی ہیں۔ ان نظمانوں میں سے بیشتر ہمارے اطراف کی سماجی اور تہذیبی اور سیاسی زندگی کا اظہار ہیں۔ بعض نظمانے ہمارے عہد کے متنوع واقعات اور ان کے تاثرات پر مشتمل ہیں:۔

دست شناسی

دندناتی بس،
لہو میں تر بتر---اک جواں لاش
سڑک پر چھوڑ کر
تیزی سے آگے بڑھ گئی
محو حیرت رہ گیا میں دیکھ کر
لاش کی ٹھنڈی کلائی کے قریب
ہنس رہی تھی عمر کی لمبی لکیر!

شدت احساس محسن کے بیشتر نظمانوں میں ہے۔ ان کے اکثر نظمانے کہانی کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ ان میں پیش کیے جانے والے سارے موضوعات ہماری مانوس زندگی کی مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں، جو کہیں تو چونکا دیتی ہیں اور کہیں یاس کی کیفیت کو مزید گہرا کر دیتی ہیں۔ ان تصویروں میں

ہمیں اپنے ہی ماحول کی متعدد صورتیں نظر آتی ہیں، جن سے ہم پہلے سے واقف ہیں لیکن یہ ہمیں بعد کی کیفیات میں گم کر دیتی ہیں اور ذہن اس مسئلے پر سوچنے لگتا ہے۔ "پھیری والا" اس کیفیت کی ایک عمدہ مثال ہے:

بیگم پچھلے ہفتے سے
شام کے پھیری والوں میں
"لے سانچی پان ہرے" کی
کم ہے اک آواز!
اس آواز کو اپنے کان اب ترسیں گے
میں بتانا بھول گئی
اس کا بیٹا---- باقی پیسے کل ہی لینے آیا تھا

نظمانوں کے مطالعے سے یہ ایک تاثر عام ہوتا ہے کہ محسن نے ان میں اپنے ماحول کی زندگی کے زیادہ تر وہ مناظر پیش کیے ہیں جن کے پس پشت ایک نہایت تاریک اور منفی پس منظر ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے غالباً M محسن نے معاشرے کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہا ہے تاکہ ہم زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کو ان کے اصل تناظر میں دیکھیں:

کالج الیکشن

اس کے معصوم دل کو
خبر ہی کہاں تھی
کہ اس کے مخالف کے ڈورے
ہیں کس ہاتھ میں!
ایک دھچکا لگا

ذہن چکرا گیا

دوسرے روز جب
جیتنے والے ساتھی کے نام
سربراہ جماعت کا تار آگیا

زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی نظمانے' بعض خوبصورت اور مفید تجربات کے زیر اثر ہیں۔ محسن نے نظمانوں کے لیے عام بول چال کی وہ زبان اختیار کی ہے جو مروجہ ہے۔ شعری تراکیب اور اضافتیں جو عام شاعری کا خاصہ ہیں' ان میں نظر نہیں آتیں۔ بلکہ ان میں محسن نے ایک نہایت کامیاب تجربہ یہ کیا ہے کہ انھوں نے نظمانوں میں عام بول چال کی زبان سے شعریت پیدا کی ہے۔ یہ ان نظمانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ اپنے موضوعات' اسلوب بیان اور گردوپیش کی زندگی کی متنوع تصویروں کے لحاظ سے "نظمانے" ایک تجربے کے ساتھ ساتھ شاعری کی نئی جہات کا ایک امکان بھی ہے۔

کاکولیات

زیرِ نظر تصنیف پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول میں زیرِ تربیت ایک " جنٹلمین کیڈٹ" کی آپ بیتی ہے۔ اردو کے وسیع اور عریض میدان ادب میں کیپٹن صولت رضا اپنی آپ بیتی کے توسط سے ایک دلچسپ اضافہ ہیں۔ ان سے قبل فوج سے مستقبل وابستہ بعض معروف اور مقبول ادیب و شاعر اپنی اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کی تاریخ میں نہ صرف اپنے ناموں کے اضافے کا موجب ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے موضوعات کے تنوع میں خاصہ حسین اور دلچسپ اضافہ کیا ہے۔ دلچسپ اس اعتبار سے کہ ان فوجی ادیبوں اور شاعروں نے بالخصوص اردو کے فکاہیہ اور مزاحیہ ادب میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں جو پرلطف بھی ہیں اور نہایت مقبول بھی۔ اس کی وجہ درحقیقت نفسیاتی ہے۔ وہ اپنے پیش نظر "وسیع میدانوں" میں رہتے ہوئے اپنے "محدود" ماحول کی یک رنگی میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے تصورات اور تخیلات کی ایک رنگا رنگ دنیا تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کھوئے رہنے سے انھیں وہ تمام کیف و انبساط حاصل ہو جاتا ہے، جو عام حالتوں میں انھیں میسر نہیں۔ اس اعتبار سے ضمیر جعفری کی ہلکی پھلکی نثر اور ظریفانہ شاعری ہمیں متعدد سربز"

جزیروں" کی سیر کراتی ہے۔ شفیق الرحمان کے مزاح کی "لہریں" پڑھنے والوں کو نت نئے "مدوجزر" سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ کرنل محمد خاں بھی ہمیشہ مزاح کا ایک خاص انداز لئے ہوئے ہیں۔ میجر صدیق سالک کچھ ہی دن پہلے اپنی دلچسپ سرگزشت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ اب اس فہرست میں، جس میں مزید ناموں کی نشاندہی ہو سکتی ہے، صولت رضا اپنی پر لطف آپ بیتی کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔

اس آپ بیتی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام سیالکوٹ کے محاذ کی ایک "میس" میں۔ مصنف کے ذہن میں اس آپ بیتی کی تخلیق کا خیال اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ "سیکنڈ لیفٹنٹ" تھے۔ لیکن لکھا انہوں نے اس وقت جب وہ لیفٹنٹ بن چکے تھے اور اس کی تکمیل اس وقت عمل میں آئی ہے جب وہ کیپٹن ہیں۔ یہ آپ بیتی کئی اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہے۔ مصنف نے ہمیں نہایت شگفتہ و شائستہ طریقے سے اس میں "دور از نگاہ" دنیا کی سیر کرائی ہے، "کاکول" نوارد فوجیوں کی تربیت گاہ ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے جو مراحل طے کرنے ہوتے ہیں انھیں مصنف نے نہایت دلکش اور پرلطف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہاں کی زیر تربیت زندگی تمام ضروری جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ قاری کے پیش نظر آجاتی ہے۔ کہیں کہیں تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں، لیکن دراصل خود مصنف کا انداز تحریر، طرز بیان اور مشاہدہ کسی طرح بھی تصویر کشی سے کم نہیں۔ وہاں کی زندگی بظاہر جتنی مشینی، اصولی اور بندھی ٹکی ہے، وہ اس سرگزشت میں اتنی ہی دلکش، دلچسپ اور پرلطف ہو جاتی ہے۔ یہ فی الحقیقت مصنف کا کمال تحریر اور طرز بیان ہے۔

اسلوب تحریر اور زبان و بیان کی خوبیاں اس تصنیف کا نمایاں اور

امتیازی وصف ہے۔ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو بیان کرنے کے لیے مصنف نے نہایت پرکشش زبان استعمال کی ہے۔ متعدد مقامات پر دلکش تراکیب اور پرمزاج بندش الفاظ سے بھی کام لیا گیا ہے "صراط کمیشن"، "دل شکن اوقات"، "خاموش گو" ایسی اختراعی کوششوں میں سے چند ہیں۔ مصنف کا مذاق بھی خاصا ستھرا اور شائستہ ہے۔ یہ کتاب میں متعدد جگہوں پر بے ساختہ انداز بیان، اشعار کے استعمال اور برمحل جملوں میں خاص طور پر جھلکتا ہے۔

اپنی مجموعی خوبیوں کے سبب "کاکولیات" مزاحیہ اسلوب نگارش میں ایک دلچسپ اضافہ ہے۔

بلوچی ادب

گزشتہ قریبی عرصے میں بلوچستان کی تاریخ و تہذیب اور زبان و ادب پر متعدد موقر اور معلومات افزا تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں اس موضوع پر بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت بڑی تحقیق و جانفشانی سے ترتیب و تصنیف کی روایت تقریباً" سوا سو سال کے عرصے پر محیط ہے' جب کہ اردو میں یہ کوششیں اپنی صحت مند بنیادوں پر اس کے ساتھ ساتھ جاری ہیں۔ لیکن زیادہ تر انفرادی سطح پر روبہ عمل آنے کے سبب یہ زیادہ عام نہیں ہوئیں۔ تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کی تاریخ و تہذیب کے مطالعے کی جانب زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ اور اب بعض نام اس سلسلے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں جو بڑی تلاش و تحقیق کے بعد بلوچستان کی زبان و ادب کے شاہکاروں کو عام علمی دنیا سے متعارف کرا رہے ہیں اور وہاں کی تاریخ' سیاست' تہذیب اور معاشرت کی ضروری معلومات یکجا کر رہے ہیں۔ کامل القادری کا نام اپنی کاوشوں کے سبب نیا نہیں۔ اس تعلق سے ان کی کتاب "بلوچی ادب کا مطالعہ" حالیہ کوشش ہے' جو منظر عام پر آئی ہے۔ اس سے قبل "بلوچ قبائل"' "قدیم بلوچستان"' "براہوی کہاوتیں" اور

"گائے جا بلوچستان" کے ذریعے کامل القادری علمی دنیا سے متعارف ہوئے ہیں۔ انھوں نے محض بلوچستان کی تاریخ و معاشرت ہی کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ بلوچی ادب کے تراجم بھی پیش کیے ہیں۔

"بلوچی ادب کا مطالعہ" کامل القادری کی اس اعتبار سے زیادہ اہم اور معلومات افزا کتاب ہے کہ اس سے نہ صرف بلوچی ادب بلکہ بلوچی تاریخ، معاشرت اور تہذیب کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں انھوں نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد بلوچستان کے جغرافیائی اور تاریخی حالات ترتیب دیئے ہیں اور بلوچستان کی زبان کا خاصہ تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ بلوچی ادب کے مطالعے کے ضمن میں انھوں نے کسی ضروری پہلو کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ بلوچی زبان کے ادبی سرمائے کے جائزے اور مطالعے پر مشتمل ہے، بلکہ اس حصے کو بلوچی ادب کا تاریخی مطالعہ بھی کہا جا سکتا ہے یہ مطالعہ و جائزہ صنف وار ہے۔ اس میں عشقیہ داستانوں کا تعارف بھی تحریر کیا گیا ہے اور خلاصہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ لوک گیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی اقسام بیان کی گئی ہیں، پھر عشقیہ اور رزمیہ داستانوں کی خصوصیات اور ان کے تاریخی پس منظر کا تحقیقی اور تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

کامل القادری کا یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے کہ انھوں نے بلوچی ادب کے اس سرمائے کو جمع کیا ہے اور اسے متعارف کرایا ہے جو ابھی تک محض سینوں میں مدفون رہا ہے۔ اس کام کے لیے یقیناً انھوں نے بڑی وقت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔ اس کی ایک بڑی افادیت یہ بھی ہے کہ اس میں جن شعراء کے کلام کے تراجم پیش کیے گئے ہیں، ان شعراء کی سوانح اور ان کے کلام کے بارے میں تنقیدی رائے بھی دی گئی ہے۔ اس طرح "بلوچی ادب کا مطالعہ" بیک وقت بلوچی ادب کی تاریخ بھی ہے اور اس کے ادبی سرمائے کا

مفید انتخاب بھی۔ یہ اپنی ترتیب و تالیف، تحقیق و کاوش، تراجم اور افادیت کے لحاظ سے معلومات افزا ہے۔

حرف حرف تیشہ

غزل میں تہذیبی و ذاتی شعور و احساس کی دلفریبیاں اور رعنائیاں جس طرح بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ کیف و آہنگ پیدا کر رہی ہیں' اس کا احساس چند جدید غزل گو شعرا کے ساتھ ساتھ خمار انصاری کی غزلوں کے مطالعے سے بھی ہوتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ ان کی غزلیات اور قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں شاعر کے جذبے کی وہ شدتیں اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں جنھیں جدید غزل کی روح کہا جاتا ہے خمار انصاری اپنی غزلوں میں جذبے و فکر کی آمیزش اور مشاہدے و تجربے کی گرفت رکھتے ہیں ان میں جدت بھی ہے اور روایت بھی۔ جدید غزل اپنے دور کے تجربات کا آئینہ ہے۔ ہر جدید غزل گو اس آئینے میں اپنے گرد و پیش کا عکس اجاگر کرتا ہے۔ اس عکس میں اپنے زخم نمایاں کرتا ہے--- ان کے اسباب کا پتہ لگاتا ہے' اور انھیں اسباب کے وسیلے سے اپنے رفیقوں اور اپنے ماحول سے اپنی جدائی یا ہمنوائی کی توجیہہ کرتا ہے۔ اس عمل میں بعض غزل گو اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ تلخیوں' مایوسیوں اور اعتراضات کے اظہار میں سب کا انداز نظر مشابہت تو رکھتا ہے مگر طرز عمل مختلف ہوتا ہے۔ خمار انصاری بھی اپنے طرز

فکر میں کئی جدید غزل گو شاعروں سے الگ تھلگ ہیں۔ ان کے تخیل اور اظہار کے پس منظر میں محسوسات کا وہی شعور ہے جو ایمائیت کی انتہا ہے۔ انھوں نے زمانے کے گرم و سرد سے ایک قدرے کم آمیز تعلق رکھ کر اپنے خاص رنگ کو شدت احساس کا لہو دے کر شعروں کے رگوں میں دوڑایا ہے۔ اور اس کی مختلف صورتیں ہیں:

اشکوں کی قیمت ہی کیا ہے
جھوٹے موتی ٹوٹے تارے

دل کی حالت دل کا عالم
خانہ ویران شہر خموشاں

لگائے بیٹھے ہیں سینے سے یوں غم ہستی
کہ عشرتوں کی کوئی یادگار ہو جیسے

یوں دشت غم کی دھوپ میں کب تک جلا کریں
سائے کے واسطے کوئی دیوار بھی تو ہو

ہم کس زباں میں اپنی کہانی رقم کریں
اظہار درد کے لیے کوئی زبان نہیں

اک خواہش بے نام ہے اک جذبہ بے ربط
یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا مانگ رہے ہیں

ہم پر نہیں ہے ختم یہ طوفان دارو گیر
کس کس کو کاٹنا ہے ہماری سزا ابھی

خمار انصاری کے طبعی رجحانات ان کے شعری اظہار کو گفتگو کا ایک

مخصوص اور اچھوتا ڈھنگ بھی سکھاتے ہیں۔ ان کے اظہار میں الفاظ کی معنویت بھی بڑی مخصوص ہے اور اس میں کہنے کی لگن بھی بڑی شدید ہے۔ اظہار کی وقتوں کا تذکرہ بھی وہ بڑی سچائی اور ہنرمندی سے کرتے ہیں:

یہ تجربہ ہوا تخلیق فن کی منزل میں
کسی خیال کا اظہار کتنا مشکل ہے

گرفت فن میں نہ آئی خیال کی تصویر
بہت سے رنگ تھے جو پردہ سخن میں رہے

لفظ جب تک زینت فرہنگ تھا کچھ بھی نہ تھا
فن کی حد میں لفظ کی وسعت کا اندازہ ہوا

گندم نما

زیر نظر تصنیف مزاحیہ اور طنزیہ انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف عصمت اللہ خاں کراچی کے ایک مقامی کالج میں ادب کے استاد ہیں۔ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کا مشغلہ خاصہ پرانا ہے، لیکن شہرت کی دنیا سے وہ کنارہ کش رہے ہیں۔ دوسرے مزاح نگاروں کی طرح ان کی شخصیت میں بھی ایک مشترک پہلو ان کی سنجیدگی اور گوشہ گیری کی فطرت ہے۔ خود خاموش اور سنجیدہ رہتے ہیں۔ ہمیشہ بظاہر خاموش، گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے لیکن اندر سے طبیعت بڑی شگفتہ اور تروتازہ ہے اور دوسروں کو ہنسانے اور خوش کرنے کا کوئی موقع ترک نہیں کرتے۔ ان کی شخصیت کے یہ پہلو ان کی تحریروں میں بھی اپنا اظہار کر رہے ہیں۔ موضوعات اور مضامین کے اعتبار سے اس مجموعے کا نام "گندم نما" بڑا معنی خیز ہے اور سرورق پر مصنف کا کارٹون بھی اسی معنی خیزی کا مظہر ہے۔ مجموعی طور پر اس میں نو مضامین ہیں، جنھیں مصنف نے اپنے موضوعات کے لحاظ سے طنزاوے، مزاحیے، خاکیچے کہا ہے۔

مصنف نے ان انشائیوں اور خاکوں کے لیے مواد اپنے گرد و پیش کی دنیا سے اخذ کیا ہے۔ ان میں زندگی کے موجودہ مسائل بھی سمٹے ہوئے ہیں اور

موجودہ تہذیب کی دو رنگی پر بڑے سلیقے سے طنز بھی کیا گیا ہے۔ دور حاضر میں زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار اور ان کے مضحک پہلوؤں پر انھوں نے بھرپور انداز سے طنز کیے ہیں۔ ان میں زندگی اور اس کے تمام اتار چڑھاؤ سمٹ آئے ہیں' جنھیں مصنف نے اپنے تجربات اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر قاری نہ طنز کی تلخی سے مکدر ہوتا ہے اور نہ ان کے پر لطف جملوں پر قہقہہ لگاتا ہے۔ بلکہ محض مسکرا دیتا ہے۔ یہ کیفیت اس مجموعے کے ہر مضمون میں موجود ہے۔ اس کا نمایاں سبب ان مضامین کا انداز بیان اور اسلوب تحریر ہے۔ اسلوب کی شگفتگی اور بے ساختگی میں ایک کامیاب اور معیاری مزاح نگار کے آثار موجود ہیں۔ "گندم نما" فی الحقیقت اردو کے طنز و مزاح میں ایک دلکش اضافہ ہے۔

تاریخ اور کائنات ---- میرا نظریہ

کائنات کا کلی و جزوی وجود اور تاریخ کا تعین اور اس کی فکری تدوین ہمیشہ سے انسان کا موضوع فکر رہا ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بہر حال مسلم ہے کہ کائنات جو کچھ بھی ہے، تاریخ اس کا حصہ ہے۔ یعنی ہر چیز دراصل تاریخ ہے۔ پیش نظر تصنیف بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت موضوع سے متعلق مختلف توضیحات و تشریحات کے اظہار پر مشتمل ہے اور فی الحقیقت اظہار اور نظریے کی عینیت نے اسے ایک وحدت بنا دیا ہے۔ اس لیے اس کے قارئین اس میں--- بعض مستثنیات مباحث سے قطع نظر--- ایک معنوی ربط اور عینی ترتیب محسوس کریں گے۔

مصنف نے اس تصنیف میں بڑے اعتماد اور خوش اسلوبی سے تاریخ کے سوال پر اپنے مخصوص نظریے کو پیش کیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس میں کن دلائل کے سہارے اپنے نظریے کا تعین کیا گیا ہے؟ اس نظریے کی صحت اور معقولیت کس حد تک قابل قبول ہے؟ اور یہ کہ مصنف کے اخذ کردہ نتائج کہاں تک اثر انداز ہوں گے؟ یہ بڑی جرات آمیز کوشش ہے کہ مصنف نے اپنے طور پر بڑے بڑے نامور مفکرین تاریخ کے نظریات کا استرداد کیا ہے اور

اپنے اٹھائے ہوئے سوالات کے ضمن میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

فلسفہ تاریخ کے سلسلے میں کئی نظریات تشکیل دیے گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ عام اور معروف نظریات کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جو مختلف قوموں کا الگ الگ اکائیوں کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی موت سے ان کے نظریات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان کے خیال میں نظریات بھی کسی خاص قوم کی میراث ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بجائے اقدام کے تہذیبوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر ہر تہذیب کو ایک فرد کی زندگی پر قیاس کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ وہ بھی انھیں منازل میں سے گزرتی ہیں، جن میں سے عام انسان گزرتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ہیگل اور مارکس کی پیروی میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ تاریخ یا کائنات ایک مسلسل منطقی مجادلہ ہے، جہاں اضداد کے ظہور، تصادم اور امتزاج سے ہی انسانیت کا ارتقا ہو رہا ہے۔ مصنف نے زیرِ نظر تصنیف میں تاریخ کی فکری تدوین کے بارے میں ان نظریات کو بطور مثال دہرایا ہے۔ اگسٹ کومٹے کے نظریے پر مصنف کی تنقید اس واقعی دلیل پر ہے کہ اس نے ماضی کے ادوار کو انسانی عمر کی طرح مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، جب کہ جدید انداز نظر حال کے جغرافیائی ٹکڑوں کو مختلف خانوں میں بانٹ کر سوچتا ہے۔ اشپنگلر نے تاریخی اضافیت کے سہارے اپنے نظریے کا تعین اس طرح کیا تھا کہ زمان جب سماجی خول اوڑھ کر آگے بڑھتا رہا تو وہ مختلف منزلوں پر ٹھہرتا چلا گیا جس سے مختلف تہذیبی نمونے پیدا ہوئے۔ اس نظریے پر مصنف کی تنقید یہ ہے کہ تاریخ --- زمان کے سماجی بہاؤ کا نام ہے، یہ سماجی بہاؤ زمان کے ساتھ چلتا ہے اور زمان کسی منزل پر ٹھہرتا نہیں۔ مصنف کے خیال میں تاریخ کے بارے میں دراصل صرف دو نظریے ہی ممکن ہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ ایک ارتقائی عمل ہے اور دس

ہزار سال کا یہ سارا فکری عرصہ پستی سے ترقی کی طرف ایک مسلسل رفتار، ایک متواتر دوڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا نظریہ تاریخی اضافیت کا نظریہ ہے، جس کے تحت ارتقاء کا تصور تاریخ پر اطلاق نہیں رکھتا۔ ہر تمدن اپنی جگہ ایک خود مختار اکائی ہے۔ وہ کسی پستی کے ارتقا بن جانے سے عبارت نہیں ہے، وہ بجائے خود ایک کائنات ہے۔ اس لیے انسانی نسل کے خط مستقیم پر ارتقاء کا تصور--- مصنف کے خیال میں--- کوئی بنیاد نہیں رکھتا۔ اشپنگلر نے جس نقطے پر بنیادی غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے زمان کے اس کردار کو نظرانداز کر دیا جو وہ ماضی سے مستقبل کی طرف حرکت کے دوران سماجی زندگی میں انجام دیتا ہے۔ مصنف کے خیال میں اشپنگلر کی اضافیت کی طرح دوسرے وہ نظریے بھی جو مختلف تہذیبی نمونوں کو غیر متعلق کائناتوں میں منقسم خیال کرتے ہیں، صحت پر مبنی نہیں۔ اس لیے کہ وہ ان جدا جدا تہذیبی کائناتوں میں کوئی مشترک رشتہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہ مشترک رشتہ وہی زمان ہے، جس کا بہاؤ تاریخ اور تہذیب کے بہاؤ میں گزرتا ہوا اپنی حیثیت باقی رکھتا ہے۔ تاریخ کے ان معروف نظریوں کے بالمقابل مصنف نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ کو سمجھنے کا صحیح تصور نہ خط مستقیم میں تہذیبوں کی حرکت کا تصور ہے، نہ جدا جدا دائروں میں گھومنے والے سماجی نظاموں کا تصور (جیسا کہ ٹائن بی کا خیال ہے)۔ ان کے لیے یہ ایک ایسا تصور ہے، جس میں مختلف سماج اپنی اپنی انفرادی حرکت دوری رکھتے ہیں مگر ان میں سے بعض ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہے، جس سے تاریخ کا سفر آگے بڑھتا رہا۔ مصنف کے خیال میں تاریخ کو اس طرح دوری اور مستقیمی انداز میں سمجھا جائے تو اس تاریخی روح کا حق ادا ہو سکے گا جو نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی خط مستقیم کی حرکت باقی رکھتی ہے۔ دوری اور مستقیبی حرکت کا یہ اصول، جس کا اطلاق مصنف تاریخ پر کرنا

چاہتے ہیں، ان کے خیال میں صرف سماج کی حرکت پر ہی اطلاق نہیں رکھتا، فرد کی زندگی پر بھی اطلاق رکھتا ہے۔

اپنے نظریے کی توضیح و تشریح کے لیے مصنف نے خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس کے لیے زبان بھی ایسی اختیار کی ہے کہ جو قارئین فلسفے سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں تب بھی اسے خوب سمجھتے ہیں۔ بعض مقامات پر لسانی اختراعات بھی نظر آتی ہیں، جس سے ادائے مطلب تو ہوتا ہے لیکن مطالعے پر بار گزرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مصنف کی کوشش لائق ستائش ہے کہ انھوں نے اردو میں ایک نہایت دلچسپ، مفید اور ضروری موضوع پر اظہار خیال کیا ہے جس کے نتیجے میں بات سے بات پیدا ہونے کے خاصے امکانات ہیں۔

تحقیق

پاکستان میں اردو تحقیق

جائزہ ' مسائل اور تجاویز

قیام پاکستان کے وقت تک اردو تحقیق مولوی عبدالحق ' حافظ محمود شیرانی' مولوی محمد شفیع' قاضی عبدالودود ' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی' ڈاکٹر محی الدین قادری زور' سید نصیر الدین ہاشمی ' ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عندلیب شادانی وغیرہ کی تحقیقات کی صورت میں ارتقا پذیر تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ان میں سے بیشتر بزرگوں کی قائم کی ہوئی روایتیں پاکستان میں برقرار رہیں اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان کو فروغ بھی حاصل ہوا' لیکن قیام پاکستان کے بعد چند برسوں تک تحقیق کا سلسلہ ایک حد تک منتشر رہا۔ تحقیق کے صبر آزما عمل میں جن سہولتوں اور ماخذ کے ذخیروں کی ضرورت ہوتی ہے ' وہ تقسیم ہند کے بعد یہاں میسر نہ رہے۔ بیشتر علمی سرمایہ بھارت میں رہ گیا۔ "انڈیا آفس" کے ذخائر کا مسئلہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود حل طلب ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہاں محض ڈھاکہ اور پنجاب کی جامعات کے کتب خانوں کے علاوہ ' پنجاب پبلک لائبریری' (لاہور)' لاہور ریکارڈ آفس' اور "پشاور محفوظات" (آرکائیوز) تھے۔ بعد میں نئی نئی جامعات کے قیام کے ساتھ ساتھ ان میں کتب

خانے بھی قائم ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ بھارت سے کراچی منتقل ہوا، پھر کراچی کا محفوظات (آرکائیوز) اور 'قومی عجائب گھر' اور لاہور کا "عجائب گھر" تہذیبی و علمی ورثے کے اہم مراکز بن گئے، جن میں خصوصاً کراچی کے عجائب گھر کا کتب خانہ اپنے مخطوطات اور نوادر کے سرمایے کے لحاظ سے بہت وقیع اور اہم ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری امداد سے قائم ہونے والے ادارے اور اکادمیاں بھی ماخذ کی جمع و ترتیب میں مصروف رہی ہیں۔

حکومت کی طرف سے بھی تحقیق کے معیار کو بلند کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کی کوششیں جاری ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کئی ادارے قائم کیے گئے اور نئے نئے منصوبے شروع کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو، کراچی، "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" (کراچی)، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، "ترقی اردو بورڈ" اب "اردو لغت بورڈ" (کراچی)، "مرکزی اردو بورڈ" اب "اردو سائنس بورڈ" (لاہور)، "مجلس ترقی ادب" (لاہور)، "ادارہ ثقافت اسلامیہ" (لاہور)، "ادارہ تحقیقات پاکستان" (لاہور)، "ادارہ تحقیقات اسلامی" (اسلام آباد)، "قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت" (اسلام آباد) اور ان کے علاوہ علاقائی زبانوں کی اکادمیاں، پنجابی ادبی اکادمی، (لاہور)، "پشتو اکیڈمی" (پشاور)، "سندھی ادبی بورڈ" (کراچی، اب حیدر آباد)، "بلوچی اکیڈمی" (کوئٹہ)۔ یہ وہ ادارے ہیں جو حکومت کی مالی اعانت سے علم و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے متعدد اداروں نے اپنی توجہ خاص طور پر اردو تحقیق پر صرف کی ہے اور ان میں سے بعض اداروں نے ضمنی طور پر اردو ادب کی ماخذ اور معاون کتب شائع کی ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ جامعات سے ملحق اداروں، مثلاً جامعہ پنجاب اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور موسسہ تحقیقات علوم آسیائی

میانہ و غربی، اپنی خدمات کے حوالے سے علمی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو کے اہم منصوبوں میں سے فہرست مخطوطات کا منصوبہ بہت اہم ہے۔ اس کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی جلدیں زیر اشاعت ہیں۔ اردو کی تمام مطبوعات پر مشتمل اس کا "قاموس الکتب" کا منصوبہ بھی اردو کے علمی سرمایہ میں بڑا افادیت رکھتا ہے۔ مذہب، تاریخ اور عمرانیات سے متعلق مطبوعات کی فہرست پر مشتمل جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی موضوعات پر جمع و ترتیب کا کام جاری ہے ۔ اس کے علاوہ انجمن نے جو متن تصحیح کے بعد شائع کیے ہیں، ان میں "پھول بن" ، "من لگن" "گلشن عشق" ، "کدم راؤ پدم راؤ" "دیوان حسن شوقی" "دیوان شاہ تراب" "دیوان قاسم" وغیرہ کے علاوہ قدیم شعراء کے تذکرے اور ماخذات شعراء و مشاہیر مفید کوششیں ہیں۔ قدیم اور کلاسیکی ادب پر اس کی تصانیف اور منظوم داستانیں، نثری داستانیں ، اردو تھیٹر ، سرشار، نساخ، محمد حسین آزاد، اختر شیرانی، ظفر علی خاں پر تحقیقی مقالات کی اشاعت اور لغت کبیر اس کے تحقیقی اور علمی کاموں کا اچھا نمونہ ہیں۔ "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" نے تاریخ و سیاسیات کے علاوہ "اخبار رنگیں" ، آثار الصنادید" "ذخیرۃ الخوانین" اور " تراجم الفضلا" کو مرتب کر کے شائع کیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، نے زیادہ تر تعلیمی و تاریخی موضوعات پر کتابیں شائع کیں، لیکن اس کے شائع کردہ تذکرہ " گلشن بے خار" کے اردو ترجمہ ، "عہد بنگش" ، "وقائع عبدالقادر خاں" ، " فرحت الناظرین" "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" ادبی تحقیق کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو لغت بورڈ کا اصل منصوبہ آکسفورڈ لغت کے انداز پر ایک مبسوط اردو لغت کی ترتیب و اشاعت ہے، اب تک اس نے تین جلدیں شائع کر دی ہیں۔ اردو میں جامع لغت کی ضرورت کی تکمیل کی طرف ادارہ کا یہ

اہم اقدام ہے۔ ابتداء میں بورڈ نے متن شائع کرنے کا ذمہ لیا تھا، لیکن اس سلسلہ میں میں "باغ و بہار"، "خاور نامہ" اور محمد حسین آزاد کی درسی کتب کے سوا کوئی نمایاں کارنامہ سامنے نہیں آیا۔ اقبال اکیڈمی، کی تصانیف میں اقبال کی غیر مطبوعہ اور غیرمدون تحریروں کے مجموعے، اقبال اور ان کے معاصرین پر مفید کتابوں کا ایک اہم ذخیرہ اور "تذکرہ شعرائے کشمیر" اور "تذکرہ شعرائے پنجاب" شامل ہیں۔ "اردو سائنس بورڈ" نے، جب تک کہ اسے "مرکزی اردو بورڈ" کی حیثیت حاصل تھی، تاریخی اور حوالے کی کتابوں کے تراجم اور تدوین لغات کا ایک طویل سلسلہ شائع کیا۔ حوالے کی کتابوں میں متعدد اہم تاریخی و علمی ماخذ اور "اردو قواعد" اور "جائزہ مخطوطات اردو" (جلد اول) کی اشاعت اس کے مفید کام ہیں۔ "مجلس ترقی ادب" کے دائرہ کار میں کلاسیکی ادب کی اشاعت ہے۔ ادارے نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ، کی تصانیف کو تصحیح و ترتیب کے بعد شائع کرنے میں بڑی خوش اسلوبی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح کلاسیکی ڈراموں کی جمع و ترتیب بھی اس کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ تصحیح متن کے ضمن میں متقدمین و متاخرین کے متعدد کلیات و دواوین، غالبیات، سید احمد خاں اور ان کے رفقا، حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد کے کلیات نظم و نثر، تاریخ و سوانح، شعرائے اردو کے تذکرے، افسانوی ادب، عالمی ادب کے تراجم، "اقبالیات" اور تحقیق و تنقید پر متعدد بلند پایہ تصانیف کی اشاعت اس کے کارناموں کی نمایاں مثال ہے۔ "ادارہ تحقیقات پاکستان" تاریخ و سیاسیات اور تہذیب و ثقافت کے موضوع پر کام کرتا ہے۔ تاریخ اور ادب کے بعض اہم ماخذ بھی اس نے تحقیق و تصحیح متن کے ساتھ شائع کیے ہیں۔ "گل رعنا" (غالب)، "فہرست مخطوطات شیرانی"، دلشاد پسروری فیضی اور دارا شکوہ کے کلیات"، پاکستان میں فارسی اور اردو ادب، اقبال کے غیرمدون بیانات و تقاریر کا

مجموعہ "گفتارِ اقبال" اور بعض کتابیات اس کی مفید کاوشیں ہیں۔ پنجابی ادبی اکادمی اور سندھی ادبی بورڈ نے فارسی شعراء کے تذکرے اور دواوین کے تصحیح شدہ متن شائع کیے۔

بعض دیگر ادارے، اردو اکادمیاں اور علاقائی زبانوں کی اکادمیاں بھی گاہے گاہے اردو ادب کی طرف توجہ دیتی ہیں، علاقائی اردو ادیبوں و شاعروں کی تخلیقات شائع کرتی ہیں اور اردو زبان کے لسانی رشتوں کا مقامی عناصر سے تعلق واضح کرتی ہیں۔

پاکستان کی جامعات تحقیق کے فروغ کا ایک زیادہ بڑا اور مستقل ادارہ ہیں۔ جامعہ پنجاب، جامعہ کراچی اور جامعہ سندھ میں تحقیق کا کام ایک اچھی خاصی تعداد میں مکمل ہوا ہے۔ دیگر جامعات بھی تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ جامعات میں بالخصوص جامعہ پنجاب کے اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ تصنیف و تالیف نے بعض گراں قدر علمی و تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ دائرہ معارف اسلامیہ، اردو میں اسلام کی مبسوط قاموس، (انسائیکلو پیڈیا) اس کا سب سے ممتاز اور وقیع کارنامہ ہے۔ یہ ایک بہت جامع اور مبسوط منصوبہ ہے، جس کی اب تک سترہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی زیرِ ترتیب و اشاعت ہیں۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا اور مفید علمی شاہکار ہے۔ اسی ادارے نے ایک مبسوط "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت" انیس جلدوں میں شائع کی ہے، جس میں اردو، فارسی، عربی، بنگالی اور دیگر علاقائی زبانوں کی ادبیات کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ غالب صدی (۱۹۶۹ء) کی مناسبت سے بھی اس ادارہ کے تحت غالب پر بعض معیاری تحقیقی و تنقیدی کتابیں شائع ہوئیں اور غالب کے کلیات نظم و نثر کو کئی جلدوں میں مرتب کیا گیا۔

سرکاری اعانت سے کام کرنے والے اداروں کے علاوہ بعض

ناشرین نے بھی کلاسیکی ادب کے کئی اہم ماخذ شائع کیے۔ مثلاً "مکتبہ" "خیابان ادب" لاہور اور "اردو اکیڈمی سندھ" کراچی اور "مکتبہ جدید" لاہور کا اس ضمن میں خاص ذکر کیا جا سکتا ہے۔ حکومت ایران کی سرپرستی میں "ادارہ تحقیقات فارسی" (راولپنڈی) نے بنیادی طور پر فارسی ادب کے تعلق سے کتابیں شائع کی ہیں اور بعض دیگر ماخذ کتب اور مخطوطات کی فہرستیں شائع کی ہیں، جو اردو ادب کے لیے بھی ایک لحاظ سے اہم ہے۔

نجی اور انفرادی طور پر بھی تحقیق میں قابل قدر کاوشیں انجام دی گئی ہیں۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر شوکت سبزواری، اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سخاوت میرزا وغیرہ قیام پاکستان سے قبل بھی تحقیق کے تعلق سے شہرت کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی عالمانہ اور محققانہ کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعد میں جن افراد نے امتیازی کام کیے، ان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، کلب علی خاں فائق، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر وحید قریشی، اسمٰعیل پانی پتی اور خلیل الرحمن داؤدی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ آج کل جو محقق اہم کارنامے انجام دے رہے ہیں، ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ڈاکٹر نجم الاسلام اور محمد اکرام چغتائی کے نام نمایاں ہیں۔ غالبیات کے ضمن میں غلام رسول مہر اور ان کے بعد اب ڈاکٹر سید معین الرحمن، اور اقبالیات کے تعلق سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محمد ریاض کے نام ممتاز ہیں۔

یہ سب محقق اور متعدد تحقیقی ادارے اردو کے تحقیقی اور ادبی سرمایے میں قابل قدر اضافے کر رہے ہیں۔ ان کی کاوشوں سے قدیم ادبی سرمایے کی دریافت اور متن کی تصحیح ہوئی ہے اور ادب کا تہذیبی، سیاسی و

فکری پس منظر سامنے آیا ہے اور اساتذہ کے بارے میں معلوماتی اور سوانحی مواد فراہم ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ پاکستان میں تحقیق کا معیار اور اس کی رفتار اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ہے۔ متعدد اسباب کے باعث ' جن میں وسائل کی کمیابی ' حوصلہ افزائی کا فقدان اور مناسب منصوبہ بندی کا نہ ہونا بھی شامل ہے ' پاکستان میں اردو تحقیق کو وہ فروغ اور معیار حاصل نہ ہو سکا ' جو مثلاً پڑوسی ملک میں نظر آتا ہے۔ اس کے تہذیبی و معاشرتی اسباب سے قطع نظر ' جو دونوں ملکوں کے معاشروں اور ان کے استحکام اور عدم استحکام سے بھی عبارت ہیں ' اگر وسائل کی فراہمی اور حوصلہ افزائی کی خاطر خواہ اور مناسب روایت ہی ہمارے ہاں ہوتی ' تو ظاہر ہے کہ تحقیقی بے اطمینانی کی یہ صورت نہ ہوتی۔ سرکاری سرپرستی ' اعانت اور ستائش کی کوئی مثال ہمارے ہاں موجود نہیں۔ ہر سال کچھ وظائف معمر اور نا آسودہ ادیبوں و شاعروں وغیرہ کو دے دیے جاتے ہیں ' لیکن ایک تو اس اعانت کا حلقہ بہت محدود ہے اور دوسرے متعدد ضرورت مند اور مستحق ابھی تک منتظر توجہ ہیں۔ چند اداروں اور انجمنوں کی جانب سے چند انعامات کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے ' لیکن یہ تعطل اور تاخیر کا شکار رہتا ہے۔ بعض اداروں کی جانب سے انعامات کا اعلان تو ہو جاتا ہے لیکن برس ہا برس تک ان کا اجراء اور فیصلہ نہیں ہوتا۔ گزشتہ چھ سات سالوں میں خود حکومت کی جانب سے مختلف موضوعات پر ہر سال شائع ہونے والی مطبوعات پر کئی انعامات دینے کا اعلان ہوا تھا لیکن صرف ایک یا دو ' اور وہ بھی نامکمل ' فیصلے سامنے آئے ہیں۔ اہل قلم کی ایک معروف انجمن کئی سالوں سے متعدد ادبی انعامات تقسیم کرتی ہے ' لیکن مبینہ طور پر ان کے تعلق سے ایسی گروہ بندی اور اقربا نوازی کی حکایتیں عام ہوئیں کہ ان انعامات کی قدر و قیمت ہی ختم ہو گئی۔

ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں تحقیق زیادہ جاں کاہی، وقت نظر اور مشقت و جستجو کا تقاضہ کرتی ہے۔ اور اس کے لیے زیادہ مدت اور سرمایہ بھی درکار ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہوتی ہے جب ضروری سہولتیں حاصل ہوں اور اس کے مطلوبہ تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم افراد اس میں دلچسپی برقرار رکھ سکتے ہیں اور مشکل ہی سے کوئی ٹھوس اور بہت وقیع تحقیقی کارنامہ انجام پاتا ہے۔ چونکہ اس کو زیادہ تر فروغ جامعات ہی میں حاصل ہوا ہے، اس لیے بالعموم اس کے معیار کی سطح ایک خاص حد پر رک جاتی ہے۔ یہاں ایسی مثالیں شاذ ہی نظر آتی ہیں، جن کے حوالے سے کہا جا سکے کہ یہ کسی واضح منصوبہ بندی کے تحت ہوتی ہے۔ چنانچہ، چند مستثنیات سے قطع نظر، ایک تو موضوعات کے تعلق سے،اور دوسرے معیار اور منہاج کے تعلق سے کوئی قابل ذکر صورت حال نظر نہیں آتی۔ اس وقت پاکستان میں تحقیق کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان کے مناسب حل کی طرف توجہ ضروری ہے۔

اس وقت پاکستان میں چونکہ تحقیق کا زیادہ تر انحصار جامعات میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد کے حصول کے لیے لکھے جانے والے مقالات پر ہے، اس لیے ایسی تدابیر اور سہولتیں اختیار کی جانی چاہیں کہ یہ محض حصول سند کا وسیلہ ہی ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اسے معیاری اور مستقل حیثیت حاصل ہو سکے۔ اس کے لیے جامعات میں یا اس کے باہر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرح کا کوئی ایسا با اختیار ادارہ ہونا چاہیے، جو تحقیق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مسائل پر نظر رکھے اور انھیں حل کرنے کی تدابیر اختیار کرے۔ ان مسائل میں چونکہ نجی سطح پر پیش آنے والے بعض مسائل بھی شامل ہیں، اس لیے یہاں نجی اور جامعاتی سطح پر پیش آنے والے مسائل کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ نہیں کیا جائے گا۔

(۱) پہلا اہم مسئلہ نگران کی استعداد کار اور تحقیق سے اس کی دلچسپی کا ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض جامعات کے اساتذہ سرے سے تحقیق ہی کو اہمیت نہیں دیتے اور اسے غیر ضروری کام سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی ترقی کے لیے شاید اب یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ انھوں نے کس قدر تحقیقی کام کیے ہیں اور کتنے تحقیقی کاموں کی نگرانی کی ہے، اس لیے اب وہ بھی "نگرانی" کا فریضہ انجام دینے لگے ہیں۔ چنانچہ انھیں محض اس سے غرض رہتی ہے کہ طلبا کی ایک تعداد ان کے ماتحت آ جائے اور بطور محقق اپنا نام درج کرا لے۔ تحقیق سے انھیں چونکہ خود دلچسپی نہیں، اس لیے نہ موضوع کا انتخاب مناسب ہوتا ہے نہ مناسب طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے بسا اوقات غیر ضروری موضوعات پر تحقیق "مکمل" ہو جاتی ہے یا اگر مکمل نہیں ہو سکتی تو طالب علم کی صلاحیت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر موضوع مناسب بھی ہو لیکن صحیح رہنمائی نہ ہو سکے تو پھر موضوع ضائع ہو جاتا ہے۔ یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ طالب علم تو دلچسپی لیتا ہے، لیکن نگران کی عدم دلچسپی بلکہ بعض اوقات تو طلبا کی حوصلہ شکنی کے سبب طلبا اور موضوع دونوں کا زیاں ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کا تدارک اس طرح ممکن ہے کہ جامعہ یا کل جامعاتی سطح کا ایک ایسا ادارہ ہو جو نگران کی تحقیق سے دلچسپی، اس کی استعداد کار اور خود اس کے تحقیقی کاموں اور ان کے معیار کو پیش نظر رکھ کر اس کو نگران بننے کی اجازت دے۔ اس صورت میں ترقی ہی کے لیے سہی، کسی شخص کو نگران بننے کے لیے خود کو اس کا اہل بنانا لازم ہو گا۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبا کی استعداد کو بھی جانچا جائے۔ انھیں مقالہ لکھنے کی اجازت صرف اس شرط پر ملنی چاہیے جب وہ اس سے قبل چند مختصر تحقیقی مضامین لکھ کر اپنی صلاحیت کا ثبوت فراہم کریں۔ ورنہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض نگران محض اپنے ماتحت محققوں کی ایک

بڑی فہرست تیار کرنے کے لیے طلبا کی استعداد کو جانچے بغیر ان کے ناموں کا اندراج کروا لیتے ہیں۔ کام بہر حال پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا' نگران کا وقتی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

تحقیق کے فروغ اور علم و ادب کی ترقی کے لیے یہ اقدام بھی کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم جامعہ کی سطح کے ہر استاد کے لیے ہر سال کم از کم ایک تحقیقی مقالہ کسی بلند پایہ اور بین الاقوامی شہرت کے حامل مجلہ میں شائع کروانا ضروری قرار دیا جائے اور اساتذہ کی سالانہ ترقی کا انحصار اسی مقالے پر ہونا چاہیے۔ اسی طرح کسی ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی کے لیے کم از کم ایک کتاب اور پانچ تحقیقی مقالات کی اشاعت ضروری ہونی چاہیے۔

(۲) موضوع کے انتخاب کو تحقیق میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس باب میں دیکھا گیا ہے کہ غیر ضروری' غیر اہم اور نامناسب موضوعات بھی منتخب کر لیے جاتے ہیں اور پھر ایسے موضوعات بھی' جن پر یا تو کہیں اور کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ اس کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ موضوع ایسا ہو جو انفرادی سے زیادہ اجتماعی اہمیت کا حامل ہو۔ اس بات کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ موضوعات کی تکرار نہ ہو سکے۔ تکرار اس صورت میں تو جائز ہو سکتی ہے کہ جب سابقہ تحقیق نامکمل اور تشنہ سمجھی جائے اور اس میں فی الواقعی اضافہ مقصود ہو۔ اس بات کا خاصا امکان رہتا ہے کہ کسی موضوع پر کہیں کوئی کام شروع کیا گیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر کسی اور جگہ بھی یا تو کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ اس صورت میں موضوع کے ساتھ ساتھ محنت اور وقت کا زیاں بھی یقینی ہے۔ اس کے تدارک کے لیے یہ ممکن ہے کہ مرکزی طور پر باہمی تبادلہ خیال کے بعد ایسے موضوعات کو تقسیم کر لیا جائے۔ یہ کام کسی مرکزی ادارے کے توسط سے بھی ممکن ہے پھر یہ بات بھی باآسانی ممکن ہے کہ

تمام جامعات میں اور ان سے باہر ہونے والے تحقیقی کاموں کی فہرستیں شائع ہوتی رہیں تاکہ ہر شخص ان سے باخبر ہو سکے۔

موضوعات کے تعلق سے تحقیق و تصحیح متن کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیے۔ اس طرح ایک تو کلام یا تصالیف میں جو الحاق یا غیر مستند عبارتیں شامل ہو گئی ہیں، ان کی نشاندہی ہو جائے اور جو عبارتیں شامل نہیں ہیں، انھیں شامل کر کے کلام یا تصنیف کو مکمل اور مستند بنا دیا جائے۔ یہ ایک نہایت ضروری کام ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے کہ عام شاعر اور مصنف تو ایک طرف، غالب اور اقبال تک کا کلام مستند اور مکمل نہیں ہے۔ جب تک متون کے تصحیح شدہ اور مستند نسخے مرتب نہیں ہوں گے، ادب کی سمت اور اس کا معیار متعین نہیں ہو سکتا۔ ہمارے قدیم اور کلاسیکی ادب کا تقریباً نوے فیصد حصہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی تلاش و ترتیب اور تصحیح کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیے، تاکہ ادب کا مکمل ارتقا سامنے آ سکے اور جامع تاریخ مرتب ہو سکے۔ اس لحاظ سے ادوار یا دبستان تقسیم کیے جا سکتے ہیں، یوں تکرار بھی نہیں ہوگی اور ایک ارتقائی منصوبے کے تحت کام بھی کیا جا سکے گا۔

(۳) ایک اور بڑا مسئلہ وسائل اور ماخذ کی فراہمی کا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک تحقیق کے بنیادی وسائل اور ماخذ کی فراہمی کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا ہے۔ معمولی سے معمولی معلومات کی فراہمی کے لیے بھی خاص دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے کو یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ کن کن موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس معاملے میں تو بہت سے ''نگران'' بھی ان کے ہمسر ہوتے ہیں۔ پھر ایک مجبوری یہ بھی پیش آتی ہے کہ اگر کسی مخطوطے کے متن کی تحقیق مقصود ہو تو بعض غیر ملکی کتب خانوں کے علاوہ اپنے

ملک کے کتب خانوں کے ذخیرہ مخطوطات بلکہ ذخیرہ مطبوعات کی فہرستیں تک میسر نہیں آتیں، جن سے معلوم ہو سکے کہ کن کن کتب خانوں سے ضروری ماخذ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ذاتی کتب خانوں، مسجدوں اور درسگاہوں کے کتب خانوں میں بھی نادر کتب و مخطوطات بکھرے پڑے ہیں، جن کی حفاظت اور جن سے استفادے کی کوئی سہولت موجود نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام کتب خانے اپنی مطبوعات اور اپنے مخطوطات اور دستاویزات کی فہرستیں شائع کریں اور ایسی سہولتیں فراہم کریں کہ ان سے دوسرے شہروں کے افراد بھی استفادہ کر سکیں۔ ذاتی کتب خانوں اور مسجدوں اور درس گاہوں سے ' جہاں سے مخطوطات اور نادر مطبوعات کا حصول مشکل ہو، کوئی ایسا ادارہ ہو، جو ایسے ذخیروں میں شامل تمام اہم ماخذ کتب و مخطوطات کے مائکرو فلم بنا لے یا عکس حاصل کر کے انھیں کسی ایک جگہ محفوظ کر دے، جہاں سے عام استفادہ ہو سکے۔ اس طرح مخطوطات اور نادر مطبوعات و دستاویزات وغیرہ ضائع ہونے سے بھی بچ جائیں گے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات اپنے ذاتی شوق یا کسی جذباتی وابستگی کے سبب اپنے ذخیرہ کتب و نوادر سے کسی کو استفادے کی اجازت اور سہولت فراہم نہیں کرتے۔ اس طرح اہم ماخذ اور قومی و تہذیبی سرمایہ عام استفادے میں نہیں آتا اور بالعموم ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کا تدارک ایک صورت میں ممکن ہے اور جیسا کہ ایک پڑوسی ملک میں کیا بھی گیا ہے کہ ملک بھر میں ذاتی ملکیت میں موجود سو سال سے زیادہ قدیم ہمہ اقسام کے نوادر کا بالجبر اندراج کرایا جائے۔ اس مقصد کے لیے قانون بھی بنایا جا سکتا ہے، جو عین قومی مفاد کا حامل ہوگا۔ اندراج کے ذریعے تمام ماخذ معلوم ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ کوشش کی جائے کہ تمام نوادر کو کسی نہ کسی طرح خرید لیا جائے۔ اگر پھر بھی لوگ نوادر فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان پر سالانہ ٹیکس عاید کر دیا جائے

تاکہ بہت سے افراد اس سے بچنے کے لیے بھی انھیں فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس بلکہ دیگر غیر ملکی کتب خانوں میں موجود ایسے مخطوطات و نوادر کے عکس حاصل کر لیے جائیں، جن پر اپنے ہاں کام ہونے کا امکان ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اردو سے متعلق دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ذخیرہ کتب و مخطوطات اور ماخذات پر مشتمل ایک جامع کتابیات بھی تیار کی جائے تاکہ یہ ہر محقق کے لیے ایک رہنما ثابت ہو سکے۔

یہ وہ بڑے اور ناگزیر مسائل ہیں، جن کے حل کرنے سے نہ صرف اردو تحقیق کا معیار بلند ہو سکتا ہے اور اسے فروغ حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ اس طرح اردو زبان و ادب کو ترقی بھی دی جا سکتی ہے اور یوں ماضی سے ہمارا رشتہ استوار ہو سکتا ہے اور ہم تاریخ سے مربوط ہو سکتے ہیں۔

تحقیق کے فروغ کے لیے مناسب اعانت اور سرپرستی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ سرپرستی یا تو سرکاری و علمی و ادبی اداروں کی طرف سے ہو سکتی ہے یا عام ناشرین و تاجرین کتب کی علم دوستی کے سبب ہو سکتی ہے، لیکن ایسا خال خال ہی ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی تاجرانہ ذہنیت نے جب علم و ادب ہی کو پس پشت ڈال دیا ہے، تو عام تاجران کتب اور ناشرین سے اس کی توقع عبث ہے۔ بہت سے ادارے، جو تحقیقی کاموں کی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں اور انھیں فروغ بھی دے سکتے ہیں، لیکن سہولتوں کی عدم دستیابی اور مالی مشکلات کے سبب اپنے مقاصد کی تکمیل سے قاصر رہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں ادارے اپنے ارباب اختیار کی نااہلی اور بے قاعدگیوں کے سبب بھی اپنے مقاصد پورے نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں اداروں کی کارکردگی اور ان سے وابستہ افراد کی اہلیت کو جانچنے اور پرکھنے کا کوئی باقاعدہ طریقہ موجود نہیں۔

مالیاتی امور کی جانچ پڑتال تو شاید ہوتی ہے، لیکن کارکردگی اور استعداد کار کو گاہے گاہے پرکھنے اور پھر باز پرس کرنے کی کوئی مستقل روایت نظر نہیں آتی۔ اس صورت حال میں ایسے منصوبے بننے چاہیں اور مستقل مزاجی اور خلوص کے ساتھ ان پر عمل ہونا چاہیے، جو محققوں کی اعانت اور حوصلہ افزائی کے باعث ہوں۔ ان میں غیر ممالک میں موجودہ ماخذ سے استفادے کی سہولتیں بھی حاصل ہونی چاہئیں۔ باقاعدگی سے دیے جانے والے وظائف اور انعامات بھی نہایت موثر ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں مناسب قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ اور ساتھ ہی ان کی کاوشوں کی مناسب اشاعت کا بندوبست بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ سنجیدہ، باوقار اور گوشہ نشین افراد کی کاوشیں منظر عام پر آتی رہیں اور وہ اپنے مقابلے میں اقربا پروری کی فضا میں نا اہل افراد کی پذیرائی اور ان کی غیر معیاری کاوشوں کی ستایش دیکھ کر نارسائی اور احساس محرومی کے مزید شکار نہ رہیں۔ اشاعت کے مواقع حاصل نہ ہونے کے سبب آج کئی باصلاحیت اور محنتی محقق بھی تحقیقی کاوشوں کو انجام دینے سے گریزاں ہیں اور یوں تحقیق کا ارتقا بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ علمی و ادبی اور ایک لحاظ سے قومی نقطہ نظر سے یہ صورت ایک لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے۔

"اخبار اردو" (اپریل، ۱۹۸۲ء)

جامعاتی تحقیق: چند مسائل اور تجاویز

تحقیقی پیش رفت میں جامعات کو بنیادی حیثیت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دیگر بعض ادارے بھی تحقیقی سرگرمیوں میں گاہے حصہ لیتے ہیں لیکن ہمارے ملک کے علمی اداروں میں تحقیقی منصوبوں کی تشکیل اور تکمیل کا کام اس پیش رفت کو مزید آگے بڑھانے کے لحاظ سے بہت کم ہوتا ہے۔ محض ایک دو اداروں کی ایسی کوششوں کو ان اداروں کے سرپرست مجاز افراد کی انفرادی دلچسپیوں اور مثبت رویوں یا ان اداروں پر خصوصی سرکاری نظر عنایت کے باعث اضافی مالی امداد میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسے اداروں کی کوششیں استثنائی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر اگر ایسے بعض اداروں نے چند عمدہ تحقیقی منصوبے مکمل یا شائع بھی کیے تو ان کی تکمیل کا سہرا کلی طور پر ان اداروں کے سر نہیں ڈالا جا سکتا۔ ایسے تمام اداروں میں تکمیل پانے والے منصوبے پھر بھی اپنی کمیت اور بعض صورتوں میں معیار کے لحاظ سے ان تحقیقی کاموں سے کم تر ہیں جو جامعات میں انجام پائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہنا بھی مناسب ہو گا کہ اداروں میں انجام پانے والے کچھ تحقیقی منصوبے جامعات میں مکمل ہونے والے بعض کاموں سے معیار میں کہیں بہتر اور دقیع ہیں۔

یہاں میری تمام تر معروضات معاشرتی علوم اور ادبیات کے حوالے سے ہیں۔ اور اس لحاظ سے کہ ہمارے ملک میں جامعات تحقیقی سرگرمیوں کے تسلسل اور تحقیقی پیش رفت کے اہم اور بنیادی ادارے ہیں اور معیاری تحقیقی مطالعے، بعض انفرادی سطح پر ہونے والے معیاری کاموں سے قطع نظر، زیادہ تر جامعات ہی میں پی ایچ ڈی کی اسناد کے لیے کیے گئے، میرے موضوع کا تعلق جامعاتی تحقیق کے مسائل تک محدود ہے۔

مسائل و مشکلات

تحقیقی پیش رفت میں جامعات کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہونے کے باوجود یہ ادارہ اپنی تحقیقی پیش رفت میں حائل متعدد مسائل اور مشکلات اور عدم توجہی سے دوچار ہے اور جن کی وجہ سے ایسے مثالی اور مناسب ماحول سے محروم ہے، جو عمدہ تحقیقی منصوبوں کی تخلیق اور تکمیل کا باعث ہوتا ہے۔ چونکہ تحقیق کا عمل خاصا صبر آزما ہوتا ہے اور زیادہ جاں کاہی؛ دقت نظر اور مشقت و جستجو کا تقاضا کرتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے، جب ضروری سہولتیں حاصل ہوں اور اس کے مطلوبہ تقاضے پورے ہوتے رہیں، اسی لیے بہت کم افراد اس میں دلچسپی برقرار رکھ سکتے ہیں اور مشکل ہی سے کوئی ٹھوس اور بہت وقیع کارنامہ سامنے آتا ہے۔ چونکہ اس کو زیادہ تر فروغ جامعات ہی میں حاصل ہوتا ہے اس لیے بالعموم اس کے معیار کی سطح ایک خاص حد پر رک جاتی ہے۔

یہاں میدان تحقیق میں ایسی مثالیں شاذ نظر آتی ہیں، جن کے حوالے سے کہا جاسکے کہ یہ کسی واضح منصوبہ بندی کے تحت ہوتی ہیں۔ چنانچہ چند مستثنیات سے قطع نظر، ایک تو موضوعات کے تعلق سے اور دوسرے معیار اور

اسلوب کے حوالے سے کوئی قابل ذکر صورت حال نظر نہیں آتی۔ آج اگر ہم جامعات میں ہونے والے تحقیقی کاموں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت کم کام ایسے ہیں، جنھیں عمدہ اور معیاری کہا جاسکے یا ایسے بیشتر کام، مختلف صورتوں میں، غیر معیاری ہوئے ہیں یا ہماری جامعات میں تحقیقی پیش رفت کی رفتار قابل اطمینان نہیں، تو اس کا سبب انھی مسائل اور مشکلات کو قرار دیا جاسکتا ہے، جن سے تحقیق، جامعات میں دوچار ہے۔

اگر ان مسائل و مشکلات کو تلاش کیا جائے، جو جامعات میں تحقیق کو اس مثالی ماحول سے محروم کرتے ہیں تو انھیں مختلف صورتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً" سہولتوں اور ماخذ کا فقدان، جو تحقیق کی راہ میں پیش آنے والا ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں سہولتوں سے مراد وہ آسانیاں ہیں، جو ایک محقق کو اس کی تحقیق کے دوران میں میسر آنی چاہئیں۔ گو ہم ان آسانیوں اور آسائشوں کا تصور فی الحال نہیں کرسکتے جو ترقی یافتہ ممالک کی جامعات کے محقق کو اس کے تحقیقی منصوبے کی تکمیل کے لیے حاصل ہوتی ہیں مثلاً" ایک معقول مشاہرہ تاکہ وہ معاشی فراغت کے ساتھ اپنے موضوع کا حق ادا کرسکے، اسے دنیا بھر میں جہاں کہیں مفید طلب مواد اور کی دستیابی کی توقع ہو، جامعہ کی اعانت سے سفر کرسکے یا اس مواد کو اپنی ہی جامعہ میں کسی صورت منگوا سکے، اسے ایسے نائب اور معاون بھی مل جائیں جو اس کے لیے ضروری مواد کی تلاش میں اس کی معاونت کرسکیں یا عکس اور ٹائپ کی آسانیاں فراہم کرسکیں۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیمی اور علمی ترقی کی مد میں نسبتاً" کم اور ناکافی رقم مختص ہوتی ہے مذکورہ سہولتوں کی خوش گمانی بھی ہم نہیں کرسکتے، لیکن اس سے قطع نظر بعض بنیادی سہولتوں مثلاً تحقیقی مواد اور ماخذ کی دستیابی اور ان سے استفادہ کے لوازمات تک سے ہماری جامعات افسوس ناک حد تک محروم ہیں۔ ہر سال

ہماری جامعات کے سرمایہ کا ایک بڑا حصہ تعلیمی، تدریسی اور تحقیقی مدات میں صرف ہونے کے بجائے غلط کرم فرمائیوں اور غیر ضروری معاملات میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تحقیق.اور اس سے متعلقہ منصوبوں کو حقیقی فروغ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟۔

معاشرتی علوم اور ادبیات میں تحقیقات کا انحصار کتب خانوں کی علمی ثروت اور مفید ماخذ کے ذخائر پر ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر کتب خانون ار محفوظات (Archives) کی زندگی کم وہ بیش قیام پاکستان کے وقت سے ہی شروع ہوتی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت یہاں پاکستان میں محض کتب خانہ جامعہ پنجاب اور پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) کے علاوہ "لاہور ریکارڈ آفس" اور "پشاور آرکائیوز" موجود تھے۔ بعد میں نئی نئی جامعات کے ساتھ ان کے کتب خانے قائم ہوئے۔ متعدد ادارے وجود میں آئے اور انھوں نے بھی اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے۔ "انجمن ترقی اردو" کا قیمتی کتب خانہ، بھارت سے کراچی منتقل ہوا، پھر کراچی میں قومی عجائب گھر اور آرکائیوز اور لاہور میں قومی عجائب گھر تہذیبی اور علمی ورثے کے اہم مراکز بن گئے۔ کراچی کے عجائب گھر کا کتب خانہ اور مسلم لیگ آرکائیوز (جامعہ کراچی) اپنے محفوظات اور نوادر کے سرمایہ کے لحاظ سے بہت دقیع اور اہم ہیں۔

لیکن یہ تمام ذخائر اپنے محفوظات اور نوادر کے باوجود ہماری علمی اور تحقیقی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ناکافی ہیں۔ بعض موضوعات پر تحقیق کے لیے ہمیں بھارت میں موجود ذخائر سے استفادے کی اشد ضرورت پڑتی ہے لیکن پاکستان اور بھارت کے درمیان کے سیاسی روابط کی نوعیت، ذاتی مقاصد کے لیے تو سفر پر پابندیاں عائد نہیں کرتی مگر علمی مقاصد کے لیے ایسا کرنا دشوار بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مطلوبہ مواد کا تبادلہ تو کسی

صورت ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہمارے لیے ادبیات اور قومی و سیاسی تحریکات اور ملی و تہذیبی موضوعات پر مشتمل مفید مطلب مواد کا ایک بڑا حصہ مغربی ممالک بالخصوص برطانیہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ وہاں ہر ایک محقق کا جانا اور ضروری ماخذ سے استفادہ کرنا ممکن نہیں۔ اور نہ ہماری جامعات مستعدی اور خلوص کے ساتھ ایسی کوششیں کرتی ہیں کہ وہ اپنے محققین کی ضرورتوں کے مطابق ان کے لیے مطلوبہ مواد کسی ممکنہ صورت میں برطانیہ' بھارت' ایران یا جہاں کہیں وہ موجود ہو' وہاں سے منگوا سکیں۔ ذاتی اور نجی تجربات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ اگر کوئی فرد یا ادارہ اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے غیر ممالک سے اپنے لیے ضروری مواد کا عکس یا مائکرو فلم وغیرہ حاصل کرنا چاہے تو اسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے لیکن اگر جامعات کو وسیلہ بنایا جائے تو یہ کام بصورت اطمینان ممکن نہیں ہوتا۔

اس صورت میں کہ ہر محقق ایسے وسائل نہیں رکھتا کہ خود ضروری ماخذ حاصل کر سکے' اسے جامعہ کا محتاج رہنا پڑتا ہے اور یوں بالعموم مایوسی ہی سے اسے سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ایک کوشش کچھ عرصہ قبل یہ ہوئی تھی کہ انڈیا آفس کے کتب خانہ سے قومی اہمیت کا سارا لوازمہ بصورت عکس یا نقل حاصل کر لیا جائے۔ معلوم ہوا کہ جن اکابر کو انتخاب کی ذمہ داری تفویض ہوئی' انھوں نے اپنی سیرو تفریح کو اولیت دی اور اگر ذمہ داری نباہی بھی تو اپنی صوابدید' علمیت اور ضرورت کو معیار بنایا اور بیشتر قیمتی مواد کو غیر اہم سمجھ کر نظرانداز یا رد کر دیا۔ اور بادل ناخواستہ جو لوازمہ منگوایا گیا' سننے میں آتا ہے کہ اس کا اب کچھ ہی فیصد حصہ باقی رہ گیا ہے' باقی لاپتہ ہے' ضائع ہو گیا ہے یا بااثر افراد نے اپنے گھر کی الماریاں اس سے سجالیں۔

کتب خانوں اور محفوظ ذخائر کی بدانتظامی بھی متعدد مسائل پیدا کرتی

ہے۔ اب ایسا خلوص، جاں فشانی اور ذوق و شوق کم ہی نظر آتا ہے کہ بالارادہ کتب خانوں میں ضروری، اہم کتابیں اور رسائل و جرائد جمع کیے جائیں۔ ایسی صورت میں نوادرات کا کسی کتب خانہ میں آ جانا اب محض اتفاق کی بات ہوتی ہے۔ لیکن ایسے ہی اتفاقات نے ہمارے بعض کتب خانوں کو اپنے ذخائر کے لحاظ سے بہت باثروت بنا دیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے عام و خاص اور جامعاتی کتب خانے عام طور پر بدانتظامی کا شکار ہیں۔ بدانتظامی ہی کا سبب ہے کہ کتابوں کی خریداری کے تکلفات کا مرحلہ تمام ہونے سے قبل ہی اہم کتابیں بازار میں نایاب ہو جاتی ہیں اور کتب خانے ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اکثریوں بھی ہوتا ہے کہ کتابیں، کتب خانہ میں موجود ہوتی ہیں، لیکن بدانتظامی اور عملہ کی بے نیازی کے باعث فوری دستیاب نہیں ہوتیں۔ پھر نادر کتابوں کی حفاظت، نگہداشت اور ترتیب کا سلیقہ بیشتر کتب خانوں میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اسی بے توجہی کا شکار وہ آلات بھی ہوتے ہیں، جن سے مائکرو فلم یا مائکروفش پڑھنے یا ان کے عکس بنوانے کا کام لیا جاتا ہے۔ عام حالتوں میں بعض کتب خانوں میں ایسے آلات اپنی افادیت بھی کھو بیٹھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترجیحات کے لحاظ سے ان کی مرمت اور دیکھ بھال پر رقم اس لیے خرچ نہیں کی جا سکتی کہ ان سے استفادہ سال بھر میں محض چند افراد کرتے ہیں۔

کتب خانوں کے سرمایہ کا بیشتر حصہ غلط منصوبہ بندیوں کا شکار ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے ناشروں سے فہرستوں کے حصول اور پھر ان میں سے اہم اور ضروری کتابوں کا انتخاب قدرے توجہ طلب عمل ہوتا ہے اس لیے کتب خانے بالعموم اس سے گریز کرتے ہیں اور محض مقامی ناشروں اور کتب فروشوں پر انحصار کر کے ان کی کتابیں، چاہے وہ فضول اور ناکارہ ہی کیوں نہ ہوں، سرمایہ کو ٹھکانے لگانے کی خاطر خرید لی جاتی ہیں۔ متعدد کتب

خانے ایسے ہیں، جہاں علمی و تحقیقی جرائد اور رسائل کے حصول کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ غیر ملکی اور ترقی یافتہ ممالک کے معروف تحقیقی اداروں اور جامعات سے شائع ہونے والے جرائد کا بمشکل چند فیصد ہماری جامعات کے کتب خانوں میں منگوایا جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ خود مقامی اور ملکی تمام جرائد بھی کسی کتب خانے میں باقاعدگی سے جمع نہیں کیے جاتے۔ یہی حال اخبارات کا بھی ہے۔ شاید ہی کوئی کتب خانہ ہو جس میں ملک بھر کے تمام اخبارات منگوائے جاتے ہوں یا ان کے فائل جمع کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہو اور ان سے استفادہ کی تمام بنیادی سہولتیں فراہم کی جاتی ہوں۔ مثلاً" قدیم اخبارات کو مائکرو فلم میں منتقل کرنا اور ان کی ضروری نقول بہ آسانی فراہم کرنا، یہ کسی ترجیح میں نہیں آتا۔ المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بعض جامعاتی کتب خانوں میں نہایت قیمتی ذخائر خریدے بھی گئے ہیں اور عطیات کی صورت میں بھی جمع ہوئے ہیں، لیکن ان ذخائر کا خاصا حصہ بے توجہی، کرم خوردگی اور خستگی کا شکار ہو کر ناقابل استفادہ ہو گیا۔ ان میں نادر کتابوں اور مخطوطات کے علاوہ شخصی اور قومی اہمیت کی دستاویزات بھی ضائع ہو گئیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان ذخائر کی فہرست سازی کی طرف بھی دل جمعی کے ساتھ کوشش نہیں کی گئی۔

کتب خانوں کے علمی اثاثوں کی فہرستوں کا مسئلہ بھی ہماری مناسب توجہ حاصل نہ کر سکا۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں کتب خانہ کے ذخائر اور مخطوطات و مطبوعات کی فہرستیں باالتزام شائع کرنے کا اہتمام ہوتا ہے تاکہ ان سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہو سکے۔ ہمارے جامعاتی کتب خانوں میں ایسی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا میں تو کتب خانوں کے ذخائر کی مشترکہ فہرستیں

(Union Catalogues) بھی اہتمام سے شائع ہوتی ہیں، لیکن ہمارے

ملک میں جامعات تو ایک طرف، قومی کتب خانوں کی بھی مشترکہ فہرستیں بنانے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ چند ایک جزوی کوششیں کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتیں۔ کتب خانوں میں پائی جانے والی ان کوتاہیوں کے نتیجہ میں تعلیمی، تدریسی اور تحقیقی سرگرمیاں جس طرح متاثر ہوتی ہیں، ان کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

بالعموم یہ وہ مسائل ہیں جو تحقیق کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں اور محققین کے لیے دشواری کا باعث ہوتے ہیں۔ ان رکاوٹوں اور دشواریوں کا سلسلہ یہاں تک محدود نہیں اور مسائل بھی ہیں، جو تحقیق کو مختلف آزمائشوں سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔ حوصلہ افزائی کا فقدان بھی تحقیقی پیش رفت کی رفتار کو سست کرنے کا سبب بنتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو افراد تحقیق مکمل کر کے سند حاصل کر لیتے ہیں، اگر وہ تحقیق یا تدریس کے پیشہ سے منسلک ہیں تو ان کے مشاہروں میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی محض اسی کو صلہ نہیں کہا جا سکتا۔

تحقیق کی حقیقی پذیرائی دراصل ایک محقق کی قلبی طمانیت کا باعث ہوتی ہے اور اس کا اثر نہ صرف دیرپا ہوتا ہے، بلکہ مزید تحقیقات کا محرک بھی ثابت ہوتا ہے۔ حقیقی پذیرائی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ تحقیقی مقالے کی اشاعت بآسانی ہو جائے، دوسرے یہ کہ تحقیق، محقق کے لیے اس کے مقام و مرتبہ میں اضافہ کا سبب بن سکے یا کم از کم اسے اس کا جائز حق دلا سکے، لیکن یہاں بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔ اقربا پروری، جانبداری اور سفارشیں ایک پی ایچ ڈی کے مقابلے میں غیر پی ایچ ڈی کو اور ایک ایسے شخص کے مقابلے میں کہ جو تحقیق و تصنیف کا شغف رکھتا ہو، ایک عام فرد کو ترجیح دلاتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ذاتی اغراض بھی تحقیقی ذوق و شوق، صلاحیتوں اور

سرگرمیوں کے لیے نہ صرف حوصلہ شکن بلکہ دل برداشتگی کا باعث بنتی ہیں۔ سننے میں آتا ہے کہ بعض ارباب اقتدار اپنے ماتحت لائق افراد کی تحقیقی سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ ایسی تحقیقات سرانجام نہ دیں جو ان کی ذاتی اغراض کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکیں۔ مثلاً" بعض جامعات میں ایسے شعبے موجود ہیں جہاں تحقیق کی کوئی مستقل روایت پروان ہی نہ چڑھ سکی۔ ایسے شعبوں سے منسلک بزرگ اساتذہ، جنھوں نے نہ خود کبھی کوئی تحریری و تحقیقی کام کیا، نہ دوسروں ہی کو کرنے کی اجازت یا آزادی دی، انھیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر دوسرے تحقیق مکمل کر کے کسی صورت ان سے آگے بڑھ گئے تو ان کی حیثیت اور ان کا منصب متاثر ہو سکتا ہے۔

جامعات میں تحقیقی سرگرمیوں کا دارومدار بڑی حد تک اساتذہ میں تحقیق و تصنیف کے ذوق و شوق اور خود ان کی اہلیت پر ہوتا ہے۔ اگر اساتذہ میں ایسے افراد شامل کر لیے جائیں، جو تحقیق و تصنیف کا کوئی شغف ہی نہ رکھتے ہوں، تو نہ خود وہ کوئی تحقیقی کام کر سکتے ہیں، نہ تحقیقی سرگرمیوں میں اضافے اور حوصلہ افزائی کا باعث بن سکتے ہیں۔ آج جامعات میں یہ صورت حال موجود ہے کہ اساتذہ کا تقرر کلی طور پر حق و انصاف کے اصولوں پر نہیں ہوتا، سفارشوں جانبداری اور اقربا نوازی کے زیر اثر ایسے امیدوار بھی مستحق افراد کا حق سلب کر کے، اساتذہ کی صف میں شامل کر لیے جاتے ہیں، جو تعلیمی فضیلتوں اور تحقیق و تصنیف کی استعداد میں اپنے مقابل امیدواروں سے کم تر ہوتے ہیں۔ ایسے افراد اپنی تدریسی زندگی میں نہ اپنے فرائض خوش اسلوبی اور دیانتداری سے انجام دیتے ہیں، نہ تحقیق و تصنیف میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کا بیشتر وقت اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل، سیاسی اور گروہی جوڑ توڑ اور محض ہجو طرازی یا لطیفہ گوئی میں گزر جاتا ہے۔ چنانچہ آج جامعات کے بیشتر اساتذہ نہ

صرف تحقیق و تصنیف کو کار فضول سمجھتے ہیں، بلکہ پڑھنے لکھنے ہی سے دور بھاگتے ہیں۔ بزرگ اور لائق اساتذہ کی جو نسل آج جامعات سے گزرتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ جن اساتذہ کو بزرگی کا درجہ حاصل ہو رہا ہے، ان میں سے اکثر کا دامن علمی توقیر اور تحقیقی سرگرمیوں سے خالی نظر آتا ہے۔ کسی زمانہ میں اگر کسی نے کچھ کیا بھی ہو تو وہ اب اپنے دامن جھاڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ کتنے ہی اساتذہ ایسے ہیں، جنھوں نے اگر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے کچھ لکھا بھی تو بعد میں کچھ نہیں کیا۔ ایسے اساتذہ تحقیقی سرگرمیوں کی ذمہ داری اور نگرانی کیوں کر حقیقی ذوق و شوق سے انجام دے سکتے ہیں؟۔

جامعات میں تحقیقی کاموں کی نگرانی کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ بعض اساتذہ اگرچہ خود مستقل مزاجی سے تحقیق میں دلچسپی نہیں لیتے، لیکن انھیں اس سے دلچسپی رہتی ہے کہ طلبہ کی ایک تعداد، چاہے وہ تحقیق کی اہلیت ہی نہ رکھتی ہو، ان کے ماتحت بطور محقق اپنا نام درج کرا لے، تاکہ وہ فخریہ اپنی زیر نگرانی طلبہ کی تعداد گنا سکیں۔ تحقیق سے چونکہ انھیں خود کوئی مناسبت نہیں ہوتی اس لیے نہ موضوع کا انتخاب مناسب ہوتا ہے، نہ جدید اور سائنٹفک اصول تحقیق اختیار کیے جاتے ہیں۔ بہرصورت ایک سرسری اور سطحی کتاب تحریر کر دی جاتی ہے اور یوں تحقیق مکمل ہو جاتی ہے! یا اگر مکمل نہ ہو سکی تو اکثر اوقات طلبہ کی صلاحیت اور کبھی کبھی اچھا موضوع ضائع ہو جاتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم تو دلچسپی لیتا ہے اور اس بات کا قوی امکان بھی رہتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں اجاگر کی جا سکیں، لیکن نگراں استاد کی عدم دلچسپی و بے نیازی بلکہ بعض اوقات حوصلہ شکنی کے سبب صلاحیتوں اور موضوع دونوں کا زیاں ہو جاتا ہے۔ طلبہ کی صلاحیتوں کے ضائع کرنے میں نگراں کے نفسیاتی اور تہذیبی مزاج کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی نگراں

اپنی نفسیاتی تسکین کے لیے طالب علم کی مستقل مزاجی کی آزمائش بھی کرتے ہیں۔ کئی کئی ماہ اس سے ذاتی کام لیتے رہنا' کئی کئی دن تک چلچلاتی دوپہر میں طالب علم کو اپنے گھر بلوا کر اس کے استقلال اور اس کی پابندی اوقات کو جانچنا بھی نگران کا ایک مشغلہ ہوتا ہے۔ اگر نگراں کو یہ علم ہو جائے کہ طالب علم کا تعلق اس کے مخالف یا مقابل اساتذہ کے حلقہ سے ہے تو پھر وہ طالب علم اس کے لیے ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر یہ نگراں خیر سے صدر شعبہ بھی ہو تو پھر اس طالب علم کی درخواست پہلے ہی مرحلہ پر رد ہو سکتی ہے۔ رد کرنے کی وجوہات اس قدر تلاش کی جا سکتی ہیں کہ ان کا توڑ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

نگراں میں تحقیقی ذوق و شوق اور استعداد کار کے نہ ہونے کا ایک اور نقصان یہ ہوتا ہے کہ بالعموم عمدہ موضوعات کا انتخاب نہیں ہو سکتا۔ جب نگراں کا مطالعہ ہی محدود ہو اور اس کو یہ علم نہ ہو کہ اس کے مضمون میں عام اور جامعاتی سطح پر کہاں کہاں اور کس کس موضوع پر کام ہو چکے ہیں اور اس لحاظ سے کن موضوعات اور منصوبوں پر تحقیقات کی گنجائش موجود ہے' ضروری مناسب اور مفید موضوعات کا تعین نہیں ہو سکتا۔ پھر نگراں کی تحقیق اور جدید سائنٹفک فنی اصولوں سے اس کی ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مآخذ اور مواد کی فراہمی اور انھیں سلیقہ سے استعمال کرنے میں نہ طالب علم کی مناسب اور ضروری رہنمائی ہو سکتی ہے نہ موضوع اور تحقیق کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ جدید اور سائنٹفک اصول تحقیق سے بہت کم افراد کو آگاہی حاصل ہے۔ اس لیے نہ تو محقق اصل اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں' نہ مواد کو صحیح اصول ترتیب اور سلیقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی ذمہ داری نگراں کی ہوتی ہے' جو اس ضمن میں محقق کی رہنمائی

اور رہبری کر سکتا ہے--- لیکن اگر وہ خود ان معاملات سے بے نیاز ہو تو بہتری کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ جدید اور سائنٹفک اصول تحقیق سے بے نیازی اور ناواقفیت کا ایک سبب یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیمی نصاب میں اصول تحقیق شامل ہی نہیں ہیں۔ معاشرتی علوم اور ادبیات کے جن مضامین میں تحقیق کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں، ان میں بھی اصول تحقیق کو نصاب میں شامل کرنے کی کوئی مثال پاکستان میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طالب علم عرف عام میں فارغ التحصیل ہو جاتا ہے، لیکن اصول تحقیق سے نابلد رہتا ہے۔ چنانچہ اگر اسے آئندہ تحقیق کا موقع مل جاتا ہے تو اسے انھیں سمجھنے اور سیکھنے میں خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے یا وہ ان سے ناواقف رہ کر کوشش خام اور فرسودہ اسالیب اختیار کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔

ان مراحل سے قطع نظر دفتری امور و معاملات کی تکمیل کے مراحل بھی تحقیق کی رفتار میں تاخیر کا سبب بنتے ہیں۔ جامعات میں بالعموم طالب علم کو کسی موضوع پر کام کرنے کے لیے نگراں کی منظوری کے علاوہ صدر شعبہ اور رئیس کلیہ (Dean) کی منظوری کے مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اب یہ نگراں اور صدر شعبہ کے باہمی روابط، پسند و ناپسند اور مسابقت کی صورت حال پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ طالب علم کی درخواست کسی اعتراض، حیل و حجت اور رکاوٹ و تاخیر کے بغیر آگے بڑھ جائے۔ بعض صدور شعبہ محض اپنی نفسیاتی تسکین اور اپنے وجود کا احساس دلانے کی خاطر موضوع یا اس کے کسی پہلو پر اعتراض برائے اعتراض بھی وارد کرتے ہیں، جب کہ کام اور معیار کی ذمہ داری محقق اور نگراں کی ہوتی ہے۔ بعض صدور شعبہ اپنے منصب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر مرحلہ پر اپنی مداخلت بے جا کے عمل کو بالعموم معیار کی بہتری کا باعث قرار دیتے ہیں۔ پھر یہی صورت رئیس کلیہ سے منظوری کے وقت بھی

پیش آسکتی ہے۔ بعد کے مراحل میں جامعہ کی مختلف مجاز مجلسوں کا سامنا بھی اس درخواست کو کرنا پڑتا ہے۔ ان مراحل کی تکمیل میں عام طور پر چار سے چھ ماہ لگ جاتے ہیں، کیونکہ بالعموم ان مجلسوں کے جلسے باقاعدگی سے نہیں ہوتے۔ اگر درخواست میں کسی مرحلہ پر کوئی ترمیم ہو جائے تو پھر مزید وقت کا صرف ہونا بھی اسی اعتبار سے یقینی ہوتا ہے۔ اس قسم کے تاخیری مراحل درخواست کی منظوری تک محقق کو مضطرب اور معلق کیے رکھتے ہیں۔

چیدہ چیدہ مسائل کی یہ وہ صورت حال ہے، جس سے جامعات میں تحقیقی سرگرمیاں دو چار رہتی ہیں اور جامعات تحقیقی پیش رفت میں اپنے کردار کو، اگر مستعدی اور خلوص کے ساتھ انجام دینا بھی چاہیں تو اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس صورت حال کا ذمہ دار نہ کسی ایک فرد یا افراد کو ٹھہرایا جا سکتا ہے، نہ انتظامیہ یا اس کے ارباب اقتدار اس کے ذمہ دار قرار دیے جا سکتے ہیں، سبھی پر اس صورت حال کی کم و بیش ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر اس کا ذمہ دار فرد یا افراد یا مجاز مجلسوں یا قواعد و ضوابط کو ٹھہرایا جا سکتا، تو اسی کی مناسبت سے ایسی تدابیر اختیار کی جا سکتیں، جو اس صورت حال کا تدارک کر سکتیں، لیکن محض یوں ان مسائل کا حل ممکن نہیں۔ ہمیں اس صورت حال کے تدارک کے لیے مسائل کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے۔ اس وقت چونکہ تحقیق کا زیادہ تر انحصار حصول اسناد کے لیے لکھے جانے والے مقالات پر ہے، اس لیے ایسی تدابیر اور سہولتیں اختیار کی جانی چاہئیں کہ یہ محض حصول سند کا وسیلہ ہی نہ رہے بلکہ اسے معیاری اور افادی حیثیت بھی حاصل ہو سکے۔

جامعات میں تحقیقی ذوق و شوق کا اظہار یا تو ان طلبہ کی جانب سے ہوتا ہے جو تحقیق کرنا چاہتے ہیں یا پھر اساتذہ اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے ذریعہ

اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ان دونوں سطحوں پر تحقیقی ذوق و شوق کی کیفیت قابل اطمینان نہیں۔ طلبہ میں ذوق و شوق کا نہ ہونا متعدد اسباب کی نشاندہی کرتا ہے۔ مثلاً" بالخصوص اعلیٰ تعلیمی سطح پر معیار تعلیم اب پست سے پست ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے عمومی اسباب سے قطع نظر، جو ایک علیحدہ اور مفصل تجزیہ کے متقاضی ہیں، یہاں جامعاتی سطح پر اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نصاب بالعموم ان صفات سے عاری ہوتے جا رہے ہیں، جو طلبہ میں تنقیدی اور تجزیاتی نظر پیدا کر سکیں اور ان میں تلاش و جستجو کی صلاحیتیں عام کر سکیں۔ متعدد داخلی اور خارجی حالات طلبہ کو مطالعہ و درس کے کمروں سے نکال کر ایسے میدان میں کھڑا کر رہے ہیں، جہاں صرف تعلیم، تہذیب اور شائستگی نہیں، باقی سب کچھ ہے۔ ان کا وقت اب فضولیات میں زیادہ صرف ہونے لگا ہے اور وہ ایسی پابندیوں کے خوگر نہیں رہے جو انھیں مطالعہ و درس میں مصروف کیے رکھیں۔ اساتذہ بھی ان ہی حالات کے دھارے میں بہہ رہے ہیں۔ اپنے فرائض سے بے نیازی اور مطالعہ، درس و تدریس اور تصنیف و تحقیق جیسی سرگرمیوں سے اب ان کی دوری عام ہوتی نظر آ رہی ہے۔

ماحول کے اثرات نے جامعات کو بھی اس حد تک متاثر کر دیا ہے کہ جہاں طلبہ بیرونی سیاسی زور و اثر اور مفادات کے ماتحت آ کر اپنی مرضی چلانا چاہتے ہیں، اساتذہ بھی باہمی گروہ بندیوں کا شکار ہو گئے ہیں اور ان کی ایک تعداد، چاہے داخلی سیاست کے زور پر سہی، اب اس قدر توانا ہو گئی ہے کہ ان کے لیے روز مرہ کے تدریسی اور متعلقہ فرائض کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کئی کئی دن وہ تدریسی فرائض انجام نہیں دیتے، بلکہ اپنے شعبوں میں بھی نہیں پہنچتے اور کوئی ان سے باز پرس کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ چونکہ بعض صدور شعبہ اور ارباب اقتدار خود ایسی ہی توانائیوں اور قوتوں سے مالا مال ہو گئے ہیں اور

اپنے بھی کچھ مفادات رکھتے ہیں' اس لیے نہ صرف وقت پڑنے پر ایسی بد اعمالیوں کی طرف سے چشم پوشی کر لیتے ہیں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ان دونوں طبقات کے مقدر میں "راوی ان دنوں عیش ہی عیش" لکھتا ہے۔

پیش رفت کے لیے تدابیر

ان حالات میں جامعات کی تدریسی زندگی معیار تعلیم کی مثالی حدود کو کیوں کر چھو سکتی ہے؟ یہی صورت حال ہے کہ تحقیقی ذوق و شوق جسے اساتذہ میں عام نظر آنا چاہیے--- بالعموم مفقود نظر آتا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے کئی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں مثلاً":

(ا) اساتذہ کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ باقاعدگی سے اور بلاناغہ اپنے فرائض انجام دیں' باقاعدگی سے درس دیں اور طلبہ کو حاضری کا پابند بنائیں۔ جامعات میں طلبہ کی حاضری کا قانون تو موجود ہے' لیکن اس پر عمل کم ہی ہوتا ہے۔ طلبہ کی حاضری سے خود اساتذہ کے فرائض کی انجام دہی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس طرح طلبہ کی حاضری کے توسط سے اساتذہ کے فرائض کی جانچ پڑتال صدور شعبہ اور ایک نگراں انتظامی مجلس کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ جن جامعات میں میقاتی (سمسٹر) نظام موجود ہے' وہاں اساتذہ کی اپنے فرائض سے غفلت عام نظر آتی ہے' چنانچہ یا تو یہ نظام یکسر ختم ہونا چاہیے یا انھیں اپنے ذمہ کے تدریسی اوقات کی تکمیل کا پابند کیا جانا چاہیے۔ اس طرح طلبہ کا وقت ضائع نہ ہو سکے گا اور وہ پورا نصاب پڑھ سکیں گے۔ اب یہی ان کے معیار کی بہتری کی ایک ضمانت ہے۔

(۲) اساتذہ کے لیے تحقیق کو لازمی ہونا چاہئے۔ ہر استاد کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ سال میں اس کا کم از کم ایک تحقیقی مقالہ کسی بین الاقوامی معیار کے جریدے میں ضرور شائع ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے اس مقالے کو اپنے شعبہ میں ایک سیمینار کی صورت میں پیش کرے۔ اساتذہ کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ کا انحصار اسی مقالے پر ہونا چاہیے۔ بصورت دیگر یہ سالانہ اضافہ معطل رہے تا آنکہ مقالہ شائع نہ ہو جائے=

(۳) اب بھی جامعات میں متعدد اساتذہ ایسے ہیں جنھوں نے پی ایچ ڈی نہیں کی۔ انھیں اس کا پابند کیا جانا چاہیے۔ ایسے تمام اساتذہ کی تنخواہ میں سالانہ اضافے بھی معطل رہیں، جو ان کی پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد جاری ہوں۔ جو اساتذہ پی ایچ ڈی نہ ہوں، ان کی اگلے درجے میں ترقی بھی معطل رہے۔

(۴) اساتذہ کی ایک عہدے میں ترقی کے وقت یہ بھی دیکھا جائے کہ اس استاد نے تحقیق میں کتنے طلبہ کی رہنمائی یا نگرانی کی۔ پھر تحقیق میں نگرانی کا مستحق صرف ایسے اساتذہ کو قرار دیا جائے، جن کے تحقیقی مقالات ہر سال باقاعدگی سے بین الاقوامی معیار کے مجلوں میں شائع ہوتے رہیں اور جن کی کم از کم تعداد سات یا آٹھ ہو۔

(۵) تحقیق کے نگراں اساتذہ کو، یہ لحاظ کرتے ہوئے کہ وہ کئی سال تک ایک طالب علم یا محقق کی نگرانی کرتے ہیں، اپنا قیمتی وقت اس رہنمائی کی نذر کرتے ہیں، محقق کی رفتار کار کو دیکھتے ہوئے، نگراں کو فی طالب علم کے حساب سے ضرور کچھ الاؤنس تحقیق کی تکمیل کے بعد ملنا چاہیے۔ یہ الاؤنس نگراں کی دل جمعی کا باعث ہو گا۔

(۶) بعض اساتذہ پر ان کی بزرگی، شہرت یا منصب کی وجہ سے نگرانی کا خاصا بوجھ بھی ہوتا ہے اور ان سے متعدد طالب علم منسلک رہتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایسے اپنے منصبی اور انتظامی فرائض کے ساتھ ساتھ متعدد طلبہ کی نگرانی کا یہ بوجھ کماحقہ، نباہ نہیں سکتے، چنانچہ تحقیق کا معیار قابل ذکر نہیں ہو سکتا۔ اساتذہ پر پابندی ہونی چاہیے کہ وہ ایک مختصر تعداد سے زیادہ طلبہ اپنی نگرانی میں نہیں لیں گے۔

(۷) اساتذہ کی ایک عہدے سے دوسرے عہدے میں ترقی کا انحصار مدت ملازمت پر نہیں بلکہ ان کے مجموعی تحقیقی کاموں پر ہونا چاہیے، جیسا کہ بیشتر ترقی یافتہ ممالک کی جامعات میں ہوتا ہے۔ اس کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ ہر ایک عہدے سے دوسرے عہدے میں ترقی کے لیے صرف پچھلے عہدے میں کتنے تحقیقی مقالات کی اشاعت لازمی ہو۔

(۸) جو اساتذہ باقاعدگی کے ساتھ ہر سال معیاری تحقیقی مقالات لکھتے ہوں اور وہ ایک معقول یا مثالی تعداد میں لکھ چکے ہوں تو اسی حساب سے ایسے اساتذہ کی سبکدوشی کی عمر میں اضافہ کر دینا چاہیے۔ اس موقع پر تحقیقی کاموں کی نگرانی کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

(۹) اساتذہ کو مذکورہ تمام ترقیاں اور مراعات جن تحقیقی مقالات کی بنیاد پر دی جائیں ان کے معیار کا فیصلہ ایک مجلس کے ذمے ہونا چاہیے، جس میں متعلقہ مضمون کے ماہرین شامل ہوں۔ بصورت دیگر اساتذہ کو اپنی ترقی کی درخواست کے ساتھ اخبارات اور ماہنامہ رسائل میں شائع شدہ مضامین بلکہ اسی معیار کے اپنے لکھے ہوئے مسودوں کو بھی "تحقیقی مقالات" قرار دے کر خود کو ترقی کا مستحق

قرار دیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

(۱۰) ایسے مضامین جن میں تحقیق کا رجحان بہت کم ہے، ان میں تحقیق کے لیے طلبہ کو معمولی ہی سہی، بطور وظیفہ مشاہرہ ضرور دیا جائے یا کم از کم ایک الاؤنس ملنا چاہیے جس سے وہ اسٹیشنری، نقول اور قدرے سفر خرچ وغیرہ پورا کر سکیں۔ طلبہ کو ایم فل یا پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتے وقت اور پھر ہر ماہ فیس دینا پڑتی ہے۔ ان کی ماہانہ فیس چونکہ کسی مد میں خرچ نہیں ہوتی، اس لیے اسے ختم کر دینا چاہیے۔

تحقیقی ذوق و شوق کی فراوانی، حوصلہ افزائی کے فقدان کے باوجود بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہے، اگر حوصلہ شکنی موجود نہ ہو۔ حوصلہ شکنی تحقیقی پیش رفت میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ یہ اگر موجود نہ ہو تو محقق حوصلہ افزائی کے بغیر بھی قدرے اطمینان اور آمادگی کے ساتھ تحقیق میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔ حوصلہ شکنی کی مذکورہ صورت حال میں کہ جس میں محقق کو نگران یا شعبہ کے سربراہ کے حوصلہ شکن رویے اور مجاز مجلسوں کی تاخیری کارروائیوں اور وسائل و ماخذ کی عدم دستیابی کے مسائل کے زیر اثر پیدا شدہ دل گرفتگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس طرح نہ صرف تحقیقی سرگرمیاں رک جاتی ہیں بلکہ صلاحیتوں کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔

کچھ اقدامات

اس کے تدارک کے لیے درج ذیل اقدامات مفید و موثر ہو سکتے ہیں:

(۱) ایسی صورت میں کہ طالب علم تحقیق کا خواہش مند ہے، لیکن نگران کی طرف سے اسے کسی مرحلہ پر مناسب رہنمائی حاصل نہ ہو یا کسی اصولی و علمی اختلاف یا کوئی اور وجہ ہو تو اسے نگراں تبدیل

کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن طالب علم احتراماً ایسا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ پھر ایسا کرتے ہوئے انھیں اساتذہ کی باہمی چپقلش اور گروہ بندیوں کی طرف سے بھی خدشہ رہتا ہے کہ سابقہ نگراں اسے یا اس کے منصوبہ تحقیق کی تکمیل میں کہیں کسی مرحلہ پر کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ اسی خدشے کے باعث وہ اپنے تحقیقی منصوبے سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور یوں بڑھتا ہوا کام رک جاتا ہے۔ بعض اوقات نگراں کی عدم دلچسپی بھی انھیں سست رو بنا دیتی ہے۔ بعض نگران اپنی بے نیازی کی عادت اور اپنی ناموزونی طبع کے باعث مسودہ' مطالعہ یا اصلاح کے لیے لے کر اسے بھول جاتے ہیں یا گم کر دیتے ہیں۔ ان مسائل سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت موجود نہیں۔ بجز اس کے کہ محقق نگراں کو پیش کرنے والے کام کی ایک اطلاع کسی صورت تحقیق کی نگراں مجلس میں بھی براہ راست فراہم کرتا رہے' جس کی روشنی میں نگراں مجلس خود محقق کے نگران کی رپورٹ کا ایک مقررہ عرصہ تک انتظار کے بعد نگراں سے اس کی رپورٹ کا مطالبہ کرے۔ یہ بھی ہونا چاہیے کہ نگراں کی منفی رپورٹ پر اگر محقق نظرثانی کا خواہش مند ہو تو اسے کسی صورت یہ حق ملنا چاہیے۔ ویسے یہ اصول موجود ہے کہ نگران ایک مخصوص مدت کے بعد اپنی زیر نگرانی محقق کی رفتار کار کی ایک رپورٹ خود بھیجتا ہے لیکن اس پر پابندی سے عمل نہیں کرایا جاتا۔ نگراں کو بھی مستعد رکھنے کے لیے ایسی باقاعدہ رپورٹوں پر اصرار ضروری ہے۔

(۲) محقق کی جانب سے ایم فل یا پی ایچ ڈی میں داخلہ کی درخواست اور اس پر نگران کی رضامندی مجلس نگراں میں بھیجی جاتی

ہے۔ شعبہ کے سربراہ اور رئیس کلیہ کا وسیلہ محض خانہ پری کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن بعض اوقات کہ جب محقق یا نگراں سے شعبہ کے سربراہ کے تعلقات خوش گوار نہ ہوں تو مذکورہ صورت حال میں یہ درخواست رک سکتی ہے یا تاخیر سے اپنا سفر طے کرتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ صدر شعبہ اور رئیس کلیہ کو محقق اور نگران کے درمیان ان کے منصوبہ میں مداخلت کا حق نہیں، لیکن بالعموم اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک طالب علم نے اپنی درخواست پر نگراں سے رضامندی کے دستخط کرائے اور درخواست صدر شعبہ کی خدمت مین پیش کی، لیکن صدر شعبہ نے اسے شرف قبولیت نہ بخشا۔ طالب علم سے کہا گیا کہ وہ اپنا نگراں تبدیل کر لے اور خود ایک ایسے نگران کو تجویز کیا، جو سابقہ نگران سے ہر لحاظ سے کم تر حیثیت کا حامل تھا۔ جب طالب علم نے پس و پیش کی تو درخواست واپس کر دی گئی۔ چنانچہ صدر شعبہ اور رئیس کلیہ کی مذکورہ خانہ پری کی شرط باقی نہیں رہنی چاہیے۔ اس سے مسائل تو پیدا ہو سکتے ہیں؛ سہولت پیدا نہیں ہوتی۔ درخواست نگراں کی سفارش کے ساتھ براہ راست نگراں مجلس تحقیق میں چلی جانی چاہیے، تاکہ ساری کاروائی براہ راست ہوتی رہے۔ براہ راست کاروائی اور تکمیل کاروائی پر صدر شعبہ اور رئیس کلیہ محض "معیار" کے حوالے سے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر سکتے ہیں، لیکن خانہ پری کے لیے محض ان کا دستخط کر کے اپنے نفس کو مطمئن کر لینا معیار کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ معیار کے تعین کا فیصلہ ممتحن حضرات کو کرنا ہوتا ہے۔

(۳) ممتحن حضرات کے انتخاب کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ اگرچہ بالعموم "مجلس اعلیٰ تعلیم و تحقیق" کرتی ہے، لیکن بعض صدور شعبہ اور نگران اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ اپنی مصلحتوں کے مطابق کسی محقق کو بہر صورت سند دلانے (یا بعض صدور شعبہ رخنے ڈالنے) کے لیے اپنی پسند کے ممتحن کو نامزد کراتے ہیں۔ اس صورت حال پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ پھر ممتحن حضرات کو بھی ہدایت ہونی چاہیے کہ وہ کم سے کم وقت میں اپنی واضح رائے بھیج دیں۔ بعض اوقات، مصلحتوں ہی کے تحت چند ممتحن سند کے لیے سفارش کر دیتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ مقالے کو ناقابل اشاعت قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مقالہ فی الحقیقت معیاری نہیں، بلکہ کسی دباؤ کے تحت سند کے لیے منظور کیا جا رہا ہے۔ ایسی رائے کو سند کے لیے بھی مثبت شمار نہ ہونا چاہیے۔

(۴) زبانی امتحان بھی ایک لازمے کی حیثیت رکھتا ہے---- اسے مزید بہتر صورت میں ہونا چاہیے، کیونکہ بالعموم ہماری جامعات میں یہ ایک ممتحن کے سفر آمد و رفت اور قیام اور ایک مختصر سی پرلطف محفل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، جس میں ممتحن کے علاوہ محقق، نگران استاد اور رئیس کلیہ شریک ہوتے ہیں اور یوں ایک "فرسودہ" روایت کی خانہ پری ہو جاتی ہے۔ اس ساری رسمی کاروائی کو اب ختم ہونا چاہیے اور اس کی جگہ ترقی یافتہ ممالک کی جامعات کی طرح یہاں بھی اس روایت کو قائم ہونا چاہیے کہ ایک محفل عام ہو، جس میں محقق، اس کے نگران، ممتحن اور اساتذہ و طلبہ سب ہی کو شریک ہونے کی اجازت ہو، اور اس محفل میں تحقیقی مقالہ اپنے حسن و قبح کے ساتھ

زیر بحث آئے۔ اور محقق اعتماد کے ساتھ خود اپنا دفاع کرے۔ اس کا یہ دفاع اس بات کا بھی ثبوت ہو گا کہ مقالہ خود اس کی کاوش ہے۔ ورنہ گاہے یہ سرگوشیاں بھی سننے میں آتی ہیں کہ فلاں مقالہ فلاں بزرگ کی محنت اور ضرورت کا ثمر ہے!۔

(۵) نگران اپنی استعداد تحقیق میں کمی کے باعث محقق کی مناسب رہنمائی نہ کر کے بھی متعدد نقصانات کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے نگران اپنے مذکورہ فوائد کے حصول کے لیے نگران تو بخوشی بننا چاہتے ہیں' لیکن اپنے مزاج کی نامناسبت' اپنی کم مائیگی اور ناپختگی کے باعث' نہ عمدہ موضوع کا تعین کر سکتے ہیں' نہ مناسب رہنمائی ان سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے نگراں کی استعداد کار کا تعین ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ضرور دیکھا جانا چاہیے کہ نگراں نے خود کتنے اور کس معیار کے تحقیقی کام کیے ہیں۔ اس کا فیصلہ ایک مجلس ماہرین کے سپرد ہونا چاہیے۔ اس طرح دو فوائد حاصل ہوں گے ایک تو محقق کو مناسب نگراں مل سکیں گے اور چونکہ نگراں کو نگرانی سے مذکورہ فوائد بھی حاصل ہوں گے اس لیے اساتذہ نگراں بننے کے لیے خود کو اس کا اہل بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔

(۶) ایسے شعبوں میں جہاں طالب علم کو موضوع کے انتخاب کی آزادی حاصل ہوتی ہے' وہاں بعض اوقات موضوع کا انتخاب طلبہ کو تھکا ڈالتا ہے اور کبھی کبھی مایوس کر کے ان کی توجہ دوسرے کاموں کی طرف پھیر دیتا ہے موضوع کا انتخاب تمام تر انھی کی صوابدید پر ہونا چاہیے' ہاں اس سلسلہ میں نگران' شعبہ یا مجلس تحقیق کی جانب سے رہنمائی اور ترمیم و تنسیخ مناسب ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات ایک

موضوع محقق نگراں اور صدر شعبہ سے گزر کر مجلس تحقیق میں پہنچتا ہے تو رد ہو جاتا ہے اور اس طرح محقق کی محنت اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ اس ضیاع اور مایوسی سے بچنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے ہی سے متعدد موضوعات کا انتخاب شعبہ کی سطح پر متفقہ طور پر کر لیا جائے اور ان کی منظوری نگراں مجلس تحقیق سے کرالی جائے۔ پھر اس سے بچنے کے لیے کہ ان موضوعات پر کسی اور جامعہ میں کام ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے، دیگر جامعات سے اس ضمن میں معاونت حاصل کرنی چاہیے۔ ہر چند ماہ بعد ایسی اطلاعات حاصل کی جائیں، جن سے معلوم ہو سکے کہ کہاں کہاں، کیا کیا کام ہو چکے ہیں اور کن کن موضوعات پر کام جاری ہے۔ اس بات کا خاصا امکان رہتا ہے کہ کسی موضوع پر کہیں کوئی کام شروع کیا گیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر کسی اور جگہ بھی یا تو کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ اس صورت میں موضوع کے ساتھ ساتھ محنت اور وقت کا زیاں بڑی حد تک ممکن ہے۔ موضوعات کی تکرار صرف اس صورت میں جائز ہو سکتی ہے کہ جب سابقہ تحقیق نامکمل اور تشنہ یا ناقص سمجھی جائے اور اس میں فی الواقع اضافہ مقصود ہو۔ یہ بھی ممکن ہے مرکزی طور پر یا بین الجامعاتی باہمی تبادلہ خیالات کے بعد ایسے موضوعات کی ایک فہرست تیار کر لی جائے، جن پر کام ہونا چاہیے۔ پھر ان موضوعات کو تقسیم کر لیا جائے اور ترجیح اچھی موضوعات کو دی جائے۔

(۷) تحقیق کے جملہ مسائل اور مدارج بالعموم جامعہ کی ایک ایسی عمومی مجلس طے کرتی ہے، جس کو صرف تحقیق کے مسائل اور معاملات نہیں بلکہ دیگر کئی متنوع مسائل اور امور انجام دینے ہوتے

ہیں۔ اکثر اوقات اس مجلس کے جلسوں میں وقت کی اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ دیگر امور کے علاوہ تحقیق کے اہم اور جزوی امور بھی خصوصیت کے ساتھ زیر غور آسکیں۔ پھر یہ جلسے عموماً ایک ایک ماہ کے وقفے سے ہوتے رہتے ہیں، جن میں داخلی اور خارجی حالات کے باعث اور جامعہ کی بندش کی صورت میں طویل طویل وقفے بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ حالات تحقیقی رفتار میں سست روی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے یہ بہتر ہو گا کہ تحقیق کے کل معاملات کی انجام دہی کے لیے ایک مخصوص مجلس ہر جامعہ میں تشکیل دی جائے، جس کے جلسے چاہے ماہوار ہی سہی باقاعدگی سے ہوتے رہیں تاکہ وقت کے ضیاع کے بغیر جلد جلد فیصلے ہو سکیں اور رفتار کار میں اضافہ ہو سکے۔

ماخذ کی عدم دستیابی اور ان سے استفادے میں حائل رکاوٹیں غالباً سب سے اہم مسئلہ ہے، جس سے عام اور جامعاتی تحقیق یہاں سامنا کرتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ہمارے ہاں ابھی تک تحقیق کے بنیادی وسائل اور ماخذ کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا۔ حد تو یہ ہے کہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے کو یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ اس کے موضوع دلچسپی پر اب تک کیا کیا کام ہو چکا ہے، کون کونسی کتابیں یا مقالات شائع ہو چکے ہیں اور یہ کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں تو بہت سے نگراں بھی ان کے ہمسر ہوتے ہیں۔

کتب خانہ اور ماخذ

سطور بالا میں ماخذ کی عدم دستیابی اور ان سے استفادے میں حائل جن رکاوٹوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان کے تدارک کے لیے درج ذیل اقدامات کیے

جا سکتے ہیں:

جامعات میں ماخذ کا کل ذخیرہ ان کے کتب خانوں یا ان سے ملحقہ اداروں میں موجود محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن کوئی تحقیق اور وہ بھی اگر معاشرتی علوم کے موضوعات سے متعلق ہو تو کسی ایک کتب خانہ میں، چاہے وہ کیسا ہی باثروت کیوں نہ ہو، مکمل نہیں ہو سکتی۔ بڑے سے بڑا ذخیرہ کتب و ماخذ تنہا کسی تحقیقی منصوبے کی تکمیل کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ پھر اس صورت میں کہ ہماری جامعات کے کتب خانے ایک تو نامکمل ہیں اور دوسرے متعدد بدانتظامیوں کا شکار، یہ تحقیق کی تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتے۔ ان سے بہتر اور مناسب استفادہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب ایک نگراں مجلس تحقیق کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کتب خانے کی کارکردگی اور فراہمی وسائل کے درج ذیل امور و معاملات پر کڑی نظر رکھے:

(۱) کتب خانے کے ذخائر کی ترتیب و تنظیم، خلوص و جان فشانی کے ساتھ کی جائے تاکہ وہ محفوظ اور قابل استعمال رہ سکیں۔

(۲) ان میں موجود مشینی آلات، ہر محقق کے لیے ہر وقت قابل استعمال اور دستیاب رہیں۔

(۳) محققین کو ہمہ وقت کتابوں اور مائکرو فلم وغیرہ سے مطلوبہ عکس کے حصول کی سہولتیں حاصل رہیں۔

(۴) کتب خانے میں موجود کل ذخائر، مخطوطات، محفوظات، نوادرات اور دستاویزات وغیرہ کی فہرستیں عام استفادے کے لیے شائع کی جائیں تاکہ دیگر جامعات اور بیرونی اداروں میں بھی ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

(۵) تمام جامعات کے کتب خانوں میں موجود ذخائر کی مشترکہ

فہرستیں بالخصوص مرتب کر کے شائع کی جائیں۔

(۶) جامعات کے مابین ذخائر کی عکسی نقول کی فراہمی کا سلسلہ عام اور مستقل رہے تاکہ طلبہ ایک ہی جگہ رہتے ہوئے بھی دیگر جامعاتی کتب خانوں سے استفادہ کر سکیں۔

(۷) جامعات کے باہر موجود ذخائر' اور کتب خانوں کی فہرستیں بھی جامعات میں موجود ہوں اور جامعات عام و خاص کتب خانوں اور اداروں سے مطلوبہ مواد کے عکس حاصل کر سکیں۔

(۸) ہر کتب خانہ میں موجود تمام رسائل کے وضاحتی اشاریے مرتب ہوں اور وہ شائع بھی ہوں۔ اسی طرح ایسی مطبوعات جن میں متفرق موضوعات پر مضامین یا مقالات شامل ہوتے ہیں' ان کی کیٹلاگ سازی کے وقت اس امر کا التزام رکھا جائے کہ ہر مضمون اور مقالہ کا اندراج بھی علیحدہ کارڈ پر کیا جائے' تاکہ مضامین اور مقالات سے استفادہ بہ آسانی ممکن ہو سکے۔

(۹) تمام پاکستانی مطبوعات کی سالانہ فہرستیں باقاعدگی سے متعلقہ اداروں کے اہتمام سے شائع کیے جانے کا بندوبست کیا جائے۔

(۱۰) جامعات یا کوئی ذمہ دار ادارہ ہمارے مفید مطلب مواد کی' جو دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے' جامع فہرستیں تیار کرے تاکہ محققین کے لیے رہنما ثابت ہو سکیں۔

(۱۱) اب رفتہ رفتہ ہمارے ہاں قدیم اخبارات و رسائل کے وضاحتی اشارے بنانے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے' لیکن یہ رفتار نہایت سست اور ابھی نجی سطح تک محدود ہے۔ خصوصاً" تحریک آزادی و تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان کے موضوعات کو پیش نظر رکھ کر تمام

قدیم اخبارات کے وضاحتی اشاریے جامعاتی کتب خانوں کے اپنے منصوبوں کا حصہ بننا چاہئیں اور انھیں اس کا پابند کیا جانا چاہیے۔ پھر یہ کام متعلقہ مضامین کے شعبوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً" شعبہ علم کتاب داری' مطالعہ پاکستان' تاریخ و سیاسیات اور ادبیات کے شعبے اپنے اپنے موضوع پر وضاحتی اشاریے بنا سکتے ہیں۔

(۱۲) ایسی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں' جن کے تحت ہر نئی اہم کتاب شائع ہوتے ہی جامعات کے کتب خانوں میں پہنچ جائے اور اس میں غیر ملکی مطبوعات بھی شامل ہوں۔

چونکہ جامعات تحقیقی پیش رفت کا ایک اہم ادارہ ہیں' اس لیے انھیں خلوص اور مستعدی کے ساتھ ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں کہ محقق سہولت اور بے فکری کے ساتھ اپنے منصوبے مکمل کر سکیں۔ تحقیق کے جن بے شمار مسائل سے جامعات دو چار ہیں ان کے مناسب حل اور معیاری تحقیقات کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرح کا کوئی مستقل اور با اختیار ادارہ تشکیل دیا جائے جو تحقیق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات و مسائل پر نظر رکھے اور انھیں حل کرنے کی تدابیر اختیار کرے۔ یہ ادارہ قومی' تہذیبی اور علمی و تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر ایسی تدابیر اختیار کرے جو تحقیقی پیش رفت کی رفتار نہ صرف تیز کریں بلکہ اس ضمن میں پیش آنے والے مسائل کے حل تلاش کرے' محققین اور جامعات کے لیے وسائل اور ماخذ کی فراہمی میں معاون بنے اور تحقیق کے معیار پر نظر رکھے۔ اس ادارہ کی شاخیں تمام جامعات میں قائم ہونی چاہئیں' جو ایک طرف تو داخلی ضرورتیں پوری کر سکیں اور دوسری طرف اپنے مرکز اور دیگر جامعات اور تحقیقی اداروں سے ضروری رابطہ قائم رکھیں۔ یہ مرکزی ادارہ اپنی

کوششوں سے جہاں دیگر متعدد مسائل کو اپنی خصوصی توجہ سے حل کر سکتا ہے' وہیں ماخذ کی کمی کو دور کرنے کی تدابیر بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو ماخذ مختلف مقامات پر محفوظ ہیں' وہ اس حالت میں ہیں کہ ان کی فہرستیں تک میسر نہیں آتیں۔ ان کے علاوہ ذاتی اور نجی کتب خانوں' درس گاہوں اور مسجدوں کے کتب خانوں میں بھی نادر مطبوعات و مخطوطات بکھرے پڑے ہیں' جن کی حفاظت اور جن سے استفادے کی کوئی سہولت موجود نہیں۔ سرکاری سرپرستی کے تحت یہ ادارہ تمام کتب خانوں اور ذاتی و نجی ملکیت کے ذخائر کی فہرستیں مرتب اور شائع کرا سکتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر ایسے ذاتی اور نجی ذخائر' جن سے عام افراد استفادہ نہ کر سکیں' ان کا عکس حاصل کر کے ان کی نقول مختلف کتب خانوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ اس طرح نادر کتابوں' مخطوطات اور دستاویزات کی قومی دولت ضائع ہونے سے بھی بچ جائے گی۔

ہمارے ہاں اصول تحقیق و ترتیب متن کا لحاظ بھی بالعموم نہیں رکھا جاتا۔ محققین ان معاملات میں خاصی بے نیازی برتتے ہیں اور مقالہ نگاری کے لوازمات کے ضمن میں قدیم اور فرسودہ روایتوں کی پیروی کیے جاتے ہیں یا بعض محققین کے پاس تو سرے سے کسی اصول اور قاعدہ کا اطلاق نظر نہیں آتا۔ حواشی اور حوالے کے لیے ان کے اپنے اصول ہوتے ہیں اور اکثر تو ان سے بھی بے نیازی برتی جاتی ہے۔ طلبہ تو ایک طرف اکثر نگراں اور بزرگ محقق بھی جدید اصول تحقیق سے بے نیاز اور ناواقف ہیں اور چونکہ جدید تحقیقی مطالعات ان کی نظر سے نہیں گزرتے اس لیے تحقیق کے حالیہ اسلوب و اصول کے بارے میں ان کا علم ناکافی ہوتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے' ان کی زیر نگرانی تحقیق کار اگر خود بھی کورے ہوں تو پھر تحقیقی اسلوب کا معیار فرسودگی ہی کا حامل ہوگا۔ اس عیب کو دور کرنے اور اصول تحقیق و ترتیب متن میں

سائنسی طریقہ کار اور یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق کا مذکورہ مرکزی ادارہ ایسے جدید اصول وضع کرے جو سائنٹفک بھی ہوں اور ترقی یافتہ علمی دنیا میں مروج بھی ہوں' پھر ان اصولوں کو تمام جامعات کے لیے معیار قرار دیا جائے اور ان ہی پر عمل کرنے کی تلقین کی جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جامعات میں ایک "قبل تحقیق تربیتی نصاب" شروع کیا جائے' جو محققین کی تربیت و رہنمائی میں مفید ثابت ہو۔ اس میں کامیابی کے بعد ہی کسی طالب علم کا داخلہ تحقیق کے لیے منظور کیا جائے۔

موضوعات کی افادیت بھی ایسا مسئلہ ہے' جو بالارادہ مشکل ہی سے پیش نظر رہتا ہے۔ ہمارے ہاں معاشرتی علوم کے جن مضامین میں تحقیق کی رفتار کار تیز ہے' مثلاً" ادبیات یا جنوبی ایشیا کی تاریخ و سیاست---- ادبیات میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان میں شخصی مطالعے سب سے زیادہ ہوئے ہیں' پھر اصناف ادب اور قدرے ماحولیاتی جائزے۔ موخرالذکر پہلو کے تحت ادبی موضوعات کا مطالعہ ان کے فکری' تہذیبی اور سیاسی حوالے سے بہت کم ہوا ہے۔ پھر ایسے ادبی موضوعات جو ہماری قومیت کے مزاج اس کی تشکیل اور ارتقاء سے متعلق ہوں یا تعمیری و افادی پس منظر یا مقصد رکھتے ہوں--- مطالعہ کا موضوع نہیں بنائے گئے۔

یہی صورت دوسرے مضامین مثلاً" تاریخ و سیاسیات اور مطالعہ پاکستان میں بھی نظر آتی ہے۔ ہماری ملی اور قومی ضرورتوں کا ایسا لحاظ ان میں کم رکھا گیا ہے' جن سے مثلاً" برعظیم پاک و ہند میں مسلم ملت کو درپیش مسائل' ان کا پس منظر اور اس میں مسلم ملت کے رویہ اور رجحانات کے حقیقی پہلو سامنے آسکیں۔ ادبیات میں بالخصوص اردو زبان و ادب سے متعلق تحقیقی منصوبوں میں قدیم اور غیر مطبوعہ متون کی ترتیب و تدوین کو زیادہ اہمیت دی

جانی چاہیے تاکہ ہمارا بیشتر قدیم سرمایہ جو' ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا' سامنے آئے اور ہمارا ادبی و تہذیبی خلا پر ہو سکے۔ متون کی ترتیب و تدوین صرف ادبیات ہی کے تحت اہمیت کی حامل نہیں' تاریخ و سیاسیات سے تعلق رکھنے والے متون بھی اپنی ناگزیر اہمیت رکھتے ہیں۔

ایسے موضوعات کا تعین اور ان کی فہرست ہر مضمون کی حد تک تحقیق کی نگراں مجلس 'راست فکر ماہرین اور دانشوروں کے تعاون سے تیار کر کے جامعات کے لیے جاری کر سکتی ہے تاکہ انھیں ترجیح دی جائے۔

جامعات کو تحقیق کی مدات میں جو سرمایہ فراہم ہوتا ہے' اسے کسی بھی مناسبت سے منصفانہ تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ ادارہ اس ضمن میں سرمایہ کی منصفانہ تقسیم کا فریضہ بھی انجام دے سکتا ہے۔ بعض جامعات اپنے طور پر تحقیقی مجلوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کرتی ہیں' مثلاً" معاشرتی علوم اور ادبیات کے شعبوں میں جامعہ پنجاب نے تحقیقی مجلوں کی اشاعت کی بڑی مستحسن اور موثر روایات قائم کی ہیں۔ جامعہ کراچی میں بھی ایک عرصہ قبل ایسی ایک روایت موجود رہی ہے' لیکن یہاں اور دیگر جامعات میں تحقیقی مجلوں کی اشاعت کی یہ روایت مستحکم اور عام نہیں ہو سکی۔ مذکورہ ادارہ اس مد میں ہر جامعہ کو خصوصی اور مناسب سرمایہ فراہم کرے تاکہ تمام جامعات تحقیقی مجلوں کی اشاعت کو باقاعدگی دے سکیں اور تحقیق کار اپنے مقالات کی اشاعت کے لیے فکرمند نہ ہوں۔

یہی ادارہ جامعات میں مکمل ہونے والے عمدہ تحقیقی مقالات کو منتخب کر کے اپنے وسائل سے شائع کرنے کا اہتمام کرے' تاکہ عمدہ تحقیقات سامنے آ سکیں اور محققین کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ ہمارے ہاں اگر تحقیقات ہوئی بھی ہیں تو بیشتر کو اشاعت کی خوش بختی حاصل نہ ہوئی۔ ہمارے یہاں کتابوں کی

اشاعت کے مسائل اور اس کی دشواریوں نے بھی محققین اور تحقیقی اداروں کو تیز رفتاری سے روک رکھا ہے۔ ہم اس مسئلہ میں دیگر ترقی پذیر ممالک سے بھی بہت پیچھے اور کم تر ہیں۔ مثلاً" بھارت میں کتابوں کی سالانہ اشاعت کا تناسب اگر بیس ہزار ہے تو ہمارے ہاں اس کا تناسب صرف پانچ سو ہے۔ آبادی کے فرق کے لحاظ سے ہمارے درمیان فرق تو رہنا چاہیے تھا لیکن یہ ایک اور چالیس کا فرق بہرحال ہمیں سوچنے اور سنبھلنے کی دعوت دیتا ہے۔

میری یہ معروضات تمام تر میری حقیر سی معلومات' شنیدہ و دیدہ' پر مبنی ہیں۔ جن مسائل اور مشکلات اور عدم توجہی سے ہماری جامعات میں تحقیق دوچار ہے اور ان کے حل کے لیے جس توجہ اور جن تدابیر کی متقاضی ہے' مجھے یقین ہے' یہاں میں ان سب کا احاطہ نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن یہ موضوع اپنی اہمیت کے پیش نظر ہم سب کی اور بالخصوص متعلقہ ذمہ دار افراد اور اداروں کی پرخلوص توجہ چاہتا ہے۔ تحقیق کے معیار کی بلندی اور اس کی رفتار میں اضافہ ہمارے تہذیبی استحکام کا ثبوت اور ہماری ہمہ جہت ترقی کا پیش خیمہ ہو گا۔

(انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد کے سیمینار منعقدہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء میں پیش کیا گیا۔ اور بعد میں تعلیم اسلامی تناظر میں (۸) مرتبہ: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا)

مصنّفین اردو کالج، کراچی

اردو برعظیم پاک و ہند میں اسلامی تہذیب کا بہترین ورثہ ہے۔ برعظیم کے ماحول، مختلف تہذیبوں کے تصادم، سماجی اور معاشرتی عوامل کے علاوہ---- بیشترت اداروں نے بھی، شعوری طور پر اس کی نشوونما کا اہتمام کیا۔ دہلی کالج، علی گڑھ کالج، جامعۂ عثمانیہ وغیرہ نے اردو کی ترویج و اشاعت کے ذریعے مسلمانوں کو برعظیم میں وہ شعور بخشا جو آگے چل کر اپنے سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں تشکیل پاکستان کا سبب بنا۔ پاکستان میں مسلم قومیت کے شعور کو ضروری تقویت دینے کے لیے علی گڑھ کالج اور جامعہ عثمانیہ جیسے اداروں کی ضرورت تھی جہاں تہذیب و روایات کو اہمیت دی جاتی۔ چوں کہ ہر زبان کا ایک تہذیبی و تاریخی پس منظر ہوتا ہے، وہ اپنے عہد کی تہذیب اور معاشرے کی ترجمان بھی ہوتی ہے اور سیاسی اور سماجی شعور کو پیدا کرنے اور بیدار کرنے کا وسیلہ بھی بنتی ہے اس لیے کسی قوم و ملک کی ترقی کا انحصار بڑی حد تک قومی زبان کے فروغ پر ہوتا ہے۔ اردو کالج کراچی نے، اپنی بساط کی حد تک ذمہ داری کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ محض تعلیمی درس گاہ ہی نہیں---- علی گڑھ کالج اور جامعہ عثمانیہ کی طرح---

ایک قومی تحریک (کا ادارہ) بھی ہے۔

اردو کالج ۱۹۴۹ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے قائم کیا۔ اس کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ جملہ مضامین اردو میں پڑھائے جائیں۔ چنانچہ اس میں تمام مضامین سائنس، تجارت، قانون اور فنون اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ملک کے نامور، ممتاز اور تبحر اساتذہ اس کالج سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کے کام میں بھی امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ جب کراچی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اردو کالج کے بیشتر اساتذہ نے یونیورسٹی کے اساتذہ کی کمی کو پورا کیا۔ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی یہاں کے اساتذہ موجود ہیں۔ وہ اساتذہ جو کبھی اردو کالج سے وابستہ رہے ہیں اور اب ملک کے مختلف اداروں میں کام کر رہے ہیں، ان میں سے ڈاکٹر غلام مصطفے خان، صدر شعبہ اردو جامعہ سندھ، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر عبدالقیوم، مظہرالدین صدیقی، احمد عبداللہ المسدوسی مرحوم، مولانا مظہر علی کامل مرحوم، مولوی عبدالرشید فاضل، میجر آفتاب حسن، پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر مرحوم، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر عظمت اللہ خان، پروفیسر عین الحق، پروفیسر ابصار عالم، مولوی قمرالدین خاں وغیرہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

اردو کالج سے فارغ التحصیل طلبہ، جو اب مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں، ان میں بھی بہت سے ممتاز مصنفین اور شعراء ہیں۔ جیسے ڈاکٹر تنزیل الرحمان، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ابن انشاء، محشر بدایونی، حفیظ الرحمان صدیقی، شائستہ زیدی وغیرہ۔ (۱) ایسے مصنفین اور شعراء پر، جو ہر دو حیثیتوں میں اردو کالج سے وابستہ رہے ہیں مبسوط تحقیقی مقالہ کی ضرورت ہے۔

اردو میں سائنس، قانون اور تجارت پر نصابی کتب کا ذخیرہ کچھ کم نہیں

ہے، لیکن علوم کی روز افزوں ترقی ان کتب کو ناکافی قرار دیتی ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی روشنی میں نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اردو کالج میں ۱۹۵۲ء میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا جس کے قیام کا مقصد جدید علوم کے تراجم کے علاوہ کالج اور یونیورسٹی کی نصابی کتب کی اردو میں تالیف کرانا اور مختلف علوم کی معیاری اصطلاحات وضع کرنا تھا۔ اس شعبہ کے تحت اردو کالج کے اساتذہ نے اب تک ۶۷ کتابیں تصنیف و تالیف کیں (۲) پھر یہ شعبہ مالی کمی کی وجہ سے معطل سا ہو گیا۔ اب کالج کا نیا دور شروع ہوا ہے، توقع ہے کہ اب یہ شعبہ فعال ہو کر تصنیف و تالیف و ترجمہ کے میدان میں نمایاں کارگزاری دکھائے گا۔ زیر نظر سطور میں ایسے مصنفین کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے، جو اس وقت اردو کالج سے وابستہ ہیں۔ کالجوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد سے اردو کالج کا کلیہ سائنس اب ایک علیحدہ اور مستقل کالج کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اب اس کا قدیم اردو کالج سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ (۳)

گورنمنٹ اردو کالج میں اس وقت اکتیس اساتذہ موجود ہیں۔ ان میں سے سترہ اساتذہ صاحب تصنیف و تالیف ہیں۔ بیشتر کی تالیفات ملک بھر نصابی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہیں۔ اور چند اساتذہ علمی اور ادبی دنیا میں اپنی ایک مخصوص حیثیت کے حامل ہیں۔ ان سترہ اساتذہ میں سے ۴۱ فی صد اسی کالج سے فارغ التحصیل ہیں۔

پروفیسر محمد خلیل للہ (۴)

آج کل اردو کالج کے پرنسپل ہیں بہت فعال اور مستعد شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے نصابی اور غیر نصابی موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کی

ہیں لیکن تقریباً سب ہی نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور یہ کراچی بورڈ اور کراچی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔

۱۔ دساتیر عالم: بی اے اور ایم اے کے نصاب میں شامل اپنے موضوع پر ایک آسان اور مفید جائزہ ہے۔

۲۔ دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان: ۱۹۵۶ء کے دستور کا تعارفی اور تجزیاتی مطالعہ ہے' یہ بی اے اور ایم اے کے نصاب کے لیے معاون ہے۔

۳۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی: بیک وقت بی اے' ایم اے' سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے مضامین کے لیے مفید ہے۔ ایک عام قاری کے لیے اپنے موضوع پر معلومات افزا ہے۔

۴۔ تحریک پاکستان: یہ کتاب تحریک آزادی ہند اور مسلمانوں کی جدوجہد کی داستان کو بیان کرتی ہے۔ اس میں مصنف نے تحریک کے تقریباً تمام گوشوں کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سیاسیات کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔

۵۔ قانون دستوری: اصول قانون پر مبنی ہے۔ ایم اے سیاسیات کے ایک پرچہ اور ایل ایل بی کے نصاب کے لیے مستقل ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔

۶۔ علاقائی تعاون برائے ترقی' اور

۷۔ شہریات پاکستان: سیاسیات اور عمرانیات کے موضوع پر ہیں۔ اور اپنے مضامین کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔

۸۔ تجوید القرآن:۔ حصہ اول

۹۔ تجوید القرآن:۔ حصہ دوم۔ قرآن حکیم کے فن تجوید پر مفصل کتب ہیں۔ اس سے قبل بھی اس موضوع پر کافی لکھا جا چکا ہے' لیکن کوئی مستقل اور مفصل تصنیف عام طور پر دستیاب نہیں تھی یہ کتابیں آسان انداز سے فن تجوید

کے مختلف عناصر کو پیش کرتی ہیں

(۵) پروفیسر شمیم احمد:

اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہیں اور صدر شعبہ تجارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ تمام کتابیں جو انھوں نے تصنیف کیں' اپنے موضوع تدریس سے متعلق ہیں۔

۱۔ کاروباری طریقے: اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔
۲۔ تجارتی حساب نویسی: اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن چھپے ہیں۔
۳۔ اصول تنقیح: اپنے موضوع پر کامیاب کتاب ہے۔
۴۔ اصول محاسی:۔
۵۔ انکم ٹیکس گائیڈ:۔
۶۔ بک کیپنگ: یہ کتاب روپ رام گپتا کی "بک کیپنگ" کا اردو ترجمہ ہے۔
۷۔ آڈیٹنگ:۔
۸۔ مبادیات تجارت: (زیر اشاعت)۔
۹۔ اصطلاحات بنکاری: یہ کتاب انجمن ترقی اردو کے مقاصد کے تحت شائع ہوئی تھیں' شمیم احمد صاحب نے اس کی ترتیب میں مولوی عبدالحق اور زاہد حسنی مرحوم کے ساتھ کام کیا تھا۔(۶)

(۷) پروفیسر ممتاز حسین

اردو ادب کے اہم ترقی پسند نقاد ہیں۔ ایک دور میں افسانے بھی لکھے مگر تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ان کی تنقید بڑی ٹھوس اور پر مغز ہوتی ہے اپنے خیالات کو دلائل اور تاریخی شواہد سے متعلق کرتے ہیں۔ عقلیت کے بھی قائل ہیں چنانچہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ مستقل تصانیف

سے زیادہ مضامین و مقالات تحریر کیے ہیں۔

۱۔ **غالب ایک مطالعہ:** غالب کے کلام کا تجزیاتی، فکری اور عقلی مطالعہ ہے۔ اس تصنیف پر رائٹر گلڈ نے مصنف کو انعام بھی دیا تھا۔

۲۔ **انتخاب غالب:** غالب کے کلام کا انتخاب ہے جسے مرتب کر کے ایک پر مغز مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

۳۔ **باغ و بہار:** ممتاز حسین صاحب کی یہ ایک اور مرتبہ تصنیف ہے۔ میر امن کی اس کتاب کو انھوں نے مرتب کر کے تصحیح کے بعد مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا۔

ان کے علاوہ ان کے مضامین کے مجموعے ہیں جو کتابی صورتوں میں آنے سے قبل مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ **نقد حیات:** ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب میں جو مختلف مسائل پیدا ہوئے ان کے متعلق اس مجموعہ مضامین میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ خصوصاً "کلچر اور فرقہ پرستی" "غزل کی ہیئت" "تنقید کا مارکسی نظریہ" وغیرہ۔

۲۔ **نئی قدریں:** اس مجموعہ مضامین میں موضوعات کو ایک نئے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں شامل یہ مضامین زیادہ مثالی ہیں۔ "نیا ادبی فن" "تغزل اور انقلابی شاعری" "چند ادبی اصطلاحیں" "اردو ادب میں انیس کی جگہ" "وجدان" وغیرہ۔

۳۔ **ادبی مسائل:** اس مجموعہ میں نئے ادبی مسائل کو اپنے مخصوص نقطہ نگاہ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ **تنقیدی گوشے:** اس میں تنقید کے نئے خد و خال اور دبستان و شخصیات پر نظر ڈالی گئی ہے۔

۵۔ **ادب اور شعور:** مختلف موضوعات پر مبنی مضامین کا مجموعہ ہے۔ بعض

مضامین زبان، لہجہ اور اسلوب کے مسائل پر ہیں۔ جیسے "نثر معلّی" "رسالہ اور معرفت استعارہ" "اسٹائل" اور کچھ قومی اور ادبی مسائل کے بارے میں ہیں: "کلچر اور ادب" "ہماری تہذیبی جدوجہد" "قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت" "قومیت کے معمار--- ادیب" بعض ادب، فن اور تنقید کے مختلف مسائل اور موضوعات پر ہیں۔ "تنقید کے چند بنیادی مسائل" "فن اور فطرت" "ادب اور سائنس" "ادب اور شخصیت" "کردار نگاری" اور کچھ مضامین شخصیات پر ہیں۔ ان میں کچھ تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہیں جیسے "غالب--- ایک تہذیبی وحدت"، "حالی---اردو کا پہلا نقاد" "حسرت کی غزل گوئی" "ناول نگار منشی پریم چند" "فیض کی شاعری" اور چند ادبی تاثرات میں۔ "راشد کی شاعری کا کیرکٹر" "مجاز کی موت پر" "منٹو کی یاد میں" وغیرہ۔

اس وقت ممتاز حسین کی دو تصانیف زیر اشاعت ہیں:

۱۔ جدید شاعری کے جمالیاتی اصول: اس کے کچھ ابواب "ادب لطیف" لاہور اور "فنون" لاہور میں شائع ہوئے ہیں جن میں شاعری اور جمالیات زیر بحث رہی ہیں۔

۲۔ نقد حرف: یہ مختلف النوع موضوعات پر مبنی مضامین کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر منیر الضیاء قادری (۸)۔

اردو کالج ہی کے مایہ ناز طالب علم رہے ہیں۔ آج کل شعبہ جغرافیہ کے صدر ہیں۔ اپنے مضمون پر ان کے دقیع اور تحقیقاتی مقالے شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ ٹھٹہ:۔

۲۔ جنگ شاہی: اس پر انھوں نے دو تحقیقاتی کتابچے لکھے ہیں۔

پروفیسر محمد فائق (۹)

اردو کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبہ نفسیات ہیں۔ یہ نفسیات اس وقت سے پڑھا رہے ہیں جبکہ یہ مضمون طلبہ میں مقبول نہیں تھا اور اردو میں اس پر یہاں نصابی کتب بھی دستیاب نہیں تھیں۔ محض جامعہ عثمانیہ اور دیگر مطالعہ کی چند نصابی کتب موجود ضرور تھیں لیکن ایک تو ادق اور قدیم طرز ترجمہ کی حامل تھیں اور دوسرے نفسیات کے جدید تر علم اور اس کی نصابی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ فائق صاحب کی مساعی اس سلسلے میں قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے کراچی بورڈ اور کراچی یونیورسٹی کے نصاب پر مبنی عمومی نفسیات اور اختباری نفسیات پر مناسب اور مفید کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ مسائل نفسیات: نفسیات کے موضوع، حدود اور اس کے عام مسائل کا احاطہ کرتی ہے عمومی نفسیات کے سارے علم کو مختصراً" پیش کر دیتی ہے۔ یہ انٹر کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

۲۔ اختباری نفسیات: یہ کتاب انٹر کے باقی ماندہ نصاب کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں نفسیات کے اختباری یا تجربی مسائل کا مناسب اور ضروری تعارف ہے۔ یہ اپنے موضوع کی حد تک تقریباً" تمام اہم، بڑے اور ضروری عنوانات کی تشریح کرتی ہے اس کتاب کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳۔ نفسیات کے اختباری مسائل: یہ کتاب بی اے کے نصاب میں شامل ہے اس میں اختباری نفسیات کے عنوانات کی ایک تو مزید تشریح ہے اور اس کے ماسوا بی اے کے نصاب میں شامل کچھ اور اختباری مسائل کی وسیع پیمانہ پر توضیح کرتی ہے۔ ادق اور گنجلک مسائل کو بڑی آسان مثالوں کے ذریعہ سمجھانے

کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی اختباری طریقہ کار کی وضاحت بھی اس میں موجود ہے۔

۴۔ نفسیات کے اختبّاری خاکے: یہ تصنیف بیک وقت انٹراور بی اے کے طلبہ کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں اختباری اور تجربی طریقہ کار کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے۔

۵۔ ابتدائی شماریات: یہ نفسیات اور شماریات کے تعلق سے لکھی جانے والی ابتدائی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں ایک تو شماریات اور نفسیات کے تعلق واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسرے شماریات کے علم کو آسان اور سلیس انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ یہ انٹر کے نصاب میں شامل ہے۔

۶۔ سماجی نفسیات: اس میں سماجی نفسیات کی مختصر تاریخ، اس کا موضوع اور اس کے مباحث نصابی حدود میں رہتے ہوئے بیان ہوئے ہیں۔ بی اے اور ایم اے نفسیات کے پرچے کے لیے مفید ہے۔ ایم اے عمرانیات کے ایک پرچہ کے سلسلہ میں بھی طلبہ اس سے مدد لیتے ہیں۔

۷۔ نفسیات: عام علم نفسیات اور اس کے موضوع و مسائل کے تعارف پر مشتمل ہے۔ یہ انٹر کے نصاب کے لیے مفید ہے۔

مولانا محمد متین الخطیب (۱۰)

ملک کے نامور مذہبی علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو کالج کے شعبہ اسلامیات میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں ایک کتاب "اسلام کا نظریہ حیات" آپ کی تصنیف ہے۔ اس میں اسلامی نظام زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ یہ کتاب بی اے اور بی ایس سی کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔

پروفیسر محمد ایوب قادری

نامور محقق، مولف اور مترجم ہیں۔ برعظیم کے علماء اور مذہبی و سیاسی تحریکات پر استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ (۱۱) اپنی تحقیقی کاوشوں کی بنا پر علمی حلقے میں ایک خاص اہمیت اور مقام کے حامل ہیں۔ جن شخصیات اور تحریکات پر آپ نے تحقیقی کام کیا ہے، وہ علمی دنیا میں اب تک نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔ ہماری تہذیبی اور علمی تاریخ کی بعض اہم کتب کو قادری صاحب نے ترتیب، حواشی اور ترجمہ کے ذریعہ زیادہ اہم، مفید اور عام کیا ہے۔ اردو کالج کے شعبہ اردو میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ (۱۲) اب تک کثیر تعداد میں کتابوں کی تالیف اور ترتیب کی ہے۔ خود ان کی شخصیت اور ان کاوشوں کا جائزہ تفصیلی اور بسیط مقالہ کا محتاج ہے یہاں مختصر تعارف مقصود ہے:۔

تالیفات

۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی: ۱۸۵۷ء کے ایک مجاہد کا تذکرہ ہے۔ اس تصنیف میں مولانا فیض احمد کے حالات زندگی ان کے دور کے حالات اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کے کارنامے اور پھر ان کی علمی زندگی کا ذکر ہے۔ اس کتاب کی تصنیف تک مولانا فیض احمد غیر معروف تھے، اس کی اشاعت کے بعد مولانا امداد صابری نے اپنی تصنیف ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء اور غلام رسول مہر نے ۱۸۵۷ء کے مجاہد کی تالیف میں اس کتاب سے استفادہ کیا اور اس کے حوالے دیے۔ یہ کراچی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: یہ برعظیم کے آٹھویں صدی ہجری کے ایک صوفی بزرگ کی سوانح و حالات پر مبنی ہے۔ اس تصنیف میں پہلی مرتبہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مفصل حالات بڑی حد تک ہمعصر ماخذ کی مدد سے نہایت

تحقیق و محنت سے مرتب کیے گئے ہیں۔ یہ کراچی سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔
۳۔ مولانا محمد احسن نانوتوی: گزشتہ صدی کے باکمال اور نامور عالم کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں بڑی محنت و جانفشانی سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذ کے ذریعے احسن نانوتوی کے خانوادے، ان کی سوانح اور علمی کارناموں کی تحقیق کی گئی ہے۔ کراچی سے اس کی اشاعت ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔
۴۔ ارباب فضل و کمال بریلی: بریلی کے علماء کا تذکرہ ہے جسے کمال تحقیق سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کراچی میں ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔
۵۔ تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ: اس کتاب میں تبلیغی جماعت کا تفصیلی طور پر تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۷۱ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

اردو تراجم

۱۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی کا فارسی میں تالیف کردہ برعظیم کے علماء پر معروف تذکرہ ہے۔ قادری صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ہے اس ترجمہ کی اصل تصنیف سے زیادہ اہمیت قرار دی گئی ہے۔ مترجم نے ہر شخص کے مزید حالات مختلف ماخذ کی مدد سے شامل کیے ہیں اور ان کے حوالے بھی دیے ہیں۔ حواشی میں چوبیس علماء کے حالات کا اضافہ ہے اور تقریباً" پچھتر علماء کے حالات تکملہ کتاب میں بڑھائے ہیں۔ یہ کتاب پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کے سلسلہ اشاعت میں ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔
۲۔ مجموعہ وصایا اربعہ: اس مجموعہ میں چار وصیت نامے شامل ہیں۔ اس میں سے دو حضرت شاہ ولی اللہ کے ہیں۔ ایک نصیحت نامہ ان کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہ کا، اور ایک وصیت نامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا ہے۔ قادری صاحب نے ان وصایا کے فارسی متن کو مختلف نسخوں کی مدد سے مرتب بھی کیا ہے اور

ان کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ ابتدا میں ایک معلومات افزا مقدمہ بھی لکھا ہے۔

۳۔ **ماثر الامرا (تین جلدیں):** اصل کتاب فارسی میں صمصام الدولہ شاہ نواز خان کی تالیف ہے۔ یہ مغلیہ عہد کی تواریخی کتب میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مولف نے اس کتاب میں عہد اکبری سے عہد محمد شاہی تک امراء کے مفصل حالات مستند ماخذ کی روشنی میں قلم بند کیے ہیں۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور نے محمد ایوب قادری صاحب کے ذریعے اس اہم کتاب کا ترجمہ تین جلدوں میں کرایا ہے۔ مترجم نے ترجمہ میں بڑی حد تک اصل کی رعایت رکھی ہے سادہ اور سلیس زبان اختیار کی ہے اور حسب ضرورت حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ لاہور سے (۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۰ء) شائع ہوا ہے۔

۴۔ **فرحت الناظرین:** فارسی میں محمد اسلم کا لکھا ہوا شاہجہانی اور عالمگیری عہد کے مشائخ و علماء اور شعراء کا تذکرہ ہے۔ قادری صاحب نے مختلف نسخوں کو پیش نظر رکھ کر اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور ہر شخص کے مزید حالات مختلف ماخذ کی مدد سے حواشی میں شامل کیے ہیں۔ اس طرح اب یہ کتاب اصل سے زیادہ مکمل ہو گئی ہے۔ یہ کراچی سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔

ترتیب و حواشی

۱۔ **علم و عمل (دو جلدیں):** (وقائع عبدالقادر خانی) اصل کتاب فارسی میں مولوی عبدالقادر رام پوری صدر الصدور کے خود نوشت حالات اور ان کی یاد داشتوں پر مبنی ہے۔ یہ "وقائع" ابتدائی انیسویں صدی کے برعظیم کے سیاسی' معاشرتی اور علمی حالات کو پیش کرتے ہیں۔ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے "علم و عمل" کے نام سے ان کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ قادری صاحب نے اسے

نئے سرے سے مرتب کیا اور اپنے حواشی اور تعلیقات کے ذریعہ اس کو دوگنا کر دیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ پہلے حصہ میں جہاں شخصیات کا تذکرہ ہے قادری صاحب نے اپنے حواشی اور تعلیقات کے ذریعے تقریباً" ہر شخص کے حالات میں مزید تفصیل دی ہے اور ایسے بیشتر افراد کا تذکرہ بھی کیا ہے جن پر مصنف نے تفصیلی روشنی نہیں ڈالی تھی۔ دوسرے حصے میں قادری صاحب نے مولوی عبدالقادر کے پوتے مرزا نصیرالدین کے خود نوشت حالات "وقائع نصیر خانی" کے نام سے بطور ضمیمہ شامل کر دیے ہیں۔ اس کتاب کی پہلی جلد کراچی سے ۱۹۶۰ء میں اور دوسری جلد ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ **وقائع نصیر خانی:** مولوی عبدالقادر رام پوری کے پوتے مرزا نصیرالدین کے خود نوشت حالات جو فارسی میں تحریر تھے قادری صاحب نے ان کا ترجمہ کر کے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ یہی ترجمہ "علم و عمل" کی دوسری جلد میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔

۳۔ **عہد بنگش کی سیاسی، ثقافتی اور علمی تاریخ:** مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے عہد بنگش کے فرخ آباد کے مفصل حالات فارسی زبان میں "تاریخ فرخ آباد" کے نام سے تحریر کیے تھے۔ کتاب کے آخر میں عہد بنگش کے صوفیا، علماء اور شعراء اور خطاطوں کے حالات بھی موجود تھے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ تھی، قادری صاحب نے اس کتاب کو حواشی اور تعلیقات کے ذریعہ نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے۔ علماء اور شعراء کے حالات میں مزید اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب کراچی سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ **تواریخ عجیب (کالا پانی):** مولوی محمد جعفر تھانیسری کی تصنیف ہے، جو تحریک جہاد کے سرگرم کارکن تھے۔ برطانوی حکومت کے انتقام کے تحت کالاپانی

بھیجے گئے تھے۔ یہ کتاب کالا پانی کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔ محمد ایوب قادری صاحب نے اس کے کئی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر متن کی تصحیح کی ہے اور مبسوط اور تحقیقی مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ اس میں حسب ضرورت متعدد مقامات پر حواشی، تعلیقات اور تذکرہ رجال بھی شامل کیا ہے۔ تذکرہ رجال میں انتیس ایسے افراد کے حالات و سوانح لکھے ہیں جن کا تواریخ عجیب میں محض ذکر تھا۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی علمی حیثیت بڑھ گئی ہے اور مرتب نے تاریخ کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے(۱۳) یہ کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں: محمد ایوب قادری صاحب نے یہ کتاب سید الطاف علی بریلوی صاحب کے ساتھ مل کر مرتب کی ہے۔ اس میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی جانے والی منظومات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ پہلے تو اجلاس کی مختصر کیفیت پھر صدر اجلاس کے مختصر حالات، اہم قرار دادیں اور صدارتی خطبات کے ضروری اور اہم اقتباسات دیے گیے ہیں۔ آخر میں کانفرنسوں میں نظمیں پڑھنے والے بیشتر شعراء کے حالات شامل کیے ہیں۔ یہ کتاب کراچی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ خط و خطاطی: اس کتاب میں قادری صاحب نے ان ڈیڑھ سو کتبات پر جوان کے کتب خانے میں موجود ہیں، ایک بسیط مقدمہ لکھ کر شائع کیا ہے۔ یہ کتبات اپنے وقت کے اہم اور نامور خطاط، میرپنجہ کش، عبداللہ بیگ اور بھولاناتھ شنکر وغیرہ کے ہیں۔ یہ مقالہ ایک دوسرے مقالہ مرتبہ شیخ ممتاز حسین جون پوری کے ساتھ "خط و خطاطی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۷۔ مقالات یوم عالمگیر: یکم مئی ۱۹۶۵ء کو کراچی میں یوم عالمگیر منایا گیا تھا۔ مختلف دانشوروں اور مورخین نے عالم گیر پر مقالے پڑھے تھے قادری صاحب

نے ان کو یکجا کر کے مرتب کر دیا ہے۔

قادری صاحب کی دو اہم کتب زیر اشاعت ہیں۔ ایک جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر۔ جس میں بعض غیر مطبوعہ روزناموں اور کتابوں اور ہمعصر ماخذ سے بعض مقامات کی جنگ کے چشم دید حالات مرتب کیے ہیں اور دوسری جہاد ہنومان گڑھی (اجودھیا) ۱۸۵۵ء پر ہے۔ اس میں اس اہم جہاد کا پس منظر، شخصیات و حالات کا ذکر ہے۔

ان مستقل اور موقر تصانیف کے علاوہ قادری صاحب نے اب تک دس بارہ کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ فضائل صحابہ و اہل بیت: شاہ عبدالعزیز دہلوی۔

۲۔ تعلیمی مسائل: سید الطاف علی بریلوی۔

۳۔ حیات سید احمد شہید: محمد جعفر تھانیسری۔

۴۔ اسلامی معاشرت: وحید الدین سلیم۔

۵۔ سوانح خان بہادر خان: مصطفےٰ بریلوی۔

۶۔ پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت کا مسئلہ: پروفیسر خورشید احمد۔

۷۔ مرقع یوسفی وغیرہ

قادری صاحب نے کئی اہم تصانیف کی تصنیف و تالیف میں مولفین کی مدد کی ہے، جن کا حوالہ بسیط مقالہ کا متقاضی ہے۔

قادری صاحب نے کئی سال تک بحیثیت نائب مدیر علمی جریدے "بصائر" کو مرتب کیا ہے۔ ان ہی کی کوشش سے "بصائر" کا ٹیپو شہید نمبر شائع ہوا۔ اسی طرح قادری صاحب نے "العلم" کا غالب نمبر بھی مرتب کیا۔

برعظیم کے مختلف علمی، ادبی اور تحقیقی رسائل و جرائد مثلاً" معارف، اردو، نقوش، البلاغ، العلم، بصائر، صحیفہ، الزبیر، ادب لطیف، تحریر،

فاران، قومی زبان وغیرہ میں قاری صاحب کے متعدد مقالات شائع ہوئے ہیں۔ یہ مقالات ابھی تک علیحدہ یا کتابی صورت میں اشاعت پذیر نہیں ہوئے۔

انھیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے برعظیم کے مختلف شہروں مثلاً" رامپور، علی گڑھ، دہلی، دیوبند، لاہور، بہاولپور، پشاور، اوچ وغیرہ کے اہم اور نادر کتب خانے بھی دیکھے ہیں۔

نجم النساء بیگم (۱۴)

معاشیات کی لیکچرار اور صدر شعبہ ہیں۔ عورتوں کے رسائل بنات، عصمت، زیب النساء میں ان کے مضامین چھپتے رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابوں میں ان کے لکھے ہوئے ابواب شامل ہیں۔ اس طرح وہ ایک شریک مصنف ہیں:۔

۱۔ ہماری معیشت میں پاکستان کے مسائل: مصنفہ ایس ایم جمیل۔

۲۔ معاشی تجزیہ اور پالیسی: مصنفہ ایس ایم جمیل، یہ کتاب بی کام کے نصاب میں شامل ہے۔

دو کتابیں پرائمری جماعتوں کے لیے بھی مرتب کیں:۔

۳۔ اردو کی دوسری کتاب: (اضافی)۔

۴۔ اردو کی تیسری کتاب: (اضافی)۔

یہ دونوں کتابیں پرائمری جماعتوں کے نصاب میں شامل ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں۔

مولانا عبدالقیوم ندوی (۱۵)

اردو کالج میں شعبہ اسلامیات کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ کثیر التصانیف عالم ہیں۔ ان کی اب تک پچپن تصانیف شائع ہوئیں۔

اسلام کے تقریباً" ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اسلام کا مطالعہ بحیثیت مذہب اور ضابطہ حیات بھی موجود ہیں' قرآن' حدیث' خطبات نبوی کا جائزہ بھی ہے' سیرو سوانح بھی ہیں' اسلام کا سیاسی اور اخلاقی نظام بھی زیر بحث آیا ہے اور اسلام کی تاریخ بھی شامل ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۱) تاریخ اسلام کامل (۲) خطبات نبوی ﷺ (۳) ہمارا قرآن (۴) ہمارا اخلاق (۵) شرح سبعہ معلقہ (۶) ہماری حکمرانی (۷) ہمارے اسلاف (۸) فیضان رسالت (۹) عورتوں کی تعلیم و تربیت (۱۰) ہمارا ضابطہ حیات (۱۱) ہمارا اسلام (۱۲) ہمارے غوث پاک۔

شبیر حسن قریشی (۱٦)

اردو کالج میں لیکچرار ہیں۔ تاریخ سے خاص شغف ہے اور جو کچھ تحریری مساعی ہیں۔۔۔ ان کے اپنے مضمون تاریخ ہی سے متعلق ہیں۔ مندرجہ ذیل اہم حوالے کی کتب پر ترتیب و تہذیب کا کام کیا اور ان کی تمام کتابیں نفیس اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئیں۔

۱۔ تاریخ ابن خلدون: اس کتاب کا ترجمہ حکیم احمد حسین الہ آبادی نے کیا تھا۔ اب اس کو آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔

۲۔ تاریخ طبری: اس کا ترجمہ جامعہ عثمانیہ کے تحت ہوا تھا لیکن بعد میں اس کی کوئی اور اشاعت نہ ہو سکی تھی اور عام کتب خانوں میں دستیاب بھی نہ تھی' اس کو دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔

۳۔ طبقات ابن سعد: اس کتاب کا ترجمہ عبداللہ عمادی نے کیا تھا۔

۴۔ سفر نامہ ابن جبیر اندلسی: اس کا ترجمہ کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ اب اس کو مرتب کر کے پھر چھاپا گیا ہے۔

فیاض احمد خاں (۱۷)

معاشیات کے استاد ہیں۔ اپنے مضمون میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ تدریس کے فرائض نہایت ذمہ داری، شوق اور لگن سے انجام دیتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک روایتی استاد کی زندگی کا نمونہ ہے۔ طلبہ کے لیے کالج اور گھر ہر جگہ بے لوث ہیں اور اپنا تمام وقت، کسی قسم کی ستائش کی تمنا کے بغیر طلبہ کے لیے وقف رکھتے ہیں۔ اسی لیے طلبہ میں نہایت مقبول ہیں۔ دوسرے کالجوں کے طلبہ بھی اردو کالج آ کر فیاض صاحب سے فیض اٹھاتے ہیں۔ موصوف ایم اے معاشیات کے طلبہ کی کلاسیں بھی لیتے ہیں۔ یونیورسٹی کے کثیر طلبہ ان سے مستفیض ہونے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ طلبہ کے مجبور کرنے اور اپنے شوق کے تحت----انگریزی زبان و ادب بھی پڑھاتے ہیں۔ انگریزی ادب اور اردو ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ شعر بڑی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں۔ طبعیت میں انتہائی عاجزی اور انکسار ہے۔ ہر اعتبار سے اردو کالج کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔

انھوں نے ایک کتاب نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے------ "شماریات" لکھی ہے جو کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ فیاض صاحب اگر تدریس کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کی طرف متوجہ ہوں تو طلبہ کو اور زیادہ فائدہ پہنچے۔

محمد ثنا صدیقی (۱۸)

شعبہ تجارت میں جز وقتی لیکچرار ہیں۔ انھوں نے "اصول انتظام" کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر کامیاب تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ تجارت کے طلبہ اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

غضنفر اکیڈمی کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔

مرزا لقمان بیگ (۱۹)

شعبہ تجارت میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا ذوق ہے۔ تجارت اور قانون پر نصابی ضرورتوں پر مبنی مندرجہ ذیل کتب تصنیف کیں: ۱۔ قانون بیع مال، ۲۔ ایکٹ شراکت۔

خلیق الزمان (۲۰)

شعبہ قانون میں لیکچرار اور سربراہ شعبہ ہیں۔ تصنیف و تالیف سے شغف رکھتے ہیں اور اپنے مضمون میں مندرجہ ذیل نہایت مفید اور کامیاب کتابیں تحریر کی ہیں:۔

۱۔ تعزیرات پاکستان
۲۔ ضابطہ فوجداری
۳۔ قانون دستاویزات
۴۔ قانون ثالثی
۵۔ قانون باربرداری
۶۔ اہم نظائر
۷۔ کمپنی لاء (زیر اشاعت)

ضمیر الدین سہروردی (۲۱)

جامع الصفات بزرگ ہیں۔ ۱۹۵۴ء سے، جب سے کہ اردو کالج میں قانون کا شعبہ قائم ہوا، جز وقتی لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "قانون معاہدہ" ہے، جو اپنے مضمون میں نصابی ضرورت کی تکمیل

کرتی ہے۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اظہار رحید ر رضوی (۲۲)

شعبہ قانون میں جز وقتی لیکچرار ہیں۔ وکالت کرتے ہیں اور تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ جن موضوعات پر آپ نے کتب تصنیف کی ہیں اردو میں ان سے قبل بعض پر کسی اور نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی تالیف کردہ ہیں:۔

۱۔ قانون انتقال جائیداد

۲۔ اصول قانون

۳۔ قانون کی تعبیر و تشریح

۴۔ اہم ننائر

۵۔ قانون ٹارٹ

ترلب احمد (۲۳)

شعبہ قانون میں جز وقتی لیکچرار ہیں بعض اہم نصابی موضوعات پر کتابیں تحریر کی ہیں:۔

۱۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی

۲۔ قانون تجدید کرایہ

۳۔ قانون شہادت

حواشی

فاضل مقالہ نگار معین الدین عقیل صاحب بھی اسی سلسلتہ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔(ادارہ)

۲: عبد الرشید فاضل "اردو کالج" مشمولہ خیابان' پشاور ص ۴۰۷

۳: چنانچہ اس تحریر میں گورنمنٹ اردو کالج سے مراد قدیم اردو کالج ہے' جو قدیم عمارت میں موجود ہے اور جہاں فنون' تجارت اور قانون کی تدریس حسب معمول جاری ہے۔

۴: ۱۹۳۰ء میں بلدہ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں بی اے اور جامعہ عثمانیہ سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ یکم نومبر ۱۹۵۲ء سے اردو کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۵: ان کے والد محمد احسن سمبھی اردو کے مشہور شاعر تھے۔ ۱۹۲۳ء میں قصبہ سمبھی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ تمام تعلیم کانپور میں مکمل کی' جہاں ان کے والد سکونت پذیر تھے۔ ڈی اے وی کالج کانپور سے ۱۹۴۳ء میں بی کام کیا اور ۱۹۴۵ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات میں کیا۔ کچھ دنوں جامعہ عثمانیہ میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے۔ ۵ اگست ۱۹۵۰ء سے اردو کالج میں پڑھا رہے ہیں۔

۶: اس سلسلہ میں زاہد حسین مرحوم لکھتے ہیں: "بنک دولت پاکستان" ان (مولوی عبد الحق) کا اور ان کے رفیق کار مولوی عمیم احمد صاحب پروفیسر اردو کالج کراچی کا' جن کی امداد ہمیں حاصل رہی' شکر گزار ہے۔ ان کی امداد کے بغیر اس اہم کام کا پایہ تکمیل کو پہنچنا دشوار تھا۔ (اصطلاحات بنکاری۔ مرتبہ: انجمن ترقی اردو' کراچی ۱۹۵۶ء ص ۴)

۷: ۱۹۱۸ء میں غازی پور کے ایک قصبہ پارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم غازی پور میں ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں الہ آباد سے بی اے کیا۔ بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ٹی اور آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۶ء میں ایم اے کیا۔ تقسیم ہند سے قبل کوئٹہ اور سندھ کے مختلف تعلیمی اداروں پڑھاتے رہے۔ کراچی آنے کے بعد اسلامیہ کالج اور عبداللہ کالج وغیرہ سے متعلق رہے۔ ۸ جولائی ۱۹۶۸ء سے اردو کالج میں بحیثیت صدر شعبہ اردو کام کر رہے ہیں۔

۸: والد کا نام داؤد قادری ہے۔ ۱۹۳۰ء میں بلدہ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہائی اسکول کامیاب کیا۔ ۱۹۵۳ء میں اردو کالج سے بی اے آنرز کیا۔ ۱۹۵۵ء میں جغرافیہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۸ء میں تاریخ اسلام میں بھی ایم اے کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایک

سال کے لیے انگلستان گئے اور وہاں سے ڈپلومہ لیا۔ ۸ اگست ۱۹۵۵ء سے اردو کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۹: والد کا نام علی عباس بدایونی ہے۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۷ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں سے میٹرک کیا۔ انٹر اردو کالج سے اور بی اے آنرز اور ایم اے نفسیات کراچی یونیورسٹی سے مکمل کئے۔ یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کے پہلے طالب علم تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۹ء سے اردو کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اچھے شاعر ہیں اور ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔

۱۰: والد کا نام مولوی محمد مبین ہے۔ دیوبند میں ۳۰ جون ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور حفظ القرآن دارالعلوم دیوبند میں کیا۔ پھر انبالہ چھاؤنی کے مدرسہ عربیہ معین الاسلام میں درس نظامی کی تکمیل کی جہاں ان کے والد تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ۱۳۴۸ھ میں پھر دارالعلوم دیوبند آئے اور دروہ حدیث سے فراغ کیا اور کچھ فنون کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۵۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد میں انبالہ کے مذکورہ بالا مدرسہ میں مہتمم اور صدر مدرس ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء تک وہیں رہے اور کراچی آ گئے۔ ۱۹۵۱ء میں مفتی محمد شفیع کے دارالعلوم میں نائب ناظم کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۵۸ء سے اردو کالج میں ہیں

۱۱: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی "ULEMA IN POLITICS" (کراچی ۱۹۷۲ء) ص XI

۱۲: والد کا نام مشیت اللہ قادری مرحوم۔ جولائی ۱۹۲۶ء میں قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں اردو مڈل کا امتحان اول درجہ سے کامیاب کیا اور یوپی بورڈ میں ریاضی میں امتیاز حاصل کیا۔ یہیں سے ۱۹۴۳ء میں ہندی مڈل کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں یوپی بورڈ سے میٹرک اول درجہ میں کامیاب کیا۔ اردو اور ریاضی میں پھر امتیاز حاصل کیا۔ بدایوں ان کا ننہالی وطن ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں چار سال تک بدایوں میں رہے۔ وہیں ۱۹۵۰ء میں اسلامیہ کالج بدایوں سے انٹر کامیاب کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اردو کالج کراچی سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور درجہ

اول میں آئے۔ ابتدائی عربی اور فارسی کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۰ء سے ۱۸ مئی ۱۹۵۷ء تک محکمہ رسد و ترقیات (وزارت صنعت) میں ملازمت کی۔ ۱۹ مئی ۱۹۵۷ء سے ۴ مارچ ۱۹۶۳ء تک "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی" میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ ۵ مارچ ۱۹۶۳ء سے اردو کالج میں لیکچرار ہیں۔

۱۳: ڈاکٹر محمود حسین، "تعارف تواریخ عجیب" ص ۲۶۔ (کراچی ۱۹۶۴ء)

۱۴: ۲۹ اگست ۱۹۳۰ء کو امراوتی (سی پی) میں پیدا ہوئیں۔ ناگپور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۴۶ء میں میٹرک کیا۔ ۱۹۵۹ء میں اردو کالج ہی سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔

۱۵: ۲۰ جنوری ۱۹۱۷ء کو قصبہ سترکھ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا حکیم امجد علی مرحوم سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۳ سال تک رہ کر علوم متداولہ کی تحصیل کی اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں فاضل حدیث کا امتحان کامیاب کیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۳ء سے اردو کالج میں ہیں۔

۱۶: والد کا نام سراج الدین ہے۔ ۱۹۳۳ء میں غازی پور (یو پی) میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد بہ سلسلہ تجارت مقیم تھے۔ اصل وطن پنجاب ہے۔ ۱۹۴۷ء تک کلکتہ میں رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی اے اور ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ پھر اردو، تاریخ اسلام اور تاریخ عام میں بھی ایم اے کیا۔ اس طرح موصوف چار ایم اے ہیں۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۳ء سے اردو کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۱۷: والد کا نام فیض محمد خاں شیروانی ہے۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۶ء کو علیگڑھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۵۴ء میں اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔ ۱۹۵۹ء میں معاشیات میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ۸ دسمبر ۱۹۶۲ء سے اردو کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

۱۸: والد کا نام حاجی منیرالدین مرحوم۔ جبل پور (سی پی) میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں سی پی بورڈ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۴۵ء میں ایس ڈی کالج کانپور سے بی کام اور

۱۹۴۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۴۷ء ہی میں ایل ایل بی کی تکمیل بھی کی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۸ء سے اردو کالج میں ہیں۔

۱۹: یکم نومبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ اردو کالج سے ۱۹۵۴ء میں بی کام پاس کیا۔ اردو کالج میں شعبہ تجارت کے ممتاز طلبہ میں تھے۔ ۱۹۵۸ء میں سی اے (CHARTED ACCOUNTANCY) کا امتحان کامیاب کیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۸ء سے اردو کالج میں ہیں۔

۲۰: والد کا نام قمرالزمان، دسمبر ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں یو پی بورڈ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے ایل ایل بی کیا۔ اردو کالج سے فارغ التحصیل طلبہ میں پہلے فرد ہیں جنھوں نے باقاعدہ وکالت شروع کی۔ ۱۹۵۷ء سے جون ۱۹۶۰ء تک اردو کالج میں اعزازی طور سے پڑھایا اور ۱۴ جولائی ۱۹۶۰ء سے جزوقتی لیکچرار کی حیثیت سے شعبہ قانون میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنے حلقہ احباب میں نہایت خلیق، اسم بامسمی کہے جاتے ہیں۔

۲۱: والد کا نام نصیرالدین احمد ہے۔ قدیم وطن سندیلہ ضلع ہردوئی ہے مگر ان کے دادا حافظ نذیرالدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ساگر (سی پی) میں جاکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اندور میں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں بی اے اور ۱۹۳۸ء میں ایل ایل بی کیا۔ قیام پاکستان تک ساگر میں مقیم رہے۔ سی پی کی اسمبلی میں مسلم لیگ کی طرف سے ایم ایل اے تھے۔ مسلم لیگ پراونشل ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن رہے۔ ناگپور یونیورسٹی کی سینٹ کے رکن تھے۔ ۱۹۴۷ء سے کراچی میں وکالت کر رہے ہیں۔

۲۲: والد کا نام سید اظہار حسین، جون ۱۹۲۹ء میں امرائی گاؤں ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں امیرالدولہ اسلامیہ انٹر کالج، لکھنؤ سے ہائی اسکول کامیاب کیا۔ ۱۹۴۷ء میں بی اے کیا اور ۱۹۵۱ء میں ترک وطن کر کے پاکستان آگئے۔ ۱۹۵۴ء میں ایل ایل بی کیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء سے اردو کالج سے متعلق ہیں۔

۲۳: والد کا نام رضا احمد، پیدائش ۱۹۲۴ء میں بمقام بھوپال ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں سی پی بورڈ سے ہائی اسکول کامیاب کیا۔ ۱۹۴۳ء میں ناگ پور یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۴۵ء میں ایم اے اردو اور ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ پھر لیکچرار کی حیثیت سے مہاراجہ کالج جودھ پور میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ ۱۹۵۰ء سے وکالت کر رہے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء سے اردو کالج میں ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے یہ مضمون ۱۹۷۱ء کے اواخر میں لکھا تھا۔۔۔۔۔۔(ادارہ)

تعلیقات خطبات گارساں دتاسی

گارساں دتاسی کا شمار اردو زبان و ادب کے بلاشبہ ان محسنین میں کیا جا سکتا ہے جن کے مطالعہ و تحقیق کی کاوشیں اردو زبان و ادب کی تاریخ و ارتقاء کے اہم ماخذ کی حیثیت سے ہمیشہ معاونت کرتی رہیں گی۔ گارساں دتاسی کا کام اردو زبان و ادب کے تعلق سے خاصا متنوع ہے۔ اس کی ضخیم و مختصر تصانیف کی تعداد کا شمار ۱۵۹ کیا گیا ہے، جن میں سے بیشتر کا موضوع کسی نہ کسی طرح اردو زبان و ادب سے متعلق ہے۔ ویسے اس کی کل تصانیف میں جو اہمیت اور افادیت اس کی "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" اور اس کے خطبات و مقالات کو حاصل ہے، وہ مثالی اور ناگزیر ہے۔ ان میں سے اول الذکر کا اصل فرانسیسی سے اگرچہ اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے (ترجمہ: لیلیان سکستان نزرو، شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۶۱ء) لیکن یہ ابھی شائع نہیں ہوا۔ آخر الذکر کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے اولاً ۱۹۳۵ء میں اورنگ آباد سے شائع ہوا تھا، جس میں شامل پہلے پانچ خطبات کا مجموعہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تصحیح کے بعد ۱۹۴۰ء میں "تمہیدی خطبات" کے نام سے دہلی سے شائع کیا گیا۔ جملہ خطبات و مقالات کو انجمن نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی نظرثانی کے بعد کچھ عرصہ

قبل پھر شائع کیا ہے۔ فرانسیسی سے اردو میں منتقلی کے باعث جو اغلاط اور تسامحات محسوس کیے گئے' ان کی نشاندہی ہوتی رہی ہے اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی جانب سے اسی قسم کی نشاندہی کے سبب مولوی عبدالحقؒ نے نظرثانی کی ضرورت بھی تسلیم کی تھی' چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ کی نظرثانی کا یہی پس منظر بھی تھا' لیکن نظرثانی سے قطع نظر' خطبات کی حد تک ان کی ترتیب نو کی ضرورت کے احساس کے تحت ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے انھیں اپنے مقالہ تحقیق برائے پی ایچ ڈی کے لیے ترتیب دیا ہے اور ان پر "تعلیقات" کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس وقت یہی مطبوعہ "تعلیقات خطبات گارساں دتاسی" پیش نظر ہیں۔

گارساں دتاسی کے خطبات و مقالات دونوں فی الحقیقت ایک خزینہ ہیں' جن میں اردو زبان کے شاعروں اور مصنفوں' تصانیف' اخبارات و جرائد' انجمنوں و اداروں کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات بہ کثرت ملتی ہیں۔ یہ کہنا خلاف حقیقت نہیں کہ ان خطبات و مقالات میں انیسویں صدی کے اردو ادب اور اس کے ماحول کے بارے میں جتنی معلومات یکجا ہو گئی ہیں' وہ تنہا اس قدر کسی اور ماخذ میں موجود نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ساری معلومات اور ان کا ذخیرہ تنہا ایک فرد کی کاوش ہے' جو برعظیم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھا مختلف ذرائع سے انھیں یکجا کرنے کی بے لوث اور منفرد کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ اس میں موجود کوتاہیاں' نقائص اور تشنگی بعید از امکان نہیں۔ پھر بھی ان خطبات و مقالات پر' حواشی اور تعلیقات کا اضافہ ایک بڑے حوصلے' محنت شاقہ' وسعت مطالعہ اور تلاش و جستجو کا متقاضی تھا۔ یہ حوصلہ فاضل محقق نے کیا ہے اور اس کی تکمیل میں جو جستجو اور محنت انھوں نے کی ہے وہ اس پر لائق تحسین اور قابل مبارک باد ہیں۔ ان کی اس محنت سے' خطبات کی حد تک' ان سے

استفادہ کرنے والوں کو بیش از بیش مزید معلومات اور تازہ تحقیقات سے واقفیت ہوگی اور ان کا یہ کارنامہ خطبات کے جملہ موضوعات پر مزید تحقیقات کے لیے ہمیشہ معاون ثابت ہوگا۔

فاضل محقق نے اپنے ضخیم مقالے کے اس حصے میں، جو اس وقت پیش نظر ہے، کل ۱۹ خطبات پر یکے بعد دیگرے اور علی الترتیب تعلیقات تحریر کیے ہیں، لیکن ان سے قبل بہ طور پس منظر ہندوستانیوں سے غیرملکیوں کے تعلقات اور انیسویں صدی کے مستشرقین کی اردو خدمات پر مختصر روشنی ڈالی ہے اور پھر ایک مفصل باب میں گارساں دتاسی کے حالات زندگی اور تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بڑی حد تک عہد حاضر کی تحقیقات کا احاطہ کرتا ہے لیکن پھر بھی یوں لگتا ہے کہ کتاب کی تصنیف کے بعد سے اس کی اشاعت تک یا اشاعت کے موقع پر اس پر بالخصوص نظرثانی نہیں کی گئی۔ کتاب میں اس کے سن تصنیف کا ذکر نہیں ہے، لیکن ایک اطلاع کے مطابق ۱۹۷۵ء میں اس کام پر سند تفویض ہو چکی تھی۔ اس طرح اس کی تصنیف سے اس کی اشاعت دسمبر ۱۹۸۷ء تک جو متعدد نئی معلومات منظرعام پر آئی ہیں اور نئی تحقیقات نے پرانی تحقیقات کو رد کیا ہے، فاضل محقق نے ان سے استفادہ نہیں کیا یا وہ ان کی رسائی سے دور رہیں۔ فی الواقع بیشتر تعلیقات نظرثانی کی محتاج تھیں۔ مصنف نے تقریباً" تین ہزار حواشی لکھے ہیں۔ کام حقیقتاً" بہت بڑا تھا اور اس کا حق بھی انھوں نے اپنی محنت اور جستجو سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن متعدد مقامات پھر بھی محل نظر، تشنہ، جدید تحقیقات سے ناآشنا اور حشووزوائد کے عیوب سے پاک نہ رہ سکے۔ امرواقعہ یہ بھی ہے کہ فاضل محقق "حواشی" اور "تعلیقات" کے فرق کو بھی بلحوظ نہ رکھ سکے۔ انھیں حواشی اور تعلیقات کے عنوانات علیحدہ علیحدہ ترتیب دینے چاہیے تھے۔ مناب ہوتا

اگر انھیں محض "تعلیقات" کے بجائے وہ "حواشی و تعلیقات" قرار دیتے تاکہ بات نبھ سکتی۔

فاضل محقق نے کئی مقامات پر حواشی کی تکرار بھی کی ہے، جبکہ وہ پہلے مقام پر مفصل حاشیہ تحریر کرکے اگلے مقامات پر سابقہ کے مکمل یا جزوی حوالے سے بات واضح کر سکتے تھے۔ حوالوں کے انداز میں اکثر مقامات پر یکسانیت بھی قائم نہیں رکھی گئی۔ آخر میں روایتی انداز کی کتابیات موجود ہے، لیکن اس کے باوجود حواشی یا تعلیقات میں تصانیف یا ماخذ کے مکمل حوالے بھی دے دیے گئے ہیں۔ حوالوں میں مصنف کے نام کا التزام بہرحال ضروری تھا۔ لیکن کہیں یہ التزام کیا گیا ہے اور کہیں صرف کتاب کا نام درج کر دیا گیا ہے لیکن کہیں مکمل حوالے بھی موجود ہیں۔ مغربی اسما کو کہیں اردو میں لکھا گیا ہے اور کہیں رومن میں۔ اس میں یکسانیت نہ ہونے سے دوران مطالعہ خاصی الجھن ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مغربی زبانوں کی تصانیف کے ناموں میں بھی یکسانیت کا کوئی التزام نہیں رکھا گیا، انھیں کہیں اصلی رومن میں لکھا گیا ہے اور کہیں ان کے اصل نام اردو میں لکھ دیے گئے ہیں۔ زبان کے استعمال میں بھی فاضل محقق نے مناسب احتیاط نہیں برتی۔ انگریزی سے ترجمے کے دوران مناسب اور مترادفات تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مثلاً" تصوف کے لیے "صوفی پن" لکھا ہے۔ یا ہندوستانی ناموں کو انگریزی لہجے میں اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ جیسے کفایت علی کافی کو کفائت علی کفی تحریر کیا ہے (ص ۲۲۵، ح ۸۸)۔ بعض نام اردو میں لکھنے کے بجائے انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً" نواب بلرام پور کا نام محض انگریزی میں BRIGBIJAB SINGH تحریر کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر اردو و فارسی کے معروف نام بھی اخذ نہیں کیے جا سکے۔ مثلاً" "حکایات بید پائے" کے بجائے انگریزی میں محض

FABLES OF BIDPAI لکھا ہے۔ (ص ۲۶۵' ح ۴۶)۔ بعض اکابر علم و تحقیق مثلاً خود گارساں دتاسی' حامد حسن قادری وغیرہ کی اغلاط کی نشان دہی ایک حد تک ناروا الفاظ میں کی گئی ہے' جبکہ ایسی ہی یا اس سے بھی بڑی اغلاط خود فاضل محقق سے سرزد ہوئی ہیں۔ طوالت کے پیش نظر یہاں ان کی نشاندہی سے گریز کیا جاتا ہے' لیکن "مشتے نمونہ از خروارے" چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اردو زبان و ادب کے اس اہم ماخذ سے خاطر خواہ استفادہ ہوتا رہے اور ان تعلیقات کی اشاعت ثانی کے موقع پر ان پر نظرثانی کی جا سکے۔ یا "خطبات" کے علاوہ اگر "مقالات" پر بھی کوئی ایسا ہی وسیع المطالعہ اور مستعد محقق حواشی و تعلیقات لکھنے کا عزم کرے تو یہ مثالیں اس کے لیے کوئی راہ متعین کرنے میں معاون ہو سکیں۔

غیر مستند ماخذ

فاضل محقق نے مستند ماخذ کی تلاش کی بجائے متعدد مقامات پر ثانوی اور غیر معیاری ماخذ یا اصل کے بجائے تراجم کو قابل اعتنا سمجھا ہے۔ مثلاً" اردو صحافت کی تاریخ پر سید محمد اشرف نقوی کی معروف کتاب "اختر شہنشاہی" (مطبوعہ: لکھنؤ ۱۸۸۸ء) اگرچہ کمیاب ہے لیکن متعدد کتب خانوں میں موجود ہے' فاضل محقق نے ہر جگہ اس سے راست استفادہ کے بجائے "قومی زبان" میں بالاقساط شائع ہونے والے اس کے اشاریے کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ: ص (صفحہ) ۵۷' (ح) حاشیہ ۱۸) معروف صوفی ابراہیم ادھم کا تعارف' " سب رنگ ڈائجسٹ" (کراچی) میں شائع شدہ ایک مضمون کے حوالے سے کرایا گیا ہے' جبکہ ان کے بارے میں مستند ماخذ اور حوالوں کی کمی نہیں!۔

ص ۶۰ ح ۸ علی حزیں کی سوانح عمری کا ذکر گارساں دتاسی کی " تاریخ ادبیات" کے حوالے سے کیا ہے' جبکہ یہ ۱۸۵۰ء میں نہیں

بلکہ ۱۸۵۱ء میں مطبع مفلو ہند بنارس سے شائع ہوئی تھی اور F.C.BELFOUR نے اس کا تصحیح شدہ نسخہ لندن سے ۱۸۴۳ء میں شائع کیا تھا۔

ص ۳۸، ح ۱۵: لطف کے حالات متعدد تذکروں میں موجود ہیں، ان کے علاوہ مرزا اکبر علی بیگ نے "لطف کے حالات اور کارنامے" ایک مبسوط تحقیقی مقالہ اور "دیوان لطف" شائع کیے ہیں (مطبوعہ حیدر آباد دکن، علی الترتیب ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۳ء) ان کی موجودگی میں یہاں دیا گیا حوالہ مستند نہیں کہا جا سکتا۔

ص ۲۷، ح ۵۵: یہاں "ماثر الامرا" ج ۳ کا حوالہ مستند ہوتا۔

ص ۱۸۴، ح ۳۲: غلام محمد منشی نے خود اپنے حالات تحریر کیے ہیں: "AUTOBIOGRAPHY" (سورت، ۱۹۰۰ء) اس کے لیے گارساں دتاسی کا حوالہ ثانوی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے پھر اس کی مزید تصانیف کا ذکر برٹش میوزیم کی فہرست میں موجود ہے، جو فاضل محقق کے پیش نظر رہی ہے۔

ص ۱۹۴، ح ۷: غالب کے اس شاگرد کے لیے مالک رام کی مؤقر تصنیف "تلامذہ غالب" کے بجائے عبدالسلام خورشید کی سرسری تصنیف کا حوالہ نہایت نامناسب کہا جائے گا۔

ناگزیر ماخذ سے گریز

ص ۵۱، ح ۱: یہاں بیگم سمرو کا تعارف اور حالات ایک غیر مستند ماخذ سے اخذ کیے گئے ہیں، جبکہ بیگم سمرو پر ہم عصر تاریخوں اور جدید تحقیقی جائزوں میں بہ کثرت معلومات ملتی ہیں۔ ان سب سے قطع نظر W.H.SLEEMAN کی تصنیف

RAMBLES AND RECOLLECTIONS OF AN INDIAN OFFICIALS

(مطبوعہ: لندن، ۱۸۴۴ء، 1915ء کراچی ۱۹۷۳ء) مفصل اور مستند معلومات پر مشتمل ہے (جبکہ چند سال قبل برطانیہ سے اس پر ایک سوانحی ناول

"THE RAJAH FROM TIPPERARY" بھی شائع ہوا ہے)۔

ص ۷۵، ح ۱۲(ر): یہاں حوالے کے لیے راست "طبقات الشعرائے ہند" پیش نظر رہنا چاہیے تھا۔

ص ۸۷، ح ۳۲: یہاں گردیزی کے بارے میں اگرچہ ایک معیاری حوالہ موجود ہے لیکن اس کے "تذکرہ ہندی گویاں" پر مولوی عبدالحق کا تحریر کردہ مقدمہ اس سے زیادہ مفصل اور جامع ہے۔

ص ۸۷، ح ۳۴: تذکرہ ابوالحسن (مسرت افزا) کے ضمن میں اس کے مترجم کے بجائے قاضی عبدالودود کے مرتبہ نسخے اور اس تذکرہ پر بالخصوص ان کے مقالے کا حوالہ ناگزیر تھا، جو "معاصر" (پٹنہ) اور "اردو" (کراچی، اپریل ۱۹۶۸ء) میں شائع ہوا ہے۔

ص ۲۹۹، ح ۱۰۸: راجہ رام موہن رائے پر بنیادی ماخذ کی کمی نہیں،

خود اس کی خودنوشت تحریریں متعدد مرتبہ چھپی ہیں اور عام ہیں۔
یہاں امداد صابری کا حوالہ ثانوی ماخذ میں شمار ہو گا۔

جدید تحقیقات سے بے نیازی

ص ۲۱، ح ۱: فاضل محقق نے یہاں اور دیگر متعدد مقامات پر گارساں دتاسی پر ڈاکٹر ثریا حسین کی اصل فرانسیسی تصنیف مطبوعہ ۱۹۶۲ء سے استفادہ کیا ہے، لیکن اس تصنیف کا اردو ترجمہ، خود مصنفہ کا کیاہوا، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۴ء، پیش نظر نہیں رکھا، جو جدید تحقیقات کی روشنی میں ترمیم و اضافے کے بعد شائع ہوا ہے۔

ص ۸۹، ح ۲: مظہر علی خاں ولا کی تصنیف "تاریخ شیر شاہ" کا ذکر اور اس کے اردو ترجمے کا محض بالواسطہ حوالہ دیا ہے، جبکہ یہ ترجمہ اپنے مزید تفصیلی تعارف و مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر سید معین الحق نے کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا۔

ص ۹۰، ح ۴۳: یہ مجموعہ دراصل تذکرہ ہے، اور اسے خود دتاسی نے بھی متعلقہ عبارت میں تذکرہ ہی لکھا ہے۔ اس کا ذکر اگرچہ اردو تذکرہ نویسی سے متعلق بیشتر اہم تصانیف میں موجود ہے، لیکن اس کا ایک انتخاب اور تعارف نثار احمد فاروقی "تین تذکرے" مطبوعہ ۱۹۶۸ء میں کر چکے ہیں۔

ص ۹۹، ح ۸۰: یہ تذکرہ ۱۹۷۶ء میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

ص ۱۱۰، ح ۱۵۰: یہاں چند بردئی کے حالات اور اس کی تصنیف کا حوالہ ایک فرہنگ سے دیا گیا ہے، جبکہ اس کے حالات اور اس

تصنیف پر ایک مبسوط تنقید محمود شیرانی نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں تحریر کی تھی، جسے انجمن ترقی اردو، دہلی نے شائع کیا تھا اور پھر یہ "مقالات شیرانی" ج ۷، کے طور پر مجلس ترقی ادب کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

ص ۱۱۳، ح ۱۷۰: شاہی بھاگ نگری کا ذکر متعدد تذکروں کے علاوہ "دکن میں اردو" اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" مصنفہ سید نصیرالدین ہاشمی میں موجود ہے۔

ص ۱۱۵، ح ۱۸۲: عزلت کا "دیوان" اور "راگ مالا" عبدالرزاق قریشی نے مرتب کیے ہیں اور "دیوان" کے مقدمے میں مفصل حالات تحریر کیے ہیں۔ مطبوعہ ۱۹۶۲ء۔

ص ۱۲۵، ح ۲۴۱: عشرت کے حالات اور اس کی تصانیف کا جائزہ ڈاکٹر احمد سجاد کے ڈی لٹ کے مطبوعہ تحقیقی مقالے "میر غلام علی عشرت" (۱۹۷۸ء) اور "پدماوت" مرتبہ گوہر شاہی (لاہور ۱۹۸۶ء) میں موجود ہے۔

ص ۱۳۸، ح ۳۲۸: یہاں وضاحتاً" یوسف کمبل پوش اور اس کے سفرنامے "عجائبات فرنگ" تحریر ہونا چاہیے تھا، جبکہ حالات اور سفرنامے کا ذکر ان معروف ناموں کے بغیر محض حامد حسن قادری کی تصنیف "داستان تاریخ اردو" کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

ص ۱۳۸، ح ۳۲۹: یہ سفرنامہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا۔

ص ۱۲۵، ح ۷۵-۳: یہاں اس کی "ہندوستانی گرائمر" کا ذکر بھی ضروری تھا، جسے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ۱۹۷۷ء میں شائع کر دیا ہے۔

ص ۲۱۶، ح ۳۶(ج): اسے ڈاکٹر نذیر احمد نے ۱۹۵۵ء میں مرتب کر کے شائع کر دیا تھا۔

ص ۲۲۷، ح ۲: یہاں "دفتر بے مثل" کا حوالہ مکمل نہیں۔ مولوی عبداللطیف پر متعدد جدید تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں۔ پھر ان کے خودنوشت اور مستند حالات و تصانیف کا ایک مجموعہ انعام الحق نے انگریزی میں مرتب کیا ہے، جو ڈھاکا سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ نساخ پر ڈاکٹر صدر الحق کی تصنیف ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی ہے۔

ص ۲۶۷، ح ۶۰: اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع بھی کر دیا ہے۔

ص ۲۷۵، ح ۱۰۸: یہ سفرنامہ کراچی سے کئی برس قبل مفتی انتظام اللہ شہابی کے مقدمے اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

ص ۲۷۵، ح ۱۱۱: اس کا سفرنامہ دو جلدوں میں ۱۸۲۸ء میں شائع ہوا تھا، اس کا ایک ملخص نئی اور مفید معلومات کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں کیمبرج میں شائع ہوا ہے:

"BISHOP HERBER IN NORTH INDIA" مرتبہ M.A.LAIRD

ص ۲۷۶، ح ۱۱۷: اصلاً یہ "راج ترنگینی" ہے۔ اس کا ایک تصحیح

شدہ نسخہ ۱۹۷۳ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔

ص ۳۱۱، ح ۴۸: تسلیم پر ڈاکٹر فضل امام کی ایک مبسوط تحقیقی کتاب ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔

عدم احتیاط اور بے توجہی

ص ۱۱ ح ۱۰: یہاں اور اگلے صفحات پر کئی جگہ بلوم ہارٹ کی جس فہرست کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ مکمل نہیں۔ بلوم ہارٹ نے متعدد فہرستیں مرتب کی تھیں۔ پھر یہاں اور آگے کئی مقامات پر صفحہ نمبر بھی درج نہیں کیا گیا۔

ص ۶۷، ح ۲۳ اور ۲۲: یہاں گارساں دتاسی کی مراد "گلدستہ نازنیناں کے بجائے "طبقات الشعرا ہند" اور عرب کے شاعروں کے تذکرے سے مراد "فرائد الدہر" ہے۔

ص ۷۷، ح ۲۹: یہاں اس شخص کی قومیت کا پتہ نہیں چلتا اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ شاہی کتب خانے سے مراد کس شہر کے کتب خانے سے ہے؟

ص ۸۲، ح ۶: یہاں "اردوئے قدیم" کا مصنف شمس اللہ قادری کے بجائے سید شمس الدین تحریر کیا گیا ہے!

ص ۸۸، ح ۳۷: طفیل احمد نے اسپرنگر کے کیٹلاگ کا نہیں، صرف اس کے اس حصے کا ترجمہ "یادگار شعراء" کے نام سے کیا تھا جو شعرائے اردو سے متعلق تھا۔ یہ تذکرہ ۱۹۴۳ء کے بعد اب لکھنؤ سے دوبارہ چھپا ہے۔ اس کا راست حوالہ مناسب تھا۔

ص ۹۸، ح ۷۶: یہاں ایک ہی سطر میں "طپش" کو "تپش" بھی لکھا ہے!

ص ۱۲۰، ح ۲۰۸ اور ۲۰۹: "خلاصہ التواریخ" کا مصنف "سجن رائے" نہیں بلکہ "سبحان رائے" ہے۔ "آرائش محفل" مجلس ترقی ادب کی اشاعت ۱۹۶۳ء سے قبل کم از کم پانچ مرتبہ شائع ہو چکی ہے اور اس کے بعد اس کا اک اور ترجمہ ناظر حسن زیدی نے کیا جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ ان آخری اشاعتوں کے مقدمات میں مصنف کے حالات بھی تحریر ہیں۔ اس صورت میں حامد حسن قادری کی تصنیف "داستان تاریخ اردو" مناسب ماخذ نہیں کہا جا سکتا۔

ص ۱۵۲، ح ۲۵: یہ دراصل "انتخاب دو اوین" ہے، جس کا تذکرہ فاضل محقق کی زیر استفادہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف "شعرائے اردو کے تذکرے" میں موجود ہے۔

ص ۱۹۷، ح ۳۹: یہاں حوالہ مکمل نہیں ہے۔ پھر یہ غلام علی، ٹیپو سلطان کے مقربین: میر غلام علی وکیل (لنگڑا) اور غلام علی خاں میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہو سکتا۔

ص ۲۶۳، ح ۳۵(ب): یہاں حوالہ مکمل اور درست نہیں، "مقالات" کے بجائے "تذکرہ" تحریر کیا گیا ہے۔

ص ۲۷۶، ح ۱۱۵: یہ دراصل "دبستان مذاہب" ہے اور اس کا مصنف محمد محسن جامی نہیں خانی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ حال میں

بھارت اور پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔

ص ۲۸۱، ح ۲: یہاں پلیٹس کی اصل وجہ شہرت بیان نہیں کی گئی!

ص ۳۲۵، ح ۵۶: فاضل محقق متعدد شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکے۔ اسی ضمن میں بعض معروف شخصیات کے تعلق سے بھی انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مثلاً" ہالرائیڈ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس کے حالات نہیں مل سکے! جبکہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تصنیف "گارساں دتاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہان اردو" ان کے پیش نظر رہی ہے (کتابیات ص ۳۶۲)۔ اس کتاب کے آخر میں بھی ہالرائیڈ کا ذکر موجود ہے، ص ۱۲۶۔ ۱۲۸۔

ص ۳۲۷، ح ۵۸: بلوخمن کی ایک بڑی وجہ شہرت اس کا "آئین اکبری" کا انگریزی ترجمہ ہے۔ فاضل محقق نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

ص ۳۳۷، ح ۱۱۵: یہاں تصنیف کا پورا نام تحریر کرنا چاہیے تھا، جو یہ ہے: "THE HISTORY OF INDIA" مطبوعہ: سیرام پور، ۱۸۶۳ء۔

مذکورہ بالا مثالیں مشتے نمونہ کے مصداق تھیں۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس قسم کی کمزوریوں سے اسے محفوظ رہنا چاہیے تھا اور بالخصوص حواشی یا تعلیقات کے بنیادی اسلوب اور ضوابط کے نقطہ نظر سے حد درجہ احتیاط لازم تھی۔ طباعت سے قبل جہاں نظرثانی کی ذمے داری خود مصنف کی ہے وہیں یہ ناشر پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر اس کا اہتمام کیا جاتا تو یقین ہے کہ اس میں

موجود نقائص اور کمزوریوں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی۔ پھر بھی فاضل محقق کی یہ کاوش، جو "خطبات" سے مزید استفادے کی راہ میں معاون ثابت ہوگی، ان کی مستقل محنت، لگن اور جستجو کی ایک مفید مثال ہے۔ امید کہ ان کی ایسی مزید کوششوں سے ادب اور تحقیق کو متنوع فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔

"تحقیق"

شعبہ اردو جامعہ سندھ کے مجلّے کا اولین شمارہ

پاکستان کی جامعات میں شعبہ اردو کے ادبی و تحقیقی مجلات کی مستقل اشاعت کی روایت بہت مستحکم اور قابل اطمینان نہیں، لیکن شعبہ جات اردو سے قطع نظر اگر جامعات یا ان کے کلیات کے اردو میں شائع ہونے والے مجلوں کی روایت کو دیکھا جائے تو جامعہ پنجاب کے اورینٹل کالج کا تحقیقی مجلّہ "اورینٹل کالج میگزین" اپنے طویل دور اشاعت کے ساتھ ساتھ نہایت دقیع اور عالمانہ تحقیقی مقالات اور اپنے مجموعی معیار کے لحاظ سے نہ صرف ایک استثنائی مثال ہے بلکہ یہ اپنے طور پر تنہا ایک معدوم روایت کی تلافی کرتا رہا ہے۔ چند برسوں سے جامعہ پنجاب ہی کے کلیہ علوم و معارف اسلامیہ کا "مجلّہ تحقیق" بھی اب اس تلافی میں اس کا شریک ہے۔ دیگر جامعات میں سے شعبہ اردو، جامعہ سندھ کے مجلّہ "خیابان" نے اپنے بعض موضوعاتی خاص شماروں کے باعث شعبہ جات اردو کے ادبی و تنقیدی مجلوں کی محدود روایت میں اپنا ایک مقام بنایا ہے اور اپنے مرتبین کی مخلصانہ ادب دوستی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ "صریر خامہ" سے قطع نظر اب شعبہ اردو، جامعہ سندھ کے مجلّہ "تحقیق" نے

اپنی نوعیت، اپنے مقالات کے معیار اور اپنے مرتبین کے ذوق تحقیق کے ذریعہ دیگر پاکستانی جامعات کے شعبہ جات اردو کے مقابلہ میں ایک مزید استثنائی مثال پیش کی ہے۔ اس مجلّہ کا پہلا شمارہ (۱۹۸۷ء) اس وقت پیش نظر ہے۔

مرتبین نے اس شمارہ کو بنیادی طور پر ان گوشوں میں ترتیب دیا ہے: "اصول تحقیق، رسمیات تحقیق، مقالات، اخذ و ترجمہ" لیکن ان کے علاوہ تبصرے، رفتار تحقیق اور مجالس تحقیق و مذاکرہ ذیلی عنوانات ہیں، جن کے تحت چند نئی تصانیف پر شعبہ کے اساتذہ کا تاثر سامنے آتا ہے اور اساتذہ کی تحقیقی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے۔ مذکورہ گوشوں میں اخذو ترجمہ کے تحت محض ایک مقالہ "مشکوک دستاویزات کی چھان بین کا ایک سائنسی طریقہ" ہے، جو نارمن ایچ میکنزی کا تحریر کردہ تھا، اسے اس کی افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر نجم الاسلام نے اردو میں منتقل کیا ہے اور اسے ایک علیحدہ گوشے کی حیثیت دی ہے، لیکن اپنے موضوع کی مناسبت سے اسے اصول یا رسمیات تحقیق کے گوشوں ہی کے ذیل میں شمار کرنا چاہیے

اس مجلّہ کی اہمیت و انفرادیت دراصل اس کے مقالات، ان کے موضوعات اور ان کے معیار کے باعث ہے۔ مقالات کے تحت متنوع موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔ "اسلامی تصوف اور مثنوی مولانائے روم" کے عنوان پر ڈاکٹر غلام مصطفے خاں نے نہایت جامعیت اور اختصار سے اسلامی تصوف کے ذیل میں مولانا روم کے خیالات کو اخذ کیا ہے۔ "تذکرہ دتاسی اور معارف" پر عتیق احمد جیلانی نے اور "سے کا مطالعہ" پر ڈاکٹر سعدیہ نسیم نے سیر حاصل، معلوماتی اور وسعت مطالعہ کے حامل مقالات تحریر کیے ہیں۔ "رسالہ عصمت "کا پاکستانی دور" (از مسز رابعہ اقبال) اور "اردو خاکہ نگاری، ایک مطالعہ" (از فہمیدہ شیخ) بھی عمدہ مطالعے ہیں اور یہ اپنے موضوعات کا حق بھی

ادا کرتے ہیں آخر الذکر مقالہ میں ایک مبسوط موضوع کو جامعیت کے ساتھ سمیٹنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے اور اس میں ادبی خاکہ نگاری کے ساتھ ساتھ، شخصیت نگاری، مرقع نویسی اور علمی و مذہبی شخصیات پر لکھے گئے خاکوں کا ذکر بھی آگیا ہے اور یہ عہد حاضر تک خاکہ نگاری کا احاطہ بھی کرتا ہے، اس لحاظ سے یہ عبدالرزاق کانپوری، چراغ حسن حسرت اور حال کے خاکہ نگاروں میں ابراہیم جلیس، شورش کاشمیری، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، علی جواد زیدی، ماہر القادری، ابوالحسن علی ندوی جیسے مستقل اہم ناموں کے ذکر کے بغیر تشنہ محسوس کیا جائے گا۔

اصول و رسمیات تحقیق سے متعلق اس مجلّہ کے گوشے مقابلہ" اور بھی مفید مقالات پر مشتمل ہیں۔ تحقیق و تدوین کے مسائل، اصول اور فن پر پاکستان میں بہت قابل قدر کام نہیں ہوا۔ محض چند مقالات یہاں ان موضوعات کا کل سرمایہ ہیں۔ یہ مجلہ اور اس کے مذکورہ گوشے ان موضوعات کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرنے کی ایک مثال ہیں اور یہ اس امر کا مظہر ہے کہ اس کے مرتبین ان موضوعات سے کس درجہ رغبت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے فن تحقیق پر قبل ازیں بھی نہایت مفید اور قابل قدر مقالات تحریر کیے ہیں، جو پاکستان میں اس موضوع پر موجود سرمایہ میں فی الواقعی ایک اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر مجلّے میں ڈاکٹر صاحب نے "تحقیق کے بنیادی لوازم" پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ اس مقالہ سے جہاں ایک طرف فن تحقیق کے بنیادی لوازم کی تصریح ہوتی ہے۔ وہیں اس میں ایک اچھے محقق کے لیے رہنما اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کے دو مقالات اس مجلّہ میں شامل ہیں۔ ایک مقالہ "ہمارا قدیم طرز تحقیق" موضوع کی مناسبت سے عربی و فارسی کے قدیم طرز تحقیق کے مختصر جائزہ پر مشتمل ہے اور دراصل اس میں

قرون اولیٰ میں تدوین حدیث اور اسماء الرجال کے ضمن میں مرتب ہونے والے اصولوں کے تاریخی جائزہ سے لے کر گیارھویں صدی ہجری تک تحقیق میں اختیار کیے جانے والے لوازم اور اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مقالہ ''رسمیات تحقیق'' کے ذیل میں رسمیات مقالہ نگاری کے عنوان پر ہے اور اسے ایک مستقل صورت میں ترتیب دیا گیا ہے اور مختلف ابواب' مثلاً'' اجزائے مقالہ' اقتباسات' پاورقی حوالے' کتابیات اور متفرقات کے تحت اپنے نقطہ نظر کے مطابق محققین کے لیے رہنما اصول متعین کیے گئے ہیں۔ یہ ایک مفید کوشش ہے جس سے یقیناً'' طلبہ اور محققین کماحقہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس قسم کے مقالہ کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ اکثر مصنفین لوازمات تحقیق کے اختیار کرنے میں بالعموم بے نیازی' ناواقفیت اور غلط فہمی کی بنا پر مقالہ نگاری کے مناسب' معیاری اور سائنٹفک رسوم کا' جنھیں ترقی یافتہ علمی دنیا میں ایک عرصہ سے اختیار کیا جارہا ہے' لحاظ نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کے مقالات' بالخصوص طرز اور اسلوب کے اعتبار سے غیر معیاری اور ناگوار ہوتے ہیں۔ پھر مصنفین کے درمیان رسمیات تحقیق کے معاملہ میں یکسانیت بھی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ خاص طور پر پاورقی حوالوں اور کتابیات کی ترتیب میں انتشار کی کیفیت اکثر نمایاں رہتی ہے۔ اس صورت میں ''رسمیات مقالہ نگاری'' پر یہ مقالہ اپنی جگہ حد درجہ افادیت رکھتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار کی اس کوشش کو بہ نظر استحسان دیکھنا چاہیے کہ انھوں نے ایک کمی کو پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ کس قدر المیہ ہے کہ تحقیق و تصنیف کے جو سائنٹفک اصول و قواعد ایک عرصہ سے علمی دنیا میں مروج ہیں' ہمارے بہت کم مصنفین کو ان سے واقفیت حاصل ہے اور وہ اردو میں انھیں اختیار کرتے ہیں۔ آج تو دنیا علمی لحاظ سے اس قدر تیز رفتار ترقی کر رہی ہے کہ تحقیق میں تخصص' اختصار اور کم لفظی کو ضروری

قرار دیا جانے لگا ہے۔ چنانچہ جو لوازم اور رسمیات تحقیق پچیس، تیس سال پہلے تک عام اور مروج تھیں، اب موضوع تک راست رسائی، اختصار اور کم لفظی کے خیال سے ان میں متعدد تبدیلیاں وضع کی جارہی ہیں۔ مثلاً" اقتباسات کے ضمن میں، جنھیں فاضل مقالہ نگار نے صفحات ۵۸ تا ۶۰ میں بیان کیا ہے، اقتباسات نقل کرنے کا سلسلہ کم سے کم یا بالکل ترک کردیا گیا ہے۔ اب اقتباس نقل کرنے کے بجائے اس کے نفس مضمون کو اپنے مختصر لفظوں میں تحریر کرکے اصل اقتباس کا چاہے وہ کتنا ہی مختصر یا طویل ہو، کل حوالہ دے دیا جاتا ہے۔

اسناد اور کے حوالوں کے ضمن میں اب انقلاب آچکا ہے۔ مثلاً" اب بنیادی حوالہ بین السطور متن ہی میں دے دیا جاتا ہے اور پاورق میں محض ضمنی یا ثانوی ماخذ کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ بین السطور متن میں دیے جانے والے حوالے نہایت مختصر ہوتے ہیں۔ مثلاً" فاضل مقالہ نگار نے صفحہ ۶۲ پر جو حوالہ حامد حسن قادری کی تصنیف "داستان تاریخ اردو" کا دیا ہے، وہ بین السطور متن میں اپنے مقام پر اب اس طرح دیا جائے گا (قادری، ۱۹۵۷ء، داستان تاریخ اردو، ص ۱۰۵)۔ آخر میں "کتابیات" میں حامد حسن قادری کے علاوہ دیگر مصنفین کے نام میں قادری موجود ہے تو حوالہ میں صرف قادری کے بجائے پورا نام (حامد حسن قادری---) لکھا جائے گا۔ فاضل مقالہ نگار صفحہ ۶۲ پر جو مثالیں پاورقی حوالے کے لیے دی ہیں، ان کی جگہ اگر وہ پہلا اندراج ہو تب بھی، اب مختصر حوالے ہی کا رواج ہو گیا ہے کیونکہ اسی سند کا مکمل اندراج کتابیات میں بھی موجود ہو گا۔ اگر کسی مصنف کی کسی سال ایک ہی کتاب شائع ہوئی ہے، تو پھر کتاب کا نام بھی دینا ضروری نہیں سمجھا جاتا، صرف اتنا لکھنا کافی ہوتا ہے: (قادری، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۵) اور اگر کتابیات میں کسی مصنف کی ایک ہی کتاب کا اندراج ہے تو پھر حوالہ میں سنہ اشاعت بھی دینا

ضروری نہیں، صرف یوں لکھا جاتا ہے (قادری، ص ۱۰۵)۔ بعض حضرات تو صفحہ کے لیے علامت ص کی نشاندہی بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ حوالہ کا یہی اصول بین السطور متن کے علاوہ باورق میں بھی اختیار کیا جا رہا ہے۔

اب "کتابیات" ایک مختصر مقالہ کے لیے بھی ضروری سمجھی جا رہی ہے۔ پھر کتابیات کی تقسیم بھی، فاضل مقالہ نگار کی تقسیم صفحہ ۷۱ سے قطع نظر، اس ترتیب سے کی جاتی ہے: (۱) بنیادی (۲) ثانوی

بنیادی کے تحت (ا) غیر مطبوعہ سرکاری و شخصی دستاویزات (ب) مخطوطات (ج) رپورٹیں (د) کتابیں (ہ) رسائل و جرائد میں شائع شدہ مقالات (اگر مقالات 'کتابیں' کے تحت شامل نہ ہوں)۔ اس کے علاوہ اب کتابیات میں اندراج کی ترتیب کو بھی بدل دیا گیا ہے۔ نئی ترتیب کے مطابق اب مصنف کے نام کے فوراً بعد سنہ اشاعت، پھر کتاب کا نام اور آخر میں شہر کا نام۔ مصنف کے نام کے فوراً بعد سنہ اشاعت کا اندراج اس لیے ہو رہا ہے کہ متن میں حوالہ اسی صورت میں دیا جانے لگا ہے اور اس کی توجیہہ میں مصنف کا ذہنی ارتقا پیش نظر ہوتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے رسمیات مقالہ نگاری کے تحت اشاریہ سازی پر خود اظہار خیال نہیں کیا، شاید اس لیے کہ یہ مبسوط اور کتابی صورت میں شائع ہونے والے مقالات کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ضرورت سید جمیل احمد رضوی کے مقالہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ یہ مقالہ بھی اپنے موضوع پر مکمل اور مفید ہے۔ ویسے اس میں ایک اندراج کے تحت ذیلی اندراج یا اندراجات کے ضمن میں رہنمائی نہیں کی گئی۔ مثلاً کسی ایسی تصنیف میں جو اردو یا پاکستان کے موضوع پر ہو، اس کے اشاریہ میں محض 'اردو' یا پاکستان کا اندراج اپنی مکمل افادیت نہیں رکھتا۔ متعدد ضمنی و ذیلی عنوانات اس کے تحت درج کیے جا سکتے ہیں۔

ان ضمنی معروضات سے قطع نظر اس مجلّہ کو اپنے منصوبہ، اپنی نوعیت اور اپنے معیار کے لحاظ سے نہ صرف ایک جامعہ کے شعبہ جاتی مجلّہ کے طور پر بلکہ پاکستان میں اردو تحقیق کی مجلاتی سرگرمیوں میں ایک خوش آئند اضافہ قرار دینا چاہیے۔ شعبہ اردو، جامعہ سندھ اس کی اشاعت پر مبارکباد و تحسین کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ یادگاری مجلدہ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایک ہمہ گیر علمی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مورخ کے علاوہ دانشور، مفکر تعلیم، ڈراما نویس، ناول نگار اور سیاست دان بھی تھے۔ اور ان میدانوں میں ان کی سرگرمیاں نمایاں اور پرکشش رہیں۔ انھوں نے بیک وقت علم و فضل کی متنوع صلاحیتوں کا اظہار کیا اور اپنی فکر انگیز تصانیف کے ذریعے اپنی عالمانہ لیاقت، تاریخی اور سیاسی بصیرت اور علمی جستجو و لگن کے متعدد نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی مجموعی صفات اور ان کی علمی و تصنیفی یادگاروں کے باعث ان کا شمار ان ہستیوں میں کیا جا سکتا ہے، جو کسی ملک و قوم میں اب خال خال پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایسی بہت کم شخصیات ہوتی ہیں، جن کی حیثیت و اہمیت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا جاتا ہے۔ یہ امر بہرحال باعث اطمینان ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمات علمی و قومی کا قدرے اعتراف خود ان کی زندگی میں کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ان کے نیازمندوں اور پرستاروں نے ان کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں اور ان کی علمی و قومی خدمات، ان کی تصانیف اور ان کے مقاصد حیات کے متعلق عام آگہی اور اثرپذیری کو فروغ دینے کی غرض سے ایک ادارہ "ڈاکٹر اشتیاق

حسین قریشی اکادمی" قائم کیا' جو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔ اس اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز ڈاکٹر صاحب کی یاد میں جلسوں کے انعقاد کے علاوہ ایک "یادگاری مجلدہ" کی اشاعت سے کیا ہے۔ یہی یادگاری مجلدہ اس وقت زیر نظر ہے۔

پاکستان میں علمی و قومی اکابر کی تحسین و ستائش کے لیے اور اعتراف خدمات کے طور پر یادگاری مجلدوں کی اشاعت کی روایت بہت محدود ہے۔ جبکہ بیرونی علمی دنیا میں یہ روایت بہت مستحکم اور عام ہے۔ خود پڑوسی ملک بھارت میں اکابر علم و ادب کی خدمت میں اعتراف خدمات اور بطور یادگار مجلدوں کی ترتیب و اشاعت کی روایت بہت عام نظر آتی ہے مثلاً سرجادو ناتھ سرکار' نواب علی یاور جنگ' مولانا امتیاز علی خان عرشی' ڈاکٹر سید عابد حسین' حکیم عبدالحمید' پروفسر محمد مجیب' مالک رام' کرنل سید بشیر حسین زیدی' ڈاکٹر ذاکر حسین' پروفیسر آل احمد سرور' مقبول احمد لاری وغیرہ کی خدمت میں' ان کی حیات میں یا بعد وفات بڑے اہتمام سے مجلدے پیش کیے گئے۔ لیکن پاکستان میں یہ روایت محض مولوی محمد شفیع' جسٹس ایس اے رحمان' ڈاکٹر شہید اللہ اور مولانا مودودی تک مخصوص رہی۔ مگر اب "ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری مجلدہ" اس روایت میں ایک وقیع اور مستحسن اضافہ ہے' جسے ڈاکٹر اشتیاق حسن قریشی اکادمی نے اہتمام اور نفاست سے شائع کیا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے متعدد اکابر علم و فضل نے اس کے لیے مقالات تحریر کیے ہیں' جو متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ہلال احمد زبیری نے' جو مجلس ادارت کے داعی ہیں' ڈاکٹر قریشی کی مختصر سوانح عمری اور مقالہ نگاروں کے مختصر کوائف قلم بند کیے ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' ڈاکٹر سید عبداللہ' مرزا علی اظہر برلاس' ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر انیس خورشید' جسٹس قدیر الدین احمد' کرنل شفیق الرحمان نے

ڈاکٹر قریشی کی علمی و تعلیمی خدمات، ان کی تاریخ نویسی اور ان کے مخصی اوصاف کے مختلف پہلوؤں پر مقالات تحریر کیے ہیں۔ دیگر مقالات کا تعلق متنوع علمی موضوعات سے ہے۔ مثلاً" سید صباح الدین عبدالرحمن نے " سلاطین دہلی کی بادشاہت کا تجزیہ نظری و علمی حیثیت سے" تحریر کیا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے مقالے کا موضوع "تصوف کے اثرات ہندو سماج پر" ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے "ابو منصور عالبی کے چند تاریخی منظومات" تحریر کیا ہے اور ان پر بطور سامانی و غزنوی دور کے اہم ماخذ، محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کا مقالہ "المقریزی کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف" المقفی الکبیر کے تعارف پر ہے۔ اس طرح کا ایک تعارف سید صغیر حسن معصومی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ایک نادر و نایاب بیاض "بدرقتہ الایمان" کا تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الحق کا مقالہ "تصوف عمرؓ" اور محمد عزیز احمد کا مقالہ "اسلامی سیاسی فکر میں شریعت کی اہمیت" بھی عالمانہ اور محققانہ ہیں۔ دیگر مقالات میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا مقالہ "تہذیب جدید کا فکری بحران، اردو ادب کے آئینے میں"" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مقالہ "اردو ہندی تنازع میں علی گڑھ کا کردار" اور شریف المجاہد کا مقالہ "اقبال کے افکار میں پان اسلامزم اور نیشنلزم کے امتزاج سے مسلم نیشنلزم کی تشکیل" اپنے موضوع اور اپنی کاوش کے لحاظ سے خاصے معیاری اور وقیع ہیں اور ان میں مقالہ نگاروں نے تحقیق اور تجزیہ کے امتزاج سے نہایت فکر انگیز نتائج اخذ کیے ہیں۔

یہ مجلدہ اپنی اشاعت کے پس منظر اور مقصد سے قطع نظر--- اپنے مقالات کی افادیت اور ان کے معیار تحقیق و تدقیق کے باعث لائق ستائش ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت سے جہاں ہم پر عائد ڈاکٹر قریشی کا ایک قرض ادا ہوتا ہے، وہیں اس کے توسط سے علمی و ادبی دنیا میں بعض نہایت اہم مقالات کا

اضافہ ہوا ہے۔ سب ہی مقالات عالمانہ و محققانہ اور مفید ہیں اور مرتبین نے انھیں بڑے خلوص دل سے مرتب کیا ہے۔ پھر بھی ترتیب کے نقطہ نظر سے یہ قدرے نظرثانی کا مستحق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مرتبین نے اپنا حق ادارت شاید استعمال نہیں کیا۔ اس ضمن میں سابقہ عمدہ مجلدوں کے نمونے سامنے رکھے جا سکتے تھے۔ مثلاً "پیش لفظ مقالات کے غیر ضروری تعارف سے بوجھل محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح مقالہ نگاروں کے کوائف میں بھی غیرضروری معلومات اور اضافی الفاظ گراں گزرتے ہیں۔ ان کوائف میں اختصار بہتر ہوتا اور انھیں آخر میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ "جاپان میں اردو تعلیم کی تاریخ" اگرچہ ایک جاپانی عاشق اردو نے تحریر کیا ہے، جس کی ستائش واجب ہے اور یہ اپنی معلومات کے لحاظ سے اہم بھی ہے، لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے، اس کی معمولی تصحیح نامناسب نہ ہوتی۔ ان پہلوؤں سے قطع نظر، جو امید کہ اس سلسلے کی انگریزی جلد میں پیش نظر رہے گی، مرتبین نے مجلدہ کو اہتمام سے مرتب کیا ہے اور اس قسم کے یادگاری مجلدوں میں اسے مقالات کی افادیت اور معیار کے لحاظ سے اہمیت حاصل رہے گی۔

خفتگان کراچی

گزشتہ چند صدیوں میں علمی و تہذیبی اعتبار سے ہماری ایک محرومی یا بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ ہم اپنے اجداد و اسلاف کے احوال و آثار کو جاننے اور انھیں محفوظ رکھنے کا وہ اہتمام نہ کر سکے---- جو علم رجال اور اس کی جستجو کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا خاصہ رہا ہے یا اب ترقی یافتہ قوموں اور تہذیبوں میں اس کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ یورپ کے دور افتادہ اور معمولی معمولی دیہاتوں میں قائم دیہی کتب خانوں میں دیہی مراکز میں سینکڑوں برسوں پر محیط پیدائش و اموات کے رجسٹر اب تک نہ صرف محفوظ و مرتب ہیں' بلکہ انہیں ضرورتاً" استعمال کرنے کی ممکنہ سہولتیں فراہم کرنے کو ان قوموں کی ترقی کے ایسے ہی متعدد عوامل میں سے ایک عامل بجا طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہاں کے ایک عام شہری یا دیہاتی کے بارے میں---- جس کی کوئی علمی یا تہذیبی حیثیت نہ بھی رہی ہو---- تب بھی اس کے کم از کم پیدائش و اموات کے کوائف ذرا سی جستجو سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم خود اپنے قریبی عہد اور اپنے اطراف کے ماحول میں متعدد مشاہیر و اکابر کے بارے میں بھی تشنہ معلومات رہتے ہیں۔ اقبال جیسی شخصیت کی تاریخ پیدائش کے بارے میں بھی

ایک متفقہ رائے اور مستند شواہد موجود نہیں۔ اسی لیے ہمارے ادب اور ہماری تاریخ و سیاست کے متعدد اکابر آئے دن محققوں کی مشق ستم کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ ہمارے متعدد محققوں کی مساعی اور ان کا ایک وقیع عرصہ تحقیق ایسی ہی گتھیوں کو سلجھانے میں صرف ہو جاتا ہے؟۔

پچھلی صدی تک برعظیم پاک و ہند اور ہمارے علم و ادب میں مشاہیر کے احوال و آثار کی تحقیق اور ان سے متعلقہ معلومات کی جمع و ترتیب کی طرف شاذ ہی توجہ دی گئی ہے۔ محض ایک دو روز ناموں' خودنوشت سوانح عمریوں اور شعراء و مشاہیر کے تذکروں میں---- جو بالعموم پچھلی صدی کے اواخر سے لکھے جانے لگے---- اپنے معاصرین کے بارے میں اس قسم کی معلومات کو یکجا کرنے کی محض مثالیں نظر آتی ہیں۔ ہاں' اس صدی میں---- صحافت اور ایک عہد تک علمی و ادبی صحافت میں تنوع اور افادیت پیدا کرنے کے لیے---- یا ہمارے بعض اکابر تحقیق و حسیت نے اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اپنے جرائد میں "وفیات" کا سلسلہ شروع کیا' جس کی عمدہ' مفید اور مستقل صورت سلیمان ندوی' عبدالماجد دریا بادی اور ماہر القادری وغیرہ کے قلم سے وجود میں آئی۔ اب قدرے خوش آئند صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اکابر علم و ادب کی رحلت پر جرائد میں تعزیتی شذرات بالعموم لکھے جانے لگے ہیں---- جو مستقبل کے مورخوں اور محققوں کے لیے یقیناً" مفید اور سہل ثابت ہوں گے۔

اسی ضمن میں' وفیات اور تعزیتی شذرات کے ساتھ ساتھ' مشاہیر علم و تہذیب کے لوح مزار کو محفوظ و مرتب کرنے کی طرف بھی اب توجہ کی جانے لگی ہے---- اور کم از کم اردو زبان میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس طرف مستقل توجہ کرنے کا اعزاز پروفیسر محمد اسلم صاحب کو حاصل ہوا ہے۔

ہمارے ہاں اس جانب خصوصیت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کسی اور صاحب نظر نے اب تک توجہ نہیں دی تھی۔ اگرچہ قدیم تہذیبی مراکز میں سے خصوصیت کے ساتھ دکن کے خلد آباد و بیجاپور اور شمالی ہند کے دہلی و اکبر آباد کے آثار پر لکھی جانے والی متعدد کتب میں جا بجا وہاں کے قبرستانوں کا حال، مزارات کی کیفیت اور ان کے کتبوں کی عبارتوں کی نقلیں ملتی ہیں---- لیکن اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ آزاد بلگرامی، درگاہ قلی خاں، مرزا سنگین بیگ، سید احمد خان، مرزا حیرت دہلوی، نور احمد چشتی، مولوی احمد سعید اور غلام یزدانی اور پھر ان کے علاوہ حکیم حبیب الرحمان نے ڈھاکہ اور علی اصغر حکمت نے برعظیم پاک و ہند کے فارسی کتبات پر جو مستقل اہمیت کے کام کیے ہیں، وہ ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً" علی اکبر حکمت اور ان کے رفیق کار اقبل عباد نے ایک مفید نمونہ اس ضمن میں ہمیں دکھایا تھا۔ کم و بیش اسی عرصہ میں اس روایت کو پروفیسر محمد اسلم نے اپنایا اور اسے اپنی خصوصی توجہ سے اب عہد حاضر میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت دے کر اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔ اس موضوع سے متعلق ان کے سلسلہ مقالات نے اولاً" "معارف" اور "برہان" اور "مجلہ تاریخ" میں اہل علم کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی تھی، جن سے اب "وفیات مشاہیر پاکستان" اور "وفیات اعیان پاکستان" کی صورت میں مستقل اور یکجا استفادہ ممکن ہو گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اب اس موضوع پر اپنی توجہ اور مساعی کو شہروں کے حوالہ سے تقسیم کر لیا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی "خفتگان کراچی" جو اس وقت زیر گفتگو ہے اور "آسودگان لاہور" جس کے عنقریب شائع ہونے کی نوید سنی جا رہی ہے، اس نوعیت کے مفید کام ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر اپنے اس مذکورہ کام کے ذریعہ

دراصل اپنے کم ازکم ہم عصر محققوں اور اہل قلم کا ایک طرف فرض کفایہ ادا کیا ہے--- اور فی الحقیقت جس کے احسان سے آئندہ کے محقق اور مورخ کبھی بے نیاز نہ رہ سکیں گے۔ یہاں "خفتگان کراچی" کی حد تک، کراچی کے عام و خاص اہل قلم اور مشاہیر تہذیب سیاست پر تحقیقی کاموں کے دوران اس مجموعہ الواح کو ایک مستند اور ناگزیر کی حیثیت حاصل رہے گی۔ اب تک پروفیسر صاحب کی متعدد تحقیقی و تصنیفی ماخذ کاوشوں سے---- جن میں "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" "تاریخی مقالات"، "سرمایہ عمر" اور "طماس نامہ" کی ترتیب و تدوین کا یہاں بالخصوص حوالہ دیا جا سکتا ہے---- پروفیسر صاحب کی دقت نظری، وسعت مطالعہ، عصری ماخذ سے استفادہ کے رجحان اور ترتیب و تدوین کے حسن کا اظہار ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے ان کارناموں میں "خفتگان کراچی" اور اس نوع کے دیگر سابقہ و آئندہ کاموں کو ان کی منفرد تحقیقی خدمات میں شمار کرنا چاہیے۔ یہاں اس کام کی معنوی و باطنی صفات سے قطع نظر، میں بالخصوص "خفتگان کراچی" کی ترتیب اور اس کے لیے پروفیسر صاحب کی طویل محنت شاقہ کو قابل تحسین و مبارک باد سمجھتا ہوں۔ اس کام کی تکمیل کے لیے آج کی بے حد مصروف اور گوناگوں مسائل میں گھری ہوئی زندگی میں پروفیسر صاحب کو اس دشوار گزار کام کے لیے متواتر وقت نکالنا اور اس کے لیے جانفشانی اور مشقت کے عذاب میں سید احمد خاں سے کچھ کم نہ گزرنا پڑا ہو گا۔ لیکن تاریخ اور تحقیق کو ایسے ہی پر عزم بزرگوں سے سہارا ملتا ہے۔ حالی نے اپنے وقت کی دہلی کے بارے میں جو یہ کہا تھا کہ "دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز"---- پروفیسر صاحب کی یہ کاوش دراصل حالی کے اس قول کو آج کے دور سے مناسبت رکھنے والے مشاہیر کے حوالہ سے کراچی پر منطبق کرنے کے لیے کافی ہے۔ خصوصاً" ان مشاہیر کی روحوں کو، جن کے سین

وفات تک عام اور دستیاب نہیں ہوتے' اس کتاب کی اشاعت سے سکون ملا ہو گا۔ اور خود ہمارے لیے یہ کیا کم اطمینان کی صورت ہے کہ پروفیسر صاحب نے ایک ایسے کام کو اپنے ذمہ لیا اور اسے آگے بڑھایا ہے---- جو تحقیق رجال میں بنیادی ماخذ کی حیثیت سے ہمیشہ ضرورت مندوں کی معاونت کرتا رہے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہے گا اور خفتگان و آسودگان کے بارے میں معلومات کی طلب بڑھے گی---- یہ تصنیف اتنی ہی ناگزیر ہوتی جائے گی۔ اس اعتبار سے یقیناً یہ آئندہ پھر شائع ہو گی---- اور ہمیں بجا طور پر یہ امید کرنی چاہیے کہ جن خفتگان کے الواح کا اندراج اس میں ممکن نہ ہو سکا' وہ بھی اس میں شامل ہوتے رہیں گے۔

مجھے اس کتاب کے موضوع و مندرجات کی اہمیت کو یہاں حاضر ہو کر بیان کرنے میں جو مسرت محسوس ہو رہی ہے' یہ اس ممنونیت کا ایک حصہ ہے' جو اس کتاب کی ترتیب کے دوران فاضل مولف کی صبر آزما مشقت و محنت کا خیال کرتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہی ہے۔ میں خوش ہوں کہ مجھے اس محفل میں اپنی ممنونیت کے برملا اظہار کا موقع میسر آیا۔

تاریخ تناولیاں

سلطان سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں غزنی کے درہ تانال سے اعوان' پٹھان اور سادات کے سینکڑوں خاندان مردان اور سوات کے علاقوں میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ درہ تانال کی مناسبت سے اس علاقہ کا نام " تناول" پڑگیا اور یہاں آباد ہونے والے خاندان "تناول قوم" کے نام سے موسوم ہوئے۔ پیش نظر کتاب سید مراد علی علی گڑھی' منشی سرحد چوکی دربند ضلع ہزارہ نے انگریزی ملازمت کے دوران ۱۸۷۵ء میں تحریر کی تھی۔

اس کتاب کا بیشتر حصہ سردار پائندہ خاں کے عہد پر مشتمل ہے۔ اس کے دور کا اہم واقعہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد ہے' جو ہندوستان گیر جدوجہد پر مبنی تھی' لیکن اس کا فیصلہ کن مرحلہ اسی علاقہ میں پیش آیا۔ سردار پائندہ خاں کے بعد سردار جہانداد خاں اس کا وارث ہوا جو نومبر ۱۸۵۸ء' تک متمکن رہا۔ پھر ۱۸۷۵ء اس کتاب کے سال تصنیف تک ' محمد اکرم خاں' سردار مدو خاں وغیرہ حکمراں رہے۔ اس دور کا ہندوستان بلکہ برعظیم سیاسی اعتبار سے بڑے فیصلہ کن مراحل سے گزر رہا تھا۔ اصلاحی اور انقلابی تحریکیں ابھر رہی تھیں اور حکومت کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ اس برعظیم میں یہ بات قریب قریب

طے پا چکی تھی کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اپنی فوجی طاقت کے بل پر مختلف غیر اسلامی قوتوں کے عروج کو روک سکے اور ایک مستحکم حکومت کا قیام عمل میں لا سکے۔ غیر مسلموں کا تسلط اور بڑھتے ہوئے قدم مسلمانوں کے وجود ہی کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔ اس کے باوجود اس وقت مسلمانوں ہی میں خود غرض عناصر اپنی سرگرمی سے باز نہ آئے۔ انگریزوں کا سیاسی اثر بنگال کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں بھی تیزی سے بڑھ گیا تھا اور برطانیہ برعظیم میں ایک بالادست قوت بن چکا تھا اور کوئی ایسی ریاست یا فرمانروا نہ تھا جو اس کی بالادستی کو دعوت مقابلہ دے سکتا۔ لیکن شاہ عبدالعزیز نے، جو اپنے والد شاہ ولی اللہ کی فکر اور تعلیمات سے بہرہ مند تھے، برعظیم کو "دارالحرب" قرار دیا۔ ان کے خیال میں مسلمان اب ایک ایسے علاقے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس پر اقتدار سے انھیں محروم کر دیا گیا ہے اور انگریزوں کی حکومت میں مسلمان پوری آزادی سے فرائض مذہبی انجام نہیں دے سکتے، اس لیے ان کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ لیکن چونکہ مغل شہنشاہ بے بسی کی حالت میں انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی کوئی علیحدہ منظم تحریک نہ تھی اس لیے اس فتوی کا کوئی فوری عملی نتیجہ نہیں نکلا، تاہم اس نے ایک انقلابی تحریک کو جنم دیا جس کا مقصد حکومت الہیہ کا قیام تھا۔ یہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد تھی۔ اس جہاد کا رخ سردست پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا جس کے مسلمانوں پر ظلم کرنے اور ان کی مذہبی آزادی میں خلل انداز ہونے کی خبریں عام تھیں۔ انگریزوں کا رویہ بظاہر مگر مصلحتاً "غیر جانبدار" رہا کیونکہ اس جہاد سے انھیں ہندوستان کی دو طاقتوں کے ختم ہو جانے یا کمزور ہو جانے کی توقع تھی جس کے بعد وہ فاتح اور مفتوح دونوں پر آسانی سے غلبہ پا سکتے تھے۔ پنجاب کی سکھ حکومت سے جنگ کا فیصلہ کافی غور و

خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ سکھوں کی حکومت ظالم تھی اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی تعصب رکھتی تھی۔ ان کی حکومت کا بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اپنی حکومت کو شمال مغرب میں پٹھانوں کے وطن پر وسعت دینے کا عمل سکھوں کی طرف سے برابر جاری تھا۔ مجاہدین کا عزم یہ تھا کہ مسلم اکثریت والے علاقے اور پٹھانوں کی مملکت کو آزاد کرالیا گیا تو مزید سرگرمیوں کے لیے یہ علاقہ ایک مرکز بن جائے گا۔ اس عزم کے تحت مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ جہاد کی تفصیلات سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی شہادت کے بعد بھی یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کے بچے کھچے دیگر رفقاء اور پیروؤں نے اس کو بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس تحریک سے وابستہ مجاہدین پیش پیش رہے۔ اس کی ناکامی کے بعد شمال مغربی سرحدوں میں ان کی انگریزوں سے براہ راست جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ انگریزوں نے ۱۸۴۵ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں کے اس نئے اقتدار کا نتیجہ یہ تھا کہ اب تحریک مجاہدین کا براہ راست تصادم انگریزوں سے ہو۔ ابتداء" انگریز اس پر کچھ زیادہ فکر مند نہ ہوئے کیونکہ رنجیت سنگھ مجاہدین کے ساتھ جنگ میں مشغول تھا۔ لیکن جب سکھوں کی حکومت ختم ہو گئی تو اس قسم کی تحریک کا جاری رہنا کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان جھڑپوں کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک اور پھر ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں انگریزوں سے مجاہدین کی باضابطہ فوجی مہموں کا ذکر ریکارڈ پر موجود ہے۔ یہ آخری مہمیں تھیں جن کی تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بیسویں

صدی کے اوائل تک، ریشمی رومال کی تحریک کی تفصیلات دریافت ہونے سے، مجاہدین کی انگریز دشمن سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ انگریزوں کے لیے یہ صورت حال ہمیشہ پریشان کن رہی۔ چنانچہ وہ، اپنی روایتوں کے مطابق مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے، جو مسلمانوں میں جوش جہاد کم کرنے کی سعی کرنے لگا۔ تحریک مجاہدین کی مختلف پہلوؤں سے مخالفت اور تحریک قادیانیت اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان سے وابستہ افراد نے جہاد کے خلاف مختلف وقتوں میں فتوے دیے اور مجاہدین کو کبھی وہابی اور کبھی کافر قرار دیا۔ فتوؤں کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لیے کتابیں بھی تصنیف کرائی گئیں جن پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی تھی۔ اب پیش نظر کتاب کی تصنیف کا مقصد دیکھیے۔ اس کی روشنی میں صحیح رائے خود قائم ہوتی ہے۔ مصنف تمہید کے صفحہ ۳، ۴ میں لکھتا ہے:۔

ص ۳: "اما بعد سید مراد علی بن سیّد عنایت علی قدیم متوطن شہر کوئل عرف علی گڑھ وارد ضلع ہزارہ و محرر چوکی دربند ضلع مذکور خدمت میں ارباب علم و ہنر اور قدردانان تاریخ و سیر کے عرض کرتا ہے کہ ہمیشہ سرکار انگریزی مربی اور مروج علوم گوناگوں کی تھی اور ہے، ---- سرشتہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی و پنجاب سے حسب منشاء سرکار مصنفوں کو معقول انعام عنایت ہوئے۔ حسب دلخواہ قدردانی ہوئی۔ اسی طرح صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کالج لاہور نے تصنیف و تالیف کی رغبت دلائی، انعام و صلہ کا وعدہ فرمایا۔ ماہ اکتوبر ۱۸۷۲ء میں راقم حروف"

ص ۴: "سرحد علاقہ تنول پر مامور کیا گیا---- اس کتاب تاریخ تناولیاں نام کو چار باب میں بہ تفصیل آئندہ مرتب کیا۔ امید ہے کہ عموماً کل ممالک اور خاص اس ضلع اور اطلاع قریبہ کے طالب علم

اس کے مطالعے سے حظ وافر اٹھائیں گے۔ علم تاریخ میں دلگی کا محاورہ درست ہو گا مگر جب تک کہ میری تصنیف خدام یا احترام نواب فریدوں فردارا افسر سکندر بخت جمشید تخت صاحب سیف و علم داور گردوں حشم جامع کتاب تجارت اوس جناب مسٹر آر ایچ ڈیوس صاحب بہادر لیفٹنٹ گورنر ممالک پنجاب دام اقبالہ و اجلالہ کی نظر کیمیا اثر سے گزر کر خلعت قبول نہ پائے ہرگز مقبول نہ ہو گی۔ کیونکہ مقولہ قدیم ہے الناس علی دین ملوکھم۔ بہرحال فضل خدا سے امید ہے کہ حضور ممدوح نظر عاطفت مبذول فرما کر میرے تحفہ حقیر کو منظور فرمائیں گے اور دعاگوے دولت صلہ اور جائزہ شاہانہ سے محروم نہ رہے گا۔ خاتمہ اس تاریخ کا بماہ مئی ۱۸۷۵ء عہد دولت مہد' عادل زماں' نوشیروان جہاں' رعیت پرور داد گستر جناب مسٹر واٹرفیلڈ صاحب بہادر دام نوالہ' ڈپٹی کمشنر ضلع ہزارہ میں ہوا''۔

اس وقت کے ہندوستان کی سیاسی صورتحال میں انگریزوں کا مطمح نظر اور مصنف کی مرقومہ تمہید سے کتاب کے مندرجات اور اس کی تصنیف کے مقاصد پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے اپنی مطلب براری کے لیے' مصنف کی چاپلوسی پر یقیناً" اسے خطیر انعام و اکرام سے نوازا ہو گا۔ اس کتاب کی اشاعت سے انگریزوں نے ان علاقوں میں ضرور فائدہ بھی اٹھایا ہو گا۔ جہاں کہ ایک ایک مورچے کو سر کرنے کے لیے انھیں ایک ایک صوبے کی پوری آمدنی صرف کرنی پڑتی تھی۔

موجودہ اشاعت کے تعارف نگار اور حاشیہ نگار نے کتاب کے مندرجات پر نہ صرف کلی اتفاق کیا ہے بلکہ اپنی اپنی تحریروں میں' جو شامل

کتاب ہیں، کسی طور پر بھی مصنف سے پیچھے نہیں ہیں۔ مثلاً تعارف نگار کے یہ جملے: (صفحہ ۲)۔

۱۔ : "۱۸۳۰ء میں سید احمد بریلوی اور مولوی اسماعیل دہلوی نے پشاور، مردان اور سوات کی مسلم آبادی کو بزور شمشیر محکوم بنا کر سردار پائندہ خان کو پیغام بھجوائے اور خود مل کر بھی بیعت کی دعوت دی۔ جب وہ بیعت پر تیار نہ ہوا تو سید صاحب نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا کر چڑھائی کر دی"۔

۲۔ :"اس (پائندہ خاں) نے-----سکھوں سے مدد لے کر سید صاحب کے لشکر پر حملہ کر دیا اور انھیں علاقہ چھوڑ کر بالا کوٹ کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ غالباً" مسلمانوں اور سکھوں نے مشترکہ طور پر تعاقب کر کے، سید صاحب اور ان کے لشکر کو بالا کوٹ میں تہس نہس کر دیا"۔

اور حاشیہ نگار کا یہ کہنا کہ:۔

"غیور پٹھانوں کی بیوہ لڑکیوں سے یہ مجاہدین جبراً" نکاح کر لیتے ہیں" (صفحہ ۵۰) اخلاقی اور ذہنی کم مائیگی کی مثالیں ہیں۔

کتاب کی حالیہ اشاعت کا مقصد بھی تناولی قوم کی تاریخ سے زیادہ تحریک مجاہدین کی مخالفت معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ "تعارف نگار" اور حاشیہ نگار کتاب کے تمام مندرجات کو اپنے موضوع سے نظر انداز کر کے محض تحریک مجاہدین کو نشانہ نہ بناتے۔ اگر تناولی قوم کی تاریخ مرتب کرنا ان کا مقصد ہوتا تو آج کی تحقیقات کے مطابق اور آج کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی تحقیقی اور سائنٹفک تاریخ مرتب کرائی جا سکتی تھی۔ اس اشاعت کو کوئی علمی اور تاریخی دریافت یا مثبت کام نہیں کہا جا سکتا۔ گو کہ اسے حقائق کو منظر عام پر

لانے کی کوشش قرار دیا گیا ہے، لیکن ایسے "حقائق" انگریزی عہد میں انگریزی مفادات کی خاطر بڑی شدومد سے منظر عام پر آتے رہے ہیں جنھیں راسخ العقیدہ ذہن اس وقت بھی اور اب بھی مکروہات ہی سے تعبیر کرتا ہے۔

سیدان بادشاہ گر

ڈاکٹر صفدر حسین خاصی معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں ان کی متعدد تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آئی ہیں اور ان کی ہر نئی تصنیف ان کی متعدد نئی تالیفات کے طویل اشتہار سے بھی آراستہ ہوتی ہے جن سے ان کی کاوشوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زیر نظر تالیف "سیدان بادشاہ گر" سادات بارہہ سید حسن علی خاں اور سید حسین علی خاں کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ مرتب نے اسے "تاریخ فرح بخش" مولفہ محمد فیض بخش کاکوروی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے لیکن فی الحقیقت یہ دیگر کتابوں جیسے 'ماثر الامراء 'منتخب اللباب' 'سیر المتاخرین وغیرہ کے اقتباسات و اندراجات پر بھی مشتمل ہے۔ ابتداء میں صفحہ ۵۵ تک مرتب کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ بارہہ کے سید برادران کے تاریخی و سیاسی کردار اور ان سے منسوب احوال و نتائج کو نئے سرے سے متعین کیا جائے اور اپنے طور پر کوشش کر لی جائے کہ جو احوال و اعمال ان سے منسوب ہیں ان کا رد کیا جا سکے۔

مقدمے میں ابتداء" سادات بارہہ کی ہندوستان آمد اور ان کے سیاسی عروج کا تذکرہ ہے اور چند کتابوں سے محض ایسے اقتباسات دئیے گئے ہیں جو

سادات بارہہ کی تعریف و توصیف میں ہیں۔ پھر ہر دور میں ان کی ممتاز شخصیتوں کی ایک فہرست درج کی گئی ہے جو ۱۳ تا ۳۷ صفحات پر محیط ہے۔ فہرست کے بعد ایک شعر کے ساتھ "خلاصہ کلام" تحریر کیا گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

حقیقت آج تہ خاک سے ابھرتی ہے
زبان فریب مورخ پر طنز کرتی ہے

اس شعر سے ان کے آئندہ موضوع بحث کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعد کے تمام صفحات میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ سید برادران کے کردار کو بے داغ اور ستھرا بنا کر پیش کیا جائے۔ کیونکہ --- مرتب کے مطابق---- سادات بارہہ کے دشمنان اعظم یعنی محمد امین خاں تورانی اور نظام الملک کے خاندان کے حاشیہ نشینوں' چاپلوسوں اور نمک خواروں نے حد درجہ بے بنیاد' بے محل اور متعصبانہ الزامات تراشے ہیں اور سوا دو سو سال تک تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ چنانچہ مرتب کے خیال کے مطابق--- "برعظیم کے مسلمانوں کی عمارت اقتدار کو منہدم کرنے میں سید برادران شریک نہیں تھے بلکہ نظام الملک اس کا سبب تھے" (ملاحظہ فرمائیے مرتب کا مقدمہ صفحہ ۳۸) اس مقام پر مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ان خیالات پر' جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے ضمن میں انھوں نے سید برادران کے تعلق سے بیان کیے تھے' سخت تنقید کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مرزا بیدل کو بھی درج ذیل قطعہ لکھنے پر سخت مطعون کیا گیا ہے:

دیدی کہ چہ بادشاہ گرامی کردند
صد جور و جفا از رہ خامی کردند
تاریخ چواز خرد بجستم فرمود
سادات بوئے نمک حرامی کردند

پھر جذباتی حیص بیص سے "بچ کر" مرتب نے وہ نتائج تحریر کیے ہیں جو بعد میں سید برادران کے نہ ہونے سے سلطنت مغلیہ کو پہنچے۔ مقدمے کے بعد سید برادران کے ضمن میں وہ اقتباسات درج ہیں جو تاریخ فرح بخش اور ماثرالامراء وغیرہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان اقتباسات میں کوئی انکشاف نہیں بلکہ یہ باتیں جو ان میں تحریر ہیں کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں اور خصوصاً" مرزا بیدل کی نظر سے' جو اس دور کے چشم دید گواہ ہیں اور نہ مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی نظر سے۔ کیونکہ ان حضرات نے بھی اپنی بات انھیں مذکورہ تاریخوں سے مکمل کی ہے۔ اس کتاب کی قابل توجہ تحریر محض مقدمہ ہے۔ جس میں مرتب کی جذباتیت خاصی نمایاں ہے۔ وہ صفحہ ۴۸ پر اس سے احتراز کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کرپائے۔ مرتب نے نظام الملک کے تعلق سے ڈاکٹر باسو کا ایک حوالہ دیا ہے جس میں وہ نظام الملک کے رویے پر تنقید کرتا ہے۔ یہ اقتباس اس طرح نقل کیا گیا ہے اگر نظام الملک کا رویہ برا ثابت ہو جائے تو خود بخود گویا سید برادران کا ستھرا اور معصوم کردار ابھر کر آ جاتا ہے۔ اسی طرح سے علامہ اقبال کا وہ مشہور قطعہ بے موقع نقل کرنا جو انھوں نے غلام قادر روہیلہ کے تعلق سے کہا تھا اور مولانا سید ابوالاعلی مودودی کا اقتباس تحریر کرنا جو "دکن کی سیاسی تاریخ" میں اورنگ زیب کے وصیت نامے سے ماخوذ ہے' مذکورہ سید برادران کے مثبت کردار کا ثبوت فراہم نہیں کرتے۔ پھر جس انداز سے مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر قریشی پر تنقید کی گئی ہے اس سے نقاد کی شخصیت کا سنجیدہ پہلو سامنے نہیں آتا۔ مرزا بیدل کی "ہرزہ سرائی" مولانا گیلانی کے "متعصبانہ ملائی انداز" کے اظہار کے بعد ڈاکٹر قریشی کے ذہن کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے کہ اور ان کی تحریروں میں "نسل برادری' خاندانی پیشہ عقیدہ وغیرہ کے تعصبات" تلاش کیے گئے ہیں۔ اگر کسی فن پارے پر تنقید کی جا

رہی ہو تو فنکار کے ذہن کے مطالعے کے لیے اس کا سماجی، نفسیاتی اور موروثی پس منظر ضروری اور مفید ہوتا ہے لیکن جہاں تاریخی حقائق، ان کے ثبوت اور نتائج کی بات ہو، وہاں ان کا تذکرہ ذاتیات پر حملے کی صورت میں نری جذباتیت اور غیر سنجیدگی کا مظہر تو ہو سکتا ہے، دلیل اور تعقل کا اظہار نہیں۔

مرتب نے اپنے خیالات کے ثبوت میں بعض مورخین کے حوالے دیئے ہیں اور ان کی تحریروں سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں لیکن انھیں مورخین نے اگر سید برادران پر تنقید کی ہے یا ان کے کردار کے کسی قبیح پہلو کا تذکرہ کیا ہے تو اس کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ نظام الملک پر تنقید کے سلسلے میں انگریزوں اور متعصب ہندوؤں کے اقتباسات تو دیے ہیں لیکن ان مورخین کی تحریروں کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جنھوں نے اگر سید برادران کو برا نہیں کہا یا ان کی تعریف کی ہے تو ساتھ ہی نظام الملک کی بھی تعریف کی ہے۔ خافی خان کا متعدد مرتبہ حوالہ بھی دیا ہے اور اس کی تاریخ سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں لیکن اگر وہ نظام الملک کی تعریف میں یہ کہتا ہے کہ "وہ شجاعت، کارطلبی، اصابت رائے اور اکثر کمالات انسانی میں نادر العصر تھا" (منتخب اللباب، جلد دوم ص ۶۹۱) تو اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ جہاں مطلب کی بات غلام حسین طباطبائی نے کی تو اسے نقل کر دیا گیا ہے لیکن اگر ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ "نظام الملک نے نادر شاہ کی حرص و طمع کو اکسا کر تباہ و برباد کر دیا" (سیر المتاخرین، جلد دوم ص ۴۸۴) تو مرتب نے یہ خیال نہیں کیا کہ طباطبائی اور سعادت خاں دونوں انھیں روایات کے پیرو تھے، جن کے سید برادران حامل رہے۔ محمود خان منگلوری کی کتاب "تاریخ مملکت خداداد" سے بھی مرتب نے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ گویا منگلوری بھی، جس طرح دوسروں کے لیے مستند ہیں، مرتب کی نظر میں بھی استناد رکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ سلطنت کے

اسقاط کے اسباب میں یہ کہتے ہیں کہ میر علی رضا اور میر غلام علی لنگڑا نے اپنے "مخصوص مذہبی مفادات" کی خاطر میر صادق کے پس پشت انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے ٹیپو سلطان سے غداری کی تھی تو کیا یہ مرتب کے لیے قابل قبول ہے؟۔

مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے اسباب پر دو سو سال سے بحث جاری ہے۔ اس بحث کا جو خلاصہ ابھر کر آیا ہے وہ مسلمہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ ناقابلیت' کوتاہ بینی' خود غرضی اور غداری کی ایک داستان ہیں۔ بعد کے قریب عرصے میں فی الحقیقت تین اشخاص' جن میں سے ایک ذوالفقار خاں اور دو بارہہ کے سید برادران تھے' اسلامی سلطنت کی عمارت اقتدار کو منہدم کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ ان کے اعمال میں سے کوئی عمل ایسا نہ تھا جو خود غرضی اور غذاری کے پست ترین محرکات سے ملوث نہ ہو۔ ان کی خود غرضی کو کم کرنے والا کوئی واقعہ تاریخ کے صفحات پر موجود نہیں ہے۔ ورنہ مرتب کتاب ہذا کو اقتباسات تلاش کرنے اور مدافعت کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی۔ ان سید برادران نے تو مملکت کے استحکام کی کوشش کرنے اور ان عناصر کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے' جو مفید خدمت انجام دے سکتے تھے' سلطنت کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا اور ان لوگوں سے امداد طلب کی' جنھوں نے حرص و طمع کی تسکین کے لیے دور دراز سے آ کر دہلی کو تباہ و برباد کر دیا۔ پھر مرہٹوں کو دارالحکومت میں آنے کی دعوت دی گئی اور دراصل سادات بارہہ کی کوتاہ بینی سے ہی انھیں ملک پر اقتدار بھی حاصل ہو گیا۔

اپنے ذرائع اور اثر و نفوذ سے ایسی مزید کوششیں اور بھی ہو سکتی ہیں' بلکہ مرتب نے اس عزم کا اظہار مقدمے کی آخری سطور میں کیا بھی ہے' لیکن

کیا تاریخی حقائق محض سادے صفحات ہوتے ہیں جن پر ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق لکھتا چلا جائے؟۔

تذکرہ مصنّفین درس نظامی

"درس نظامی" جو برعظیم پاک و ہند کے عربی مدارس کا مروجہ نصاب ہے، کئی حیثیتوں سے امتیازی اور انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے ملا نظام الدین سہالوی نے، جو ملا قطب الدین انصاریؒ جیسے متبحر اور یگانہ روزگار عالم کے فرزند تھے، مرتب کیا تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں ملا نظام الدین نے اپنے درس کا آغاز کیا تھا۔ ان کے درس و تدریس کی شہرت ملک گیر تھی۔ پچاس پچپن برس تک آپ درس دیتے رہے۔ انھوں نے اپنے والد کے درس میں ترمیم کر کے درس نظامیہ کا نصاب جاری کیا۔ اس نصاب میں صرف، نحو، منطق فلسفہ و حکمت، ہیئت و ہندسہ، معانی و بیان، فقہ، اصول فقہ، کلام و عقائد، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، مناظرہ، ادب عربی، عروض شامل تھے۔ ان مضامین میں ہر دور کے ممتاز علماء کی بلند پایہ کتب بطور نصاب شامل تھیں۔

زیر نظر کتاب درس نظامی میں شامل کتب کے مصنفین کا تذکرہ ہے اور اس سلسلے کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو گی جس کے مصنف، مولف، مترجم، شارح اور محشی کا تذکرہ اس کتاب میں نہ کر دیا گیا ہو۔ یہ اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے جس کے لیے فاضل مصنف اختر راہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

عام افراد کی لاعلمی تو معمولی بات ہے لیکن درس و تدریس سے متعلق افراد بھی اپنی نصابی کتب کے مصنفین و مولفین سے شاید ہی واقف رہے ہوں۔ مدارس دینیہ اور مدارس عربیہ کے اساتذہ اور طلبہ کتابوں کے سمجھنے اور یاد کرنے میں تو خاصی محنت کا ثبوت دیتے ہیں لیکن کسی کتاب کے مولف کے بارے میں ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں تو یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ کتاب کے مصنف کا تعارف اور اس کی علمی و ادبی خدمات کا پس منظر پیش نظر رہے۔ اس سے خود کتاب' اس کے مباحث' عقائد و افکار کے سمجھنے میں ضروری مدد ملتی ہے۔

مصنفین کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے شامل کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں "حرف آغاز" ہے جس میں ملا نظام الدین کا خاندانی پس منظر' ان کے حالات زندگی' درس تدریس اور درس نظامی کی ترتیب کا تذکرہ ہے۔ پھر کتب درس نظامی کی فہرست' موضوعات اور مصنفین کے لحاظ سے درج کی گئی ہے۔ اس سے قاری ایک ہی نظر میں مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ تقریباً" ستر (۷۰) مصنفین کے حالات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے نہایت جامع اور کمال تحقیق سے مرتب کیے گئے ہیں اور تقریباً" تمام ضروری دستیاب معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ یہ کام نہایت دشوار گزار تھا۔ کیونکہ یہ مصنفین دیگر ممالک اسلامیہ سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سوانح حیات اور تذکرے عام طور پر آسانی سے فراہم نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اور پھر ایک دشواری یہ بھی تھی کہ قدیم علماء اپنی کسر نفسی اور عجز و انکسار کے طفیل اپنے تعارف کو سنجیدہ مزاجی کے خلاف اور معیوب سمجھتے تھے۔ لیکن فاضل محقق نے اپنی حد تک تحقیق و کاوش میں پوری کوشش کر لی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ وہ اپنے متعدد علمی اور تحقیقی مضامین کے سبب علمی اور دینی حلقے میں

متعارف شخصیت ہیں اب اس موضوع پر تو انھیں اولیت کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

اپنے موضوع اور تراجم کی بدولت کتاب نہایت اہمیت اور افادیت کی حامل ہے اور اہل قلم اور طالبان علم کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

انتخاب گنج شریف

زیرِ نظر تصنیف اپنی اہمیت کے اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ اس کے فاضل مرتب سید شرافت نوشاہی نے اسے کتب خانہ دانش گاہ پنجاب کی مختلف بیاضوں اور مخطوطات سے جمع کر کے اس مجموعہ کو "انتخاب گنج شریف" کے نام سے موسوم کیا اور اس کے ہندی اور اردو انتخاب کو موجودہ صورت میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس انتخاب کا پیش لفظ لکھ کر اس کی حیثیت و اہمیت واضح فرمائی ہے اور پروفیسر محمد اقبال مجددی نے اس پر ایک نہایت مبسوط اور مفید مقدمہ تحریر کیا' جس میں شاہ محمد نوشہ گنج بخش قادری کے حالات و تصنیفات اور "گنج شریف" کے حضرت نوشہ کا کلام ہونے کے ضمن میں دلائل خاصے مفصل لکھے ہیں۔ اس مقدمہ اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے تعارف نے اس تصنیف کو خاصہ مفید بنا دیا ہے۔ فاضل مرتب نے بھی اس تصنیف کو مرتب و مدون کرنے میں نہایت درجہ جانفشانی سے کام لیا ہے۔ ترتیب و تدوین میں انھوں نے جس مہارت و لیاقت کا ثبوت فراہم کیا ہے وہ لائق تحسین و قابل داد ہے۔ انھوں نے اس تصنیف کو اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ "نوشہ گنج بخش کے اردو کلام پر مشتمل

ہے اور ایک نئی دریافت ہے' اس کی اشاعت سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گا اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے غور و فکر کی نئی راہیں سامنے آئیں گی"۔

یہ انتخاب دراصل مختلف رسائل کا مجموعہ ہے۔ اپنی مجموعی حیثیت میں یہ اردو اور پنجابی کے چھ ہزار چار سو اشعار پر مشتمل ہے جس میں حصہ اردو کے دو ہزار چار سو اور پنجابی کے چار ہزار اشعار ہیں۔ یہ نہ صرف اردو اور پنجابی کی تصنیف ہے بلکہ اکبری' جہانگیری اور شاہجہانی دور کی ایک مذہبی کتاب ہے۔ بالخصوص یہ اکبری دور کے الحاد' ہندوؤں کے تفوق' اثر و نفوذ اور مذہبی بے راہ روی کے خلاف حضرت نوشہ کی ایک تبلیغی کوشش ہے جس میں قرآن و حدیث کے مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر اس میں شریعت' طریقت' معرفت' حقیقت کے عناصر و لوازم کو مثالیں دے کر بیان کیا گیا ہے تاکہ اس کتاب کے مخاطب اسلام کے حقائق و معارف اور اس کی صداقت سے روشناس ہوں۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے' یہ انتخاب نظم میں ہے۔ اور اس کے لیے پچیس اوزان اختیار کیے گئے ہیں۔ جن کی مثالیں پروفیسر اقبال مجددی نے اپنے مقدمے میں نقل کی ہیں اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کے دو خصائص تحریر فرمائے ہیں' ایک تو اردو تصنیف کی قدامت کے لحاظ سے اور دوسرے پنجاب میں اردو کے اعتبار سے۔ اب تک یہ نظریہ عام تھا کہ "پنجاب میں اردو شاعری دکن کے بعد اور دلی کے معاصر شروع ہوئی ہے" اسے پروفیسر شیرانی نے پیش کیا تھا۔ "گنج شریف" کی دریافت سے اس امر پر روشنی پڑھتی ہے کہ اردو شاعری پنجاب میں دکن کے بعد نہیں' اس کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہی ہے بلکہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال کے مطابق اس سے بھی پہلے۔ لیکن یہ امر ابھی تحقیق طلب

ہے کیونکہ ایک تو "گنج شریف" کے سن تصنیف کا کوئی تعین نہیں ہو سکا ہے اور دوسرے حضرت نوشہ کے سن وفات میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ اور پھر اس پر گفتگو اور دلیل زیادہ ضروری ہو جاتی ہے جب بقول ڈاکٹر عبداللہ "گنج شریف میں محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور ترقی یافتہ زبان کے نمونے موجود ہیں" اس زبان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دیکھ سکے کیا اور کو ذوالجلال کی ذات
چیونٹی ساگر پی لیا یہ نوشہ انوکھی بات

نوشہ جو درویش ہیں تن کا ہے یہ حال
کبھی روپ جہاں کے کبھی دکھاویں جلال

مرشد طالب کو دی خلافت
طالب سوں بھاگی کل آفت

ہمہ اوست تو حال ہے ہمہ ازیست ہے قال
نوشہ کہے سن پیارے اور نہ حال نہ قال

تب حق آپ دیدار دکھایا
نور ظہور کے تخت پہ آیا

تو ہی گزشتہ تو آئندہ
تو ہی پیوستہ تو پائندہ

تو ہی ماضی حال استقبال
ہوں نہ سون سب تیرا خیال

یہ مثالیں قلی قطب شاہ کی معاصر زبان کی معلوم نہیں ہوتیں۔ فاضل

مرتب اور مقدمہ نگار نے "گنج شریف" کی لسانی خصوصیتوں اور بحثوں کو لسانیات کے ماہرین پر چھوڑ دیا ہے تاکہ اس کی زبان پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالیں لیکن اگر ساتھ ساتھ یہ کوشش کی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ ترتیب و تدوین کے لحاظ سے اور اس کی اہمیت کے تعین میں کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہنے پاتی۔ قدیم اردو کی اس نادر تصنیف پر کماحقہ' اظہار خیال ہونا چاہیے۔ کسی بھی قدیم مخطوطہ کا پڑھنا اور لفظوں کا تلفظ اور مفہوم متعین کرنا خاصہ مشکل مرحلہ ہے' لیکن مرتب نے جس دیدہ ریزی اور ذوق و شوق سے اس کام کو انجام دیا ہے' اس کی داد کے وہ مستحق ہیں۔ رسائل کے عنوانات پر جو آیات یا احادیث تحریر ہیں یہ مرتب ہی کی شامل کردہ ہیں اور آخر میں ایک نہایت ہی جامع اور ضروری فرہنگ بھی فاضل مرتب ہی نے ترتیب دی ہے۔ امید ہے کہ اس تصنیف کی لسانی خصوصیتوں اور اہمیت پر ضروری بحث ہو گی بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے سلسلے میں اس سے مستند مواد کا کام لیا جائے گا۔

کتاب شناسی (تحقیقی مجلّہ)

اردو زبان میں تحقیقی مجلوں کی اشاعت اگرچہ بہت قابل اطمینان نہیں، لیکن پھر بھی مختلف النوع تحقیقی مجلّے شائع ہوتے ہیں اور ان میں ایسے مجلّے بھی شامل ہیں جو کسی خاص مقصد کے تحت اور مخصوص موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن علمی لحاظ سے بعض ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارے ہاں کسی ایسے تحقیقی مجلّے کا وجود عنقا رہا ہے، جو محض کسی خاص موضوع کتاب یا کتاب شناسی کو پیش نظر رکھ کر، مرتب کیا جائے۔ حال میں اسلام آباد سے "کتاب شناسی" کا پہلا شمارہ شائع ہوا ہے، جو تمام تر کتاب شناسی کے موضوعات سے متعلق متون، مقالات اور تبصروں پر مشتمل ہے۔ اس کے مرتبین اختر راہی اور سید عارف نوشاہی ہیں، جو اپنے تحقیقی کاموں اور کتاب شناسی کے لحاظ سے نہایت اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ اس مجلّے کے اجرا کے مقاصد ان کے پیش نظر، جو اس کے پیش لفظ میں بیان کیے گئے ہیں، یہ ہیں کہ اس میں قلمی نسخوں کی شناخت، ان کے زمانی و مکانی تعین، ان کی تصحیح و تعلیق، جدید انداز پر ان کی فہرست سازی، خطوط کا مطالعہ، کاغذ کی پہچان، روشنائی کی خصوصیات، مصنفین کے احوال و آثار کی جستجو، نو دریافت آثار کا تعارف، پھر مخطوطات اور

مطبوعات کے تحفظ اور ان سے استفادے کے مسائل جیسے موضوعات پر مشتمل مقالات اور ان موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں اور جرائد پر تبصرے پیش کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ اس پہلے شمارے ہی میں تقریباً ان تمام موضوعات کا اہتمام نظر آتا ہے اور یہ مرتبین کی ایک بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنے متعینہ موضوعات پر فاضل محققین و مصنفین سے مقالات حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ڈاکٹر محمد سلیم اختر، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، محمد حسین تسبیحی، نجیب مائل ہروی، ڈاکٹر احمد حسین احمد قلعداری وغیرہ کا قلمی تعاون انھیں حاصل ہوا اور ان حضرات کے محققانہ اور عالمانہ مقالات اس مجلّے کے اہم مشمولات کہے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد سلیم اختر نے شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی ایک نو دریافت تصنیف "تحفتہ الولاۃ و نصیحتہ الرعیہ و الرعاۃ" کا تعارف اور متن پیش کیا ہے۔ یہ کتاب آداب حکومت اور امور مملکت داری کے موضوع پر عہد مغلیہ کی اولین تصانیف میں سے ایک ہے اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ محمد بن طاہر پٹنی کی اس تصنیف کا کسی کو علم بھی نہیں تھا۔ فاضل محقق ڈاکٹر محمد سلیم اختر کو، جنھیں اس طرح کے مزید نوادر دستیاب ہوئے ہیں اور ان میں سے مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے "رسالہ نوریہ سلطانیہ" اور خواجہ خرد کے "رسالہ نور وحدت" کو وہ مرتب بھی کر چکے ہیں، یہ تصنیف ۱۹۷۹ء میں خیرپور پبلک لائبریری میں نظر آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں اس تصنیف کے قلمی نسخے کا ایک مفصل تعارف تحریر کیا ہے اور اس کے موضوعات اور مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں اس تصنیف کے چند ابواب میر سید علی ہمدانی کی تصنیف "ذخیرۃ الملوک" سے ماخوذ ہیں اور مصنف نے غزالی کی تصنیف "نصیحتہ الملوک" سے بھی اپنی اس تصنیف میں استفادہ کیا ہے۔

اس کے مطالعے کے علاوہ فاضل محقق نے مصنف محمد بن طاہر پٹنی کے حالات اور ان کے آثار بھی نہایت تحقیق اور جامعیت سے تحریر کیے ہیں' پھر متن نقل کیا ہے۔ اس کے حواشی اور تعلیقات انھوں نے اس مقالے میں تحریر نہیں کیے' یہ اس تصنیف کے زیر ترتیب انگریزی ترجمے کے ساتھ پیش کیے جائیں گے۔

کتاب کے حوالے سے اس مجلّے میں مزید دو مقالات شامل ہیں۔ ایک "برہان قاطع" پر ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا اور دوسرا "کشف المحجوب ہجویری کے مخطوطات' مطبوعہ نسخوں اور تراجم کا کتابیاتی جائزہ" محمد حسین تسبیحی کا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اپنے مقالے میں "برہان قاطع" کے مولف محمد حسین برہان تبریزی کے حالات اور "برہان قاطع" کے ماخذ اور اس سے اعتنا کی مثالوں کا تحقیقی مطالعہ بھی کیا ہے اور پھر اس کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی کیفیت بیان کی ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ان چار کتب لغت "فرہنگ جہانگیری" "مجمع الفرس"' "سرور کاشانی' سرمہ سلیمانی" "صحاح الادویہ" کی اہمیت و افادیت پر بھی ایک نظر ڈالی ہے جن سے برہان تبریزی نے استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے اس لغت کے ۳۸ نسخوں کی نشان دہی کی ہے جو مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ پاکستان میں' ان کے خیال میں صرف تین قلمی نسخے موجود ہیں۔ لیکن اس مجلّے کے فاضل مرتبین نے استدراک میں مزید سات نسخوں کی نشان دہی کی ہے' جو پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ قلمی نسخوں کے علاوہ فاضل مقالہ نگار نے اس کے مطبوعہ نسخوں کی تفصیلات بھی درج کی ہیں۔ ان کے مطابق یہ لغت دس مرتبہ شائع ہوئی اور اس کا سب سے صحیح اور معلومات کے اعتبار سے بے حد مفید اور کارآمد ایڈیشن ڈاکٹر محمد معین کا مرتبہ (۱۹۶۳ء) ہے۔

محمد حسین تسبیحی کا مقالہ جسے سید عارف نوشاہی نے فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے، دراصل فاضل مقالہ نگار کے دانش گاہ پنجاب، لاہور سے فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کے حصول کے لیے لکھے گئے مقالے بعنوان "تحقیق در احوال سید علی ہجویری و تحلیل مطالب کشف المحجوب" کا ملخص ہے، جس میں مقالہ نگار نے اس تصنیف کا مفصل تعارف تحریر کیا ہے اور دنیا بھر کے کتب خانوں میں موجود اس کے قلمی نسخوں، اس کے متعلقات، اس کے مطبوعہ نسخوں اور اس کے تراجم (اردو، عربی، ترکی، انگریزی) کا ذکر کیا ہے۔ اس جائزے کے مطابق اس تصنیف کے ۵۳ قلمی نسخے معلوم ہیں۔ اس کے دو حاشیے تحریر کیے گئے، جو غیر مطبوعہ ہیں اور اب تک اس کے تیرہ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ تراجم کے لحاظ سے اس کے اردو میں دس، عربی، ترکی اور انگریزی میں ایک ایک ترجمہ شائع ہوا۔

مصنفین کے علمی آثار پر اس مجلّے میں تین مقالات شامل ہیں۔ ایک مقالہ احمد بخش یکدل لاہوری کے علمی آثار پر ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے تحریر کیا ہے۔ یہ مفصل تحقیقی مطالعے پر مشتمل ہے۔ یکدل (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۷ء) اپنی علمی فضیلت، شاعری اور اپنی تصانیف کے لحاظ سے اپنے عہد کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے یکدل کے قیام دہلی کے دوران میں انھیں "فخر الشعراء" کا خطاب دیا تھا۔ نور احمد چشتی (مصنف "تحقیقات چشتی") ان کے فرزند تھے۔ متعدد تصانیف نظم و نثر اردو، فارسی اور پنجابی ان سے یادگار ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے، جو لاہور کے چشتی خاندان کی علمی و ادبی خدمات پر گہری نظر رکھتے ہیں، اپنے اس مقالے میں یکدل کی سوانح اور ان کی تصانیف اور شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ مقالہ نئی اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ اسی انداز کا دوسرا مقالہ نجیب مایل ہروی کا "کتاب شناسی و نسخہ شناسی آثار علاء و الدولہ

سمنانی" (فارسی) اس مجلّے میں شامل ہے، جس میں معروف صوفی علاء الدولہ سمنانی کی تصانیف کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے۔ سمنانی کی تصانیف، جو فاضل مقالہ نگار کے مطابق کم از کم ۴۸ ہیں، اب غیر مطبوعہ ہیں اور ان کے حالات و آثار پر زیادہ لوگوں نے توجہ بھی نہیں دی ہے۔ اس صورت میں ان کی کل اور اصل تصانیف کی تلاش و جستجو بھی خاصا وقت طلب کام تھا، مقالہ نگار نے ان کی تمام دستیاب تصانیف اور ان کے معلومہ نسخوں کی تفصیلات جمع کرنے میں خاصی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اب تک اپنے موضوع پر سب سے جامع اور معلوماتی مقالہ ہے۔ اس ضمن میں ایک مقالہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا "حافظ محمود شیرانی بہ حیثیت کتاب شناس" ہے جو تاثراتی ہے، لیکن خاصا مفید اور معلوماتی ہے۔ اس سے حافظ محمود شیرانی کے ذخیرہ نوادر کی اہمیت اور افادیت کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب شناسی کی صفات کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس مجلّے کے دیگر مقالات، دستاویزات اور مخطوطات کی حفاظت کے مسائل، ہرات کے فن تجلید اور گجرات کے جلد سازوں پر ہیں۔

غرضیکہ سب ہی مقالات معلوماتی اور کئی اعتبار سے مفید ہیں۔ انھیں مقالہ نگاروں نے خاصی محنت اور دل جمی اور وسعت مطالعہ کی مدد سے لکھا ہے۔ یہ مقالات اور اس مجلّے میں شامل دیگر تمام مقالات اپنے معیار تحقیق اور مقالہ نگاروں کی تلاش و جستجو کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ مرتبین نے اس مجلّے کی ترتیب و اشاعت میں خاصی محنت اور دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ مقالات کو مقالہ نگاروں سے لے کر اشاعت کے لیے دے دیا بلکہ ہر ایک مقالے پر گہری تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے اور اگر انھیں ضرورت محسوس ہوئی تو استدراک بھی تحریر کیے ہیں اور مقالے میں پیش کی گئی معلومات میں یا تو اضافہ کیا ہے یا تصحیح کی ہے۔ یہ جہاں ایک طرف ادارتی فرض

شناسی کی ایک مثال ہے تو دوسری طرف تصنیف و تحقیق سے ان کے لگاؤ اور علمی دیانت سے ان کی نسبت کا اظہار بھی ہے۔

مناسب ہو گا کہ مقالہ نگاروں کا سرسری تعارف بھی مقالوں کی ابتدا میں شامل کر دیا جائے کہ یہ تحقیقی مجلوں کا عالمی انداز ہے۔

مجلّہ خاصی نفاست اور سلیقے سے ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے۔

تاریخ مشغلہ

مسلمانوں کے عہد زوال میں اودھ برعظم میں ہند اسلامی تہذیب کا ایک منفرد نمونہ تھا۔ جو اپنی رنگارنگی اور دلکشی کے باوصف تقریباً ایک سو سال تک اپنی مخصوص تہذیبی زندگی کے وسیلے سے مسلمانوں کے لیے ایک مرکز نظر رہا۔ عبدالحلیم شرر نے اسے مشرقی تمدن کا آخری نمونہ سے بجاطور پر موسوم کیا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے عہد زوال میں یہ اپنے آغاز (۱۷۶۴ء) سے اپنے انتزاع (۱۸۵۶ء) تک ایک نئی معاشرت کا نقاش بنا رہا۔ برعظم میں مسلمانوں نے جس تہذیب کو فروغ دیا تھا' وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے عرصے میں اودھ منتقل ہونا شروع ہو گئی اور ایک نئی معاشرت نے جنم لیا۔ اس معاشرت کا' جسے لکھنؤ کا تمدن کہا جاتا ہے' آغاز دراصل اس وقت سے ہوتا ہے' جب بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) میں شکست کھانے کے بعد نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء-۱۷۷۵ء) کی توجہ کا مرکز فیض آباد بنا۔ اس شکست نے شجاع الدولہ کے ہاتھ سے ایک لحاظ سے اس کی تلوار گرا دی اور اس کی زیادہ توجہ فیض آباد کی رونق و آراستگی اور طوائفوں کی سرپرستی کی طرف مبذول ہوئی اور اودھ کے حکمران طبقے میں اس عیش پرستی کا سلسلہ شروع ہوا' جو واجد علی

شاہ (۱۸۴۷ء ۱۸۸۷ء) کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچ گئی اور اس نے لکھنؤ کی تہذیب کو تصنع آمیزی، خارجیت پسندی اور ظاہری صورت گری سے مخصوص کر دیا۔ اودھ کے حکمرانوں نے تہذیبی سطح پر جو انفرادی روایات قائم کی تھیں، وہ سب واجد علی شاہ کی زات اور اس کے عہد کے لکھنؤ میں یکجا نظر ہیں۔ واجد علی شاہ بے پناہ فنکارانہ اور خلاقانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ اگرچہ ایک بادشاہ تھا، لیکن اس کی حیثیت و شخصیت کا اظہار دراصل ایک فن کار کی صورت میں زیادہ ہوا ہے، اور اس کی یہی حیثیت اسے تہذیب و ادب میں پر کشش بناتی ہے۔ ورنہ قومی و سیاسی تاریخ کا فیصلہ اس کے حق میں مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ تاریخ نویسوں نے واجد علی شاہ اور اس کے عہد پر کافی توجہ دی ہے۔ مورخین کے خیال میں وہ ایک معصوم اور مظلوم حکمران تھا، نہ وہ زوال سلطنت کا زمہ دار تھا اور نہ اس کے کردار میں کوئی خامی تھی۔ اس کے بارے میں امور حکومت سے بے نیازی اور عیش و عشرت کی جو داستانیں عام ہیں، یہ انگریزوں کی غلط بیانی کا نتیجہ ہیں اور یہ باتیں مصلحتاً عام کی گئی تھیں تاکہ انھیں بہانہ بنا کر اودھ کا الحاق کیا جا سکے۔ اس خیال کے مقابلے میں مورخین کا ایک طبقہ اس نقطۂ نظر کا حامل ہے کہ واجد علی شاہ ایک بدکردار شخص تھا، جس نے ساری زندگی عیش و طرب اور بحیثیت حکمران امور سلطنت سے بے نیازی میں گزار دی۔ اس قسم کے ملے جلے خیالات واجد علی شاہ اور اس کے عہد پر لکھی جانے والی تقریباً تمام تصانیف میں مل جاتے ہیں۔

اودھ کی سیاسی و معاشرتی تاریخ کے نشیب و فراز کا تنقیدی جائزہ اور تجزیہ تقریباً ایک سو سال سے متعدد مورخین کا موضوع رہا ہے۔ قریب قریب ایک سو سال قبل ۱۸۸۷ء میں ولیم ہوئے (William Hoey) نے "تاریخ فرح بخش" کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے گلہ کیا تھا کہ اودھ کی تاریخ کے

صرف چند مختصر نمونے اردو و فارسی میں موجود ہیں" لیکن جسے "تاریخ" کہا جائے، وہ ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ اس کا یہ گلہ حقیقت پر مبنی تھا، لیکن یہ صورت حال بہت عرصے تک برقرار نہ رہی۔ سید کمال الدین حیدر نے "قیصرالتواریخ" (لکھنؤ ۱۸۹۶ء) اور نجم الغنی نے "تاریخ اودھ" (لکھنؤ ۱۹۱۹ء) لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی طرف قدم بڑھایا۔ چنانچہ عبدالحلیم شرر کی لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت پر "گزشتہ لکھنؤ" اور واجد علی شاہ پر "جان عالم" (لاہور "۱۹۵۱ء) جیسی تصانیف ایک مستقل اضافہ ثابت ہوئیں۔ حال کے مورخین اور محققین میں جی ڈی بھٹنانگر کی تصنیف "Awadh Under waJid Ali Shah" (بنارس ۱۹۶۸ء) اور مرزا جعفر حسین کی تصنیف "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" (دہلی ۱۹۸۱ء) اور سید مسعود حسن رضوی ادیب اور مرزا اظہر علی برلاس کی تصانیف واجد علی شاہ کے حالات اور عہد پر مستقل اہمیت اور توجہ کی مستحق ہیں۔

اودھ کی تاریخ و تہذیب کے تحقیقی مطالعے کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس عرصے میں بالخصوص واجد علی شاہ کی شخصیت اور کارنامے محققین کی دل چسپی کا موضوع بنے ہیں۔ واجد علی شاہ کی تصانیف میں سے جن کی تعداد خود واجد علی شاہ کی مرتبہ فہرست کے مطابق، جو اس نے اپنی تصنیف "بنی" میں درج کی تھی، چھیالیس تھی اور جو اس کے انتقال کے وقت تک بقول مسعود حسن رضوی ادیب تقریباً ستر تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے کئی شائع نہ ہوئیں۔ ان تصانیف میں سے "حزن اختر" "بحر مختلف" "عشق نامہ" اور "پری خانہ" واجد علی شاہ کے بارے میں مفید ماخذ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کو جو خطوط لکھے، وہ بھی بنیادی ماخذ کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔ اس طرح کے خطوط کے مجموعے خود واجد علی شاہ کی خواہش پر

مرتب ہوئے تھے۔ اپنی تصنیف "بنی" میں واجد علی شاہ نے، اگر "خطوط واجد علی شاہ بنام شیدا بیگم" مرتبہ نورالحسن ہاشمی کو "تاریخ مذہب" قرار دیا جائے تو کم از کم دس مجموعۂ مکاتیب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے مذکورۂ بالا کے علاوہ "تاریخ ممتاز" مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، "تاریخ نور" مرتبہ کلیم الدین احمد، "تاریخ بدر" مرتبہ عرش ملیح آبادی، "تاریخ غزالہ" مرتبہ وصی بلگرامی شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر مجموعوں میں سے "تاریخ جمشیدی" بنام جمشیہ بیگم، "تاریخ فراق" بنام ملکۂ دہر نواب نوروزی بیگم غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ "تاریخ دہر"، "تاریخ مشغلہ" اور "تاریخ خاص" کے بارے میں صرف معلومات تھیں، یہ مجموعے دستیاب نہیں تھے۔ ان میں سے "تاریخ دہر" کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ غالباً "تاریخ فراق" ہی ہو، کیوں کہ دونوں کا مکتوب الیہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ یا ممکن ہے کہ ملکۂ دہر نواب نوروزی بیگم کے نام خطوط کے دو مجموعے مرتب ہوئے ہوں۔ "تاریخ خاص" بہر حال دستیاب نہیں ہوا، لیکن "تاریخ مشغلہ" محمد اکرام چغتائی کو وی آنا (آسٹریا) کے قومی کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات میں اب تک کا معلومہ اس کا واحد نسخہ دستیاب ہو گیا۔ چنانچہ اپنے مفصل مقدمہ اور ضروری تعلیقات کے ساتھ اسے انھوں نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اور ان کا یہ مرتبہ نسخہ اس وقت پیش نظر ہے۔

"تاریخ مشغلہ" میں شامل خطوط، جو تعداد میں ۴۲ ہیں، واجد علی شاہ نے مشغلۃ السلطان نواب آبادی جان بیگم کو لکھے تھے۔ واجد علی شاہ کی بیگمات کا تذکرہ اس کی کتابوں میں ملتا ہے اور دیگر مصنفین نے بھی چند بیگمات کا ذکر مختلف موقعوں پر کیا ہے، لیکن آبادی جان بیگم کا ذکر عام طور پر نہیں ملتا۔ صرف "مجموعہء مبارک مسمی بہ شیوع فیض" میں واجد علی شاہ نے اس خاتون کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے، لیکن صرف اس کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے

اور اس کے ساتھ گذرے ہوئے وقت کو یاد کیا ہے۔ اس کے حالات اور سوانح کے بارے میں مربوط معلومات کہیں نہیں ملتیں۔ محمد اکرام چغتائی نے " تاریخ مشغلہ" سے اس خاتون کے بارے میں بعض اشارے اخذ کیے ہیں اور واجد علی شاہ سے اس کے روابط پر مقدمہ میں بڑی محنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طوائف تھی اور رقص و موسیقی میں ماہر تھی۔ شعروشاعری سے شغف تھا اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتی تھی۔ واجد علی شاہ نے جب ناٹک یار ہس ترتیب دیا تو اس میں حصہ لینے کے لیے گانے بجانے والی عورتیں "پری خانہ" میں جمع کی گئیں۔ انہی میں ایک آبادی جان بھی تھی۔ رہس میں کنہیا کا کردار خود واجد علی شاہ ادا کیا کرتا تھا' جب کہ رادھا کا کردار ادا کرنے والی عورتیں تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ رہس کے کسی ایک کھیل میں آبادی جان نے بھی رادھا کا کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ اپنے چند خطوط میں واجد علی شاہ نے اسے "رادھا" کے نام سے بھی مخاطب کیا ہے۔ معزولئ سلطنت کے بعد جب واجد علی شاہ کا "پری خانہ" اجڑنے لگا اور اس میں رہنے والی طوائفیں پھر سے اپنا کاروبار شروع کرنے لگیں تو آبادی جان بیگم نے بھی اس قسم کا ارادہ ظاہر کیا' لیکن واجد علی شاہ نے اسے پاکبازی اور شرافت کی زندگی گزارنے پر آمادہ کر لیا۔ محمد اکرام چغتائی نے ان حالات و واقعات اور ان کے پس منظر کو خاصی عرق ریزی سے ان خطوط کے متن کے حوالے سے مربوط کیا ہے اور کہیں کہیں دیگر ماخذ سے بھی مدد لی ہے۔

موضوعات اور انداز بیان کے لحاظ سے واجد علی شاہ کے یہ خطوط ان دیگر خطوط سے مختلف نہیں ہیں' جو واجد علی شاہ اپنی دیگر بیگمات کو لکھا کرتا تھا۔ ان میں آبادی جان کے حسن و جمال کی تعریف خوش گوار دنوں کی یاد' آبادی جان کی فرمائشیں اور انھیں پورا کرنے کا وعدہ' اشعار کی داد و تحسین یا

اپنے اشعار پر تاثرات کی فرمائشیں اور قید فرنگ کے محسوسات اور ایام شاہی اور ایام بربادی کا موازنہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان خطوط کا انداز بیان اس وقت کی لکھنوی نثر کے مطابق ہے' جسے رجب علی بیگ سرور نے رواج دیا تھا۔ یعنی مقفی' مسجع اور ادق۔ اکرام چغتائی نے مقدمہ میں خطوط کے ان خصائص کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اردو زبان و ادب میں ان کی اہمیت کے اظہار کے لیے مختلف آراء کو یک جا بھی کیا ہے۔ مقدمہ خاصا مفصل ہے اور اس میں ان خطوط کے موضوعی اور معروضی تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ تعلیقات' جو متن کی توضیحات اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہیں' نہایت تحقیق سے تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں پیش کی گئی معلومات کو متعدد عصری اور حانیہ ماخذ کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے اور یہ مرتب کے وسعت مطالعہ اور جاں فشانی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

محمد اکرام چغتائی اردو کے ایک منفرد اور لائق محقق ہیں۔ انھوں نے اب تک متعدد تحقیقی کام کیے ہیں اور کئی نادر اور اہم ادبی متون کو متعارف اور مدون کیا ہے اور تاریخ ادب کے کئی گم شدہ اور دور افتادہ گوشوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی تلاش و جستجو کی کاوشوں سے کئی نوادر دریافت ہوئے ہیں۔ زیر نظر مجموعۂ خطوط بھی ان کی ایک اہم دریافت ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے تمام عمر بالخصوص واجد علی شاہ کے حالات اور ان کی تصانیف جمع کرنے میں گزار دی لیکن عمر بھر کی تلاش و جستجو کے باوجود وہ "تاریخ مشغلہ" کے کسی نسخے کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ حسن اتفاق سے اس کا واحد نسخہ اکرام چغتائی کو یورپ کے ایک دور افتادہ کتب خانے میں مل گیا اور انھوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے بڑی محنت اور سلیقے سے تحقیق کے تمام تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتب کر دیا۔ یہ مجموعہ خطوط

واجد علی شاہ کی ایک گم شدہ تصنیف ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ذاتی حالات اور اس عہد کے بعض واقعات کی توثیق کے لیے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ چار پانچ سال میں اودھ کی تاریخ و تہذیب کے ایک اور بنیادی و عصری ماخذ، نواب حسین علی خاں کی تصنیف "تاریخ حسینیہ" کے قلمی نسخے کے علاوہ "تاریخ مشغلہ" کی دریافت ایک اہم علمی واقعہ ہے۔ اسے محمد اکرام چغتائی نے نہایت جاں کاہی سے مرتب کر کے کمال تحقیق اور سلیقہ ترتیب کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

اسلامی کتب خانے

کتاب اور کتاب داری سے مسلمانوں کے تعلق اور ان کی دلچسپی کی روایات بڑی قدیم ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی ترغیب کے نتیجے میں حصول علم میں ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے اور اُسے اپنے لئے فریضہ تصور کیا ہے۔ چنانچہ تصنیف و تالیف اور علمی ذخیروں کو مرتب و محفوظ رکھنا ان کا قومی شعار رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں جابجا جس کثرت سے درس گاہیں قائم ہوئیں اور کتب خانے ترتیب دیئے گئے' شاید دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ اپنے علمی و تہذیبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کی یہ کوشش اس ابتدائی مرحلے پر ترقی یافتہ علمی و تمدنی شعور کی بہت واضح علامت تھی۔ عام علمی و تہذیبی دنیا میں مسلمانوں کے اس شعور کی میراث کا اعتراف اب ایک عام سی بات ہے۔ مسلمانوں نے علمی تاریخ میں جو اضافے کیے ہیں' اب اعتراف حقیقت کی صورت میں یہ خود آج کی مہذب اقوام کے مقتدر علماء کا بھی موضوع ہیں اور ایک عرصہ سے ایسے جائزے مرتب ہو رہے ہیں جن سے مختلف علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ جہاں مختلف علوم وفنون میں مسلمانوں کی ترقیوں کا جائزہ لینے کی

متعدد کوششیں مستشرقین اور خود مسلمان محققین میں ہوئی ہیں' اور ان میں سے بعض کوششیں بہت مفصل اور متنوع بھی ہیں' لیکن اس کے باوجود کتب خانوں کی ترتیب اور اس کے تدریجی ارتقاء اور ان کی تاریخ کا جائزہ لینے کی روایت بہت اطمینان بخش نہیں ہیں۔ یہ موضوع یا تو بالکل نظرانداز رہا ہے یا سرسری طور پر کہیں کسی جائزے میں ضمنی طور پر آگیا ہے۔ ایسی کوئی تصنیف جو اس موضوع پر مفصل اور جامع ہو ' موجود نہیں بہت اطمینان بخش نہیں ہیں ۔ یہ موضوع پر مفصل اور جامع ہو' موجود نہیں تھی۔ بعض ایسی تصانیف جو نظام تعلیم و تربیت یا تعلیمی ترقی کے بارے میں لکھی گئیں' جزوی طور پر اس موضوع کا احاطہ ضرور کرتی ہیں' اور اس کی ایک اچھی مثال ڈاکٹر احمد شبلی کا تحقیقی مقالہ "ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن" ہے' لیکن یہ بہت سرسری ہے اور سیر حاصل نہیں ۔ پھر اس میں خاص طور پر مصر کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ تعلیم و تہذیب وتمدن کی تاریخ پر دوسری کتابوں کی بھی کم وبیش یہی نوعیت ہے' جن میں یا تو بہت مختصر طور پر کتب خانوں کا حال بیان کیا گیا ہے یا محض کسی علاقے کے کتب خانوں کا سرسری تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

علاقائی کتب خانوں کے تاریخی جائزے پر حال میں کچھ مفید کام ضرور ہوا ہے' لیکن یہ زیادہ تر تمدنی تاریخ کے جائزے کا ایک حصہ ہے' جیسے مولانا ابوظفر ندوی نے گجرات کے اور پھر ہندوستان کے اسلامی کتب خانوں کا معلوماتی تحقیقی جائزہ لیا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک تحقیقی مقالہ اسپین کے کے کتب خانوں کے بارے میں ڈاکٹر امام الدین نے مرتب کیا۔ جہاں تک عام اسلامی کتب خانوں کے تاریخی و تحقیقی جائزے کا تعلق ہے' بعض مختصر تحریریں ضرور سامنے آئی ہیں اور یہ معلومات افزا اور جامع بھی تھیں' جیسے اولگا پسو کا تحقیقی مقالہ جو اطالوی زبان سے انگریزی میں اور پھر اردو میں بھی ترجمہ ہوا' یا مولانا شبلی نعمانی

کا مقالہ ''اسلامی کتب خانے''، لیکن یہ دونوں مقالے جو اپنے موضوع پر بجائے خود بہت قیمتی معلومات کے حامل ہیں، لیکن محض قرون وسطی کے دور تک کے جائزے پر مشتمل ہیں۔ اس اعتبار سے اب تک ایک ایسی مبسوط اور جامع کتاب کی ضرورت بہر حال موجود تھی جو مکمل طور پر اسلامی کتب خانوں کے بارے میں ہوا اور جس میں اس موضوع سے متعلقہ تمام پہلوؤں جیسے خود کتاب، مسلمانوں کا فن کتاب داری، کتب خانوں کی تعمیر اور ان کی تنظیم اور اسلامی ممالک کے تمام اہم اور قابل ذکر کتب خانوں کے احوال و خصائص کا جائزہ لیا جائے۔ اگر ان تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس موضوع پر جو کاوشیں ہوئی ہیں ان پر نظر ڈالی جائے تو محض الحاج محمد زبیر صاحب کی تصنیف ''اسلامی کتب خانے'' ہی ایسی ہے جو اس موضوع کا مکمل طور پر اور جامعیت کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔

مصنف کی شخصیت اور ان کی مفید علمی کاوشیں نہ اس موضوع کے تعلق سے کوئی اجنبیت رکھتی ہیں اور نہ اس موضوع پر ان کی یہ پہلی کوشش ہے۔ بر عظیم پاک و ہند میں فن کتاب داری میں محض جن چند افراد کا نام اہمیت رکھتا ہے، ان میں بھی مسلمانوں کے قومی و ملی تقاضوں کی روشنی میں، اس فن کے لیے جن اختراعات اور جن ضروری تبدیلیوں کی ضرورت تھی انھیں وضع کرنے والوں میں مولوی محمد شفیع اور الحاج محمد ﷺ زبیر کے نام ہمیشہ اہمیت کے حامل سمجھے جائیں گے اور پھر اس سے قطع نظر، مسلمانوں کے کتب خانوں کی تاریخ اور ان کے جائزے پر مشتمل بر عظیم پاک و ہند میں جو معیاری کام ہوا ہے، اس میں بھی الحاج محمد زبیر صاحب کی کاوشیں نمایاں ہیں اور اہمیت رکھتی ہیں۔ پھر اسلامی کتب خانوں کے جائزے کے ضمن میں انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اس موضوع پر انھوں نے پہلی مرتبہ ایک مکمل اور مبسوط کتاب

تصنیف کی، جس کی ایک عام علمی دنیا کو عرصے سے ضرورت تھی۔ اگر یہ کتاب، اور پھر اپنی ان خصوصیات کے ساتھ جو اس میں شامل ہیں، تصنیف نہ ہوتی تو یہ اہم موضوع اور اس کی ضرورت تشنہ رہتی۔ یقیناً دنیائے علم وادب مصنف کی احسان مند رہے گی کہ انھوں نے نہ صرف آج کی دنیا کے لئے بلکہ مستقبل کی دنیا کے لیے بھی ایک ایسی نہایت مفید اور معلوماتی کتاب پیش کی ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے علمی وتمدنی کارناموں سے روشناس کرانے میں بلکہ ان کی تہذیبی تاریخ کے تسلسل کو مربوط و محفوظ رکھنے میں معاون رہے گی۔ نہ یہ تصنیف محض کسی ایک مخصوص علاقے کے کتب خانوں کے بارے میں ہے اور نہ محض یہ کسی خاص دور کے کتب خانوں کے بارے میں ہے اور نہ محض یہ کسی خاص دور کے کتب خانوں کا احوال پیش کرتی ہے۔ یہ اس اعتبار سے مکمل اور جامع ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ اسلامی کتب خانوں کے قیام اور ان کے انتظام پر اس قدر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ اب تک کسی اور تصنیف میں اس طرح مفقود تھی۔ یہ جائزہ دیگر تصانیف میں بھی موضوع بنا ہے لیکن فرق معلومات کی فروانی اور جامعیت کا بہرحال موجود ہے اور جو اس زیر نظر کتاب کی ایک خصوصیت ہے۔ اسلامی ممالک کے تمام قابل ذکر کتب خانوں کی تاریخ اور ان کے احوال کا جائزہ بھی جس التزام اور توجہ کے ساتھ اس کتاب میں لیا گیا ہے یہ اب تک اس ضمن میں پہلی مثال ہے۔ کسی ایک ملک یا کسی ایک خطے کے کتب خانوں کا جائزہ بعض اور کتابوں میں بھی شامل ہے لیکن معروف کے ساتھ ساتھ غیر معروف اور دور افتادہ شہروں اور علاقوں کے تمام قابل ذکر کتب خانوں کو مجموعی طور پر کسی ایک کتاب میں سمیٹنے کی کوئی کوشش بسیط پیمانے پر نہیں ہوئی تھی جو اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس میں جن سینکڑوں کتب خانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض کتب خانوں پر کسی نہ کسی کتاب میں

طویل و مختصر معلومات مل ہی جاتی ہیں لیکن بیشتر کتب خانوں کے بارے میں دو چار نہیں بلکہ دس بیس ماخذ کتابوں کی عرق ریزی کے بعد کہیں کچھ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں، مگر اب یہ دقت طلب کام اس کتاب کی وجہ سے ضروری نہ رہا۔ سینکڑوں مستند و ماخذ کتابون کے صبر آزما مطالعہ کے بعد مصنف نے ہم سب کے لیے بڑی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ اب ہر اہم کتب خانے کے بارے میں چند صفحات میں تمام ضروری معلومات میسر آجاتی ہیں۔

برعظیم پاک و ہند کے کتب خانوں کے بارے میں بھی مصنف نے بڑی جانکاہی کا ثبوت دیا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں کتب خانوں کے قیام اور ان کے انتظام پر بہت قیمتی معلومات یکجا کی ہیں۔ ان میں سے کئی معلومات ایسی ہیں جو پہلے کبھی عام نہیں ہوئی تھیں۔ پھر انھوں نے تفصیلی طور پر مسلمانوں کے عہد حکومت کے مختلف ادوار کے تحت یہ معلومات ترتیب دی ہیں۔ سلاطین دہلی کے عہد میں اور عہد مغلیہ میں کتب خانوں کی نوعیت اور ان کے انتظام اور پھر علیحدہ علیحدہ ہر دور کے اہم اور قابل ذکر کتب خانوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ اسی اعتبار سے مختلف صوبوں اور تمام اہم شہروں کے کتب خانوں کے بارے میں بھی مفید معلومات یکجا کی ہیں۔ یہ ایک بہت پر خلوص کاوش ہے کہ مصنف نے نہ کسی اہم شہر کو نظرانداز کیا ہے اور نہ کسی اہم کتب خانے کو۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں تاریخی واقعات، احوال اور کوائف کا بیان ضروری تھا، جو کتب خانوں کی تعمیر، ترقی یا ان کی بربادی کے تعلق سے ناگزیر تھا، تو انھیں بھی جائزے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ سرکاری، درسی اور عام اجتماعی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ مصنف نے خصوصیت سے ایسے کتب خانوں کا بھی ذکر کیا ہے جو کسی ادارے کے تحت قائم تھے یا محض نجی اور ذاتی ملکیت کے کتب خانے تھے اور کسی اعتبار سے اہمیت بھی رکھتے تھے۔

جہاں نجی کتب خانوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں ان کتب خانوں کے مالکوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں بعض شہروں کے کتب خانوں کا احوال مرتب کیا گیا ہے وہیں اس شہر کی علمی و تاریخی اہمیت اور وہاں کی مقتدر علمی ہستیوں کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ پھر اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کسی کتب خانے میں کوئی بہت نادر و نایاب کتاب موجود ہے تو اس کا مختصر اور ضروری تعارف بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ سب اس کتاب کی اضافی خصوصیات ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو تلاش و تحقیق اور ان معلومات کی فراہمی میں کس قدر جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لینا پڑا ہے۔ اس کتاب کے متعدد صفحات اس بات کے مظہر ہیں کہ ان کی ایک ایک سطر لکھنے کے لیے مصنف نے سینکڑوں صفحات کے مطالعہ کی زحمت اور اذیت برداشت کی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ موضوع جس قدر وسیع اور ایک طویل دور پر محیط ہے اس کے لیے ایسی ہی محنت اور جانفشانی کی ضرورت تھی، جو ہر ایک مصنف اور محقق کے بس کی بات نہیں۔ مصنف کا علمی دنیا پر یہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس قدر مفید اور قیمتی معلوماتی خزینہ ترتیب دیا ہے جو اپنے موضوع پر ایک بنیادی اور کلیدی ماخذ ہے اور جس طرح کتب خانے علمی و تہذیبی سرمایہ کے ساتھ ہمارے رابطہ کو استوار کرتے ہیں، اس اعتبار سے یہ تصنیف اس رابطے کو مزید استحکام عطا کرتی رہے گی۔ اپنی اس مفید علمی کاوش پر مصنف بجا طور پر مبارکباد و تحسین کے مستحق ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اپنا کام ختم نہیں کیا ہے، اب انھیں تحسین و آفرین کے وہ پھول بھی اپنے دامن میں سمیٹنے ہیں، جو موجودہ نسلیں نہ سہی آئندہ نسلیں انھیں عقیدت و احترام کے ساتھ پیش کرتی رہیں گی۔

"غالب اور عصر غالب" کا مصنف

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری اردو دنیا میں ایک ممتاز محقق مولف اور مترجم کی حیثیت سے خاص شہرت کے حامل ہیں۔ بر عظیم پاک و ہند کی اسلامی تاریخ اور اسماء الرجال ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات ہیں۔ اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کے سبب نہ صرف وہ ایک خاص اہمیت اور مقام رکھتے ہیں' بلکہ انھیں علمائے ہند اور ہندوستان کی مذہبی و اسلامی تحریکات پر استناد کا درجہ بھی حاصل ہے۔ ان کا کمال محض یہی نہیں کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی نہایت وقیع اور ادق موضوعات علم و تحقیق کی تلاش و جستجو میں گزار دی اور ہماری تہذیبی و علمی تاریخی کی بعض اہم کتابوں کو ترتیب و حواشی اور ترجمہ کے ذریعہ اردو دنیا سے متعارف کرایا بلکہ انھوں نے علم و تحقیق کے ایسے موضوعات منتخب کیے اور ایسی شخصیات اور تحریکات پر داد تحقیق دی جو علمی دنیا کے لیے بالعموم اجنبی اور اس کی رسائی سے دور رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی ساری زندگی اور ساری دلچسپیاں علم و تحقیق کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ طرز زندگی نہایت سادہ اور درویشانہ ہے۔ فقر و قناعت اور بے نیازی اور خلوص و محبت اور شفقت و پاسداری ان کی شخصیت کے نمایاں

اوصاف ہیں۔ان کی محنت اور لگن اور جانفشانی اور دقت نظری ان کی زندگی کے ہر انداز اور ان کی لکھی ہوئی ہر ہر سطر سے ظاہر ہوتی ہے۔

وہ اپنی علمی اور تدریسی زندگی کے ذریعہ مفید اور لائق تحسین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان دنوں اردو کالج کراچی میں شعبہ اردو کے صدر اور اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اردو کالج میں ایم اے (اردو) تک تدریس ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت کے ان اوصاف کی تشکیل میں جہاں ان کی فطری لگن اور محنت و جانفشانی کا دخل ہے وہیں وہ اپنے خاندان کے ایک شاندار علمی ورثہ کے بھی حامل ہیں جس کے زیر سایہ ان کے علمی و ادبی مزاج کی تربیت و تعمیر ہوئی ہے۔

ان کے ایک جد اعلی حکیم احمد اللہ اپنے عہد کے نامور عالم اور خطیب تھے۔ ان کا خاندان بدایوں میں توطن پزیر تھا' مگر روہیلوں کے عہد میں قصبہ آنولہ (ضلع بریلی) میں آ کر آباد ہوا۔ نواب علی محمد خان والئی روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نور غازی کی زیارت (واقع منونہ) سے متعلق ایک بڑی اراضی وقف کی تھی' اس کے متولی حکیم احمد اللہ تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم حبیب اللہ علم و فضل میں ممتاز ہوئے۔ حکیم حبیب اللہ کے فرزند حکیم عظیم اللہ قادری بھی علم و فضل میں ممتاز تھے۔ انھیں علم الفرائض اور تجوید میں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔ "معارف المیراث "۔ "کاشف الحقیقت" "تفسیر سورہ العصر" ان سے یادگار ہیں۔ انھوں نے بعض کتابوں پر حواشی بھی تحریر کیے۔ درس و تدریس اور مطب ان کے مشاغل زندگی تھے۔ غالبا" اطبائے رام پور یا نواب رامپور نے انھیں "اشرف الحکماء" کا خطاب دیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۲۸۴ھ میں ہوا۔

ان کے چار صاحبزادے حکیم الٰہی بخش' حکیم سعید اللہ' میاں وحید اللہ

اور حافظ امام الدین تھے۔ ان میں سے مولوی حکیم سعید اللہ مرحوم سے پروفیسر قادری صاحب کا سلسلہ ملتا ہے۔ حکیم سعید اللہ (۱۸۲۶ء۔۱۹۰۷ء) سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ خاندانی پیشہ طب اور زمینداری سے تعلق رہا۔ کئی کتابیں لکھیں اور کئی کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خان کی فوج میں بھرتی ہو کر ککرالہ (ضلع بدایوں) اور کیپلہ (ضلع فرخ آباد) میں انگریزی فوج سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے ایک فرزند مولوی رحیم بخش (۱۸۵۷ء۔۱۹۲۰ء) یادگار چھوڑے۔ یہ پروفیسر قادری صاحب کے دادا تھے۔ انھوں نے علوم متداولہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فن خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ کئی رسالے اور کتابیں لکھیں۔ عربی ادب پر گہری نظر تھی اور ابن عربی کا خاص مطالعہ تھا۔

انھوں نے ایک فرزند مولوی مشیت اللہ قادری(۱۸۸۹ء۔۱۹۵۹ء) یادگار چھوڑے۔ یہ پروفیسر صاحب کے والد ماجد تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم خلیفہ ضیاء سے حاصل کی۔ فارسی کی کتابیں اپنے والد اور مولوی اسد علی خان سے پڑھیں اور فارسی میں بہت اچھی قابلیت حاصل کر لی۔ عربی اپنے دادا حکیم سعید اللہ قادری سے تحصیل کی اور کتب متوسطات تک ان سے پڑھیں پھر مولانا سراج الدین شاہجہانپوری سے کچھ کتابیں اور مفتی حافظ بخش بدایونی سے تکمیل کی۔ منشی چوکھے لال سے ہندی پڑھی۔ بعض دیگر فنون بھی سیکھے۔ فن شہسواری سے بھی دلچسپی تھی۔ تاریخ و ادب میں کمال رکھتے تھے۔ تاریخ روہیلکھنڈ اور انساب و رجال پر گہری نظر تھی۔ تبلیغ دین اور مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی۔ مختلف مقامات پر خصوصاً بمبئی میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۲ء کے دوران قیام میں مناظرے کیے۔ تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور کئی غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ تحریک پاکستان کے زبردست مؤید تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر

کے پاکستان آئے۔ دادو (سندھ) میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ تاریخ انساب اور رد آریا اور رد شیعہ میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں۔ پروفیسر قادری کے علاوہ عبدالقیوم ' عنایت اللہ اور نعمت اللہ ان کے فرزند ہیں۔ اول اذکر نے ۱۹۴۳ء میں بدایوں میں آخر الذکر نے ۱۹۸۱ء میں کراچی میں رحلت پائی۔

پروفیسر قادری صاحب آنولہ میں بروز چہار شنبہ بتاریخ ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ شہر کے ایک مقتدر عالم اور بزرگ مولوی عبد الغفور نے ان کے کان میں اذان دی اور "چراغ علم" سے تاریخ پیدائش نکالی۔ حافظ عبدالاحد اور حافظ عبدالغنی سے قرآن کریم پڑھا۔ پھر مدرسہ تعلیم المومنین میں تعلیم پائی اور ۱۹۳۹ء میں پرائمری اور ۱۹۴۲ء میں مڈل درجہ اول میں کامیاب کیے ریاضی محص امتیاز حاصل کیا۔ یہیں سے ۱۹۴۳ء میں ہندی مڈل کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ ۱۹۴۷ء میں یو پی بورڈ سے میٹرک کا امتحان بھی درجہ اول میں کامیاب کیا اور اردو اور ریاضی میں پھر امتیاز حاصل کیے۔ اس اثناء میں اپنے والد اور مولوی اسد علی خان سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ میزان و منشعب مولوی حکیم عبدالغفور سے پڑھیں۔ بدایوں ان کا ننھیالی وطن ہے۔ ان کے نانا حاجی وہاب الدین بدایونی نہایت دیندار اور صاحب حیثیت بزرگ تھے۔ تعلیم کے سلسلہ میں پروفیسر قادری صاحب چار سال تک بدایوں میں مقیم رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے وہاں سے اسلامیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کی ور ۱۹۵۰ء میں اس کا امتحان کامیاب کیا۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے لئے ہجرت کی اور والد کے ساتھ کچھ عرصہ دادو میں قیام رہا' بعد میں کراچی آکر ۱۲ ستمبر ۱۹۵۰ء کو محکمہ رسد و ترقیات حکومت پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس عرصہ میں تعلیم کا سلسلہ بھی

جاری رکھا۔ اردو کالج کراچی سے ۱۹۵۶ء میں بی اے کامیاب کیا اور پھر ۱۹۶۲ء میں جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔

ان کی سرکاری ملازمت کا سلسلہ مئی ۱۹۵۷ء تک جاری رہا۔ اسے ترک کر کے وہ مئی ۱۹۵۷ء سے مارچ ۱۹۶۲ء تک "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" میں معاون محقق اور ریسرچ افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن ساتھ ہی ستمبر ۱۹۶۲ء سے مارچ ۱۹۶۳ء تک اردو کالج کراچی میں جزوقتی استاد شعبۂ اردو کی حیثیت سے منسلک رہے مگر پھر ۵ مارچ ۱۹۶۳ء سے مستقل لکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق برقرار ہے اور وہ اب ایک سینئر استاد کی حیثیت میں ایک معزز اور محترم درجہ پر فائز ہیں۔

اس عرصہ میں انھوں نے اپنی علمی و تدریسی حیثیت کے سبب ۱۹۷۵ء میں اردو کالج کی جانب سے "ہلال اردو تمغہ" کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں "اکیڈمک ایوارڈ میڈل" اور اعلی ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے اسی سال قائداعظم کی صد سالہ تقریبات کے تعلق سے "تمغہ قائداعظم" حاصل کیے۔ پھر اس عرصہ میں انھوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مذہبی' تاریخی اور ادبی کانفرنسوں میں بھی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اور ساتھ ہی برعظیم پاک و ہند کے کئی اہم کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا۔

پروفیسر قادری صاحب ابتدائی تعلیمی زندگی ہی سے علم و ادب سے خصوصی لگاؤ کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی عمر ہی سے انھیں کتابوں کے مطالعہ اور انھیں جمع کرنے کا شوق رہا ہے' چنانچہ اس وقت ان کا ذاتی ذخیرہ کتب کئی ہزار اہم اور نادر و کمیاب اور سینکڑوں قلمی نسخوں پر مشتمل ہے جن میں تاریخ و رجال پر نہایت وقیع اور مفید کتابوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ ابتدائی تعلیمی زندگی ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق پروان چڑھا اور

مختلف رسالوں کے لیے مضامین لکھنے کی مشق جاری رہی۔ ان کا اولین علمی و تحقیقی کارنامہ مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات پر مشتمل ایک کتابچہ تھا جو مئی ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ ان کی یہ کاوش علمی دنیا میں انھیں متعارف کرانے کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوئی۔ پھر انھوں نے بہت جلد یکے بعد دیگرے کئی اہم کاوشیں علمی دنیا کے سامنے پیش کیں، جن میں وقائع عبدالقادر خانی کو "علم و عمل" کے نام سے دو جلدوں میں اپنے قیمتی حواشی کے ساتھ مرتب کرنا اور مولوی رحمان علی کے معروف اور اہم تذکرہ "علمائے ہند" کو اپنے طویل مقدمہ اور مفید حواشی اور تعلیقات کے ساتھ اردو میں ترجمہ کرنا اور مرتب کرنا شامل ہے، علمی دنیا کو چونکانے اور ان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اپنی محنت، دقیقہ رسی، خلوص اور لگن سے پروفیسر قادری صاحب نے ان کتابوں کو پہلے سے کہیں زیادہ مفید اور وقیع بنا دیا۔ ان کتابوں کے منظرعام پر آنے کے وقت وہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے منسلک تھے۔

اردو کالج سے بحیثیت استاد وابستہ ہونے کے بعد ان کی علمی و تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ کار مزید وسیع ہو گیا۔ اس زمانہ کی کاوشوں میں "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" "مولانا محمد احسن نانوتوی" "ارباب فضل و کمال" (بریلی) کی سوانح عمریاں اور ان کے علمی کارناموں کا مفصل تذکرہ اور پھر "تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ" اور "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات و شخصیات" پر ان کی جامع اور وقیع تصانیف ان کے یادگار علمی کارنامے ہیں۔ ان کے علاوہ تراجم میں "مجموعہ وصایا اربعہ" (شاہ ولی اللہ وغیرہ) "ماثر الامرا" (شاہنواز خان کی تصنیف کردہ تین جلدیں) "فرحت الناظرین" (محمد اسلم انصاری پسروری) اور "سیرالعارفین" ،اور تربیت و حواشی میں "تواریخ عجیب" (کالا پانی) "عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ" "مقالات یوم عالمگیر" "

تذکرہ نوری" (حالات شاہ ابوالحسین نوری مارہروی) اور "جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رامپور" (معظم عباسی) وغیرہ ان کی ایسی کاوشیں ہیں جو علمی دنیا کے لئے مستقل استفادہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کاوشوں کے ساتھ ساتھ شریک مؤلف کی حیثیت سے "خط و خطاطی" "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" اور "نقوش سیرت" مستقل اہمیت کی حامل بن گئی ہیں۔

ان مستقل اور مفصل علمی و تحقیقی کاوشوں کے علاوہ پروفیسر قادری صاحب نے برعظیم پاک و ہند کے بلند پایہ اور مقتدر علمی و تحقیقی مجلوں اور رسالوں میں مستقل اہمیت کے حامل مقالات اور مضامین لکھے اور تقریباً پچیس کتابوں پر مقدمات اور دیباچے تحریر کیے۔ علمی و ادبی صحافت میں بھی ان کا دخل ہے۔ سہ ماہی "بصائر" (کراچی) کے اعزازی نائب مدیر اور ماہنامہ "سرحد" (کراچی) کے اعزازی نگراں رہے۔ اردو کالج کے مجلہ "برگ گل" کے ایک عرصہ تک نگراں رہے۔ ان کی نگرانی کے زمانہ میں انھیں کے اہتمام سے اور ان کی ادارت میں اس مجلہ کے "سرسید نمبر" (نقش ثانی) "تعلیمی پالیسی نمبر" اور "قائد اعظم نمبر" شائع ہوئے۔ اس طرح "العلم" (کراچی) کا "غالب نمبر" انھوں نے مرتب کیا۔

یہ وہ کاوشیں ہیں جو بظاہر ماضی کا حصہ ہیں لیکن دراصل انھیں مستقبل کے لیے ماضی کا ایک نہایت وقیع اور قابل فخر ورثہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر قادری صاحب کا حال ان کے ماضی سے یقیناً زیادہ وقیع اور اہم ہے اور اسی اعتبار سے یہ مستقبل کی دنیا پر زیادہ اثر انداز ہو گا۔ ابھی حال میں انھوں نے مغلیہ عہد کے اہم مورخ خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی ضخیم اور مبسوط تاریخ "طبقات اکبری" کا ترجمہ مکمل کیا ہے جو مرکزی اردو بورڈ لاہور شائع کر رہا ہے۔ ان دنوں وہ غزنوی عہد کے ایک عربی نژاد قبیلہ "بحلیم" پر ایک

تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے جامعہ کراچی میں ایک مبسوط تحقیقی مقالہ "اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ" پیش کیا تھا جس پر جامعہ کراچی نے انھیں ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔ یہ مقالہ اشاعت کے لئے تیار ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر قادری صاحب کی تخصیص اور اس پر ایک طویل مدت کی جانفشانی اس مقالہ کی اہمیت اور اس کے درجہ کا تعین کرنے کے لیے کافی ہے۔

زیر نظر کتاب پروفیسر قادری صاحب کے ان تحقیقی مقالوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے غالب کے تعلق سے مختلف اوقات میں تحریر کیے ہیں۔ ان میں سے بعض مقالے ایسے ہیں جنھیں بلاشبہ غالبیات کے موضوع پر مفید اور معلوماتی اضافہ کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ ان مقالوں میں نہ صرف غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بلکہ ہمارے کلاسیکی ادب اور تاریخ و تہذیب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی متعدد نئی معلومات اور تاریخ و تحقیق کے نئے گوشے اجاگر اور نمایاں نظر آئیں گے۔ ایسے بہت سے پہلو جو اب تک غالبیات۔۔ بلکہ تاریخ و تہذیب کے جائزہ میں سمٹ نہیں سکے تھے وہ ان مقالوں کے ذریعہ سے اب وقف عام ہو رہے ہیں۔ یقین ہے کہ جہاں اس کتاب کی اشاعت سے پروفیسر قادری صاحب کی غالبیات سے دلچسپی کا اندازہ ہو سکے گا وہیں یہ کتاب غالبیات کے ذخیرہ میں ایک مفید معلوماتی اور وقیع اضافہ بھی سمجھی جائے گی۔

اردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ

اردو ادب کی تاریخ نویسی کا اسلوب اور انحصار ہمارے ہاں اب تک بڑی حد تک ایک مخصوص ڈھب پر رہا ہے۔ اور زبان اور ادب کے ارتقا کی کیفیت اور نوعیت، ان کے اسلوب نثر اور شاعری اور اصناف کا مطالعہ بالعموم الگ الگ یا متوازی سمتوں میں کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یوں لگتا ہے گویا شاعری اور نثر اور ان کی مختلف اصناف کا ارتقا ایک ہی زمان و مکان اور ماحول میں نہیں، بلکہ علیحدہ علیحدہ ماحول میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً" شاعری کے ارتقا میں جب ہم انشا کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ مشکل ہی سے ذہن میں رہتا ہے کہ یہ "رانی کیتکی کی کہانی" کا خالق بھی ہے، یا نثر کے ارتقا میں "خطوط غالب" کا جائزہ لیتے ہوئے غالب بہ طور شاعر مشکل ہی سے سامنے رہتا ہے۔ اور تو اور، یہ بھی ذہن میں نہیں رہتا کہ میر اور میر امن ایک ہی عہد کی شخصیات ہیں یا لکھنؤ میں جس وقت آصف الدولہ کا دربار شاعروں اور فن کاروں سے بارونق تھا --- دکن میں ارسطو جاہ کی سرپرستی ایسے ہی بڑے شاعروں کو اپنے گرد اکٹھا کیے ہوئے تھی! اصناف کا علیحدہ علیحدہ جائزہ بھی ہمارے ذہن کو متوازی سمتوں میں ہی میں لیے چلتا ہے اور ہم کسی ایک عہد کی بھی کوئی ایک مکمل تصویر، اس

کی کل تخلیقات کی روشنی میں نہیں بنا سکتے اور اس عہد کے سارے رجحانات کو ایک ساتھ لے کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

یہی صورت اردو زبان اور بالخصوص نثر میں علمی' مذہبی اور تاریخی تصانیف اور ان کے مصنفین کے ساتھ بھی روا رکھی گئی ہے۔ اٹھارھویں صدی تک تو جو بھی نثری نمونہ دستیاب ہوا ہے--- اسے بہ طور تبرک تاریخ ادب کے جائزے میں شامل کر لیا گیا ہے' لیکن بعد میں ایسی تصانیف اور ان کے مصنفین سے صرف نظر کر لیا گیا--- یا زیادہ سے زیادہ کسی شہرت و حیثیت کی بنیاد پر چند معروف علماء کی تصانیف اس ذیل میں شمار کر لی گئیں۔ مثلاً" شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین' شاہ اسماعیل شہید اور مولانا خرم علی بلہوری کے نام تو مختلف اسباب کی بنا پر تاریخ ادب میں نظر آتے ہیں' لیکن ہر عہد میں اس قسم کے علمی' مذہبی اور تاریخی ادب کی تلاش و تحقیق اور ان کے اسلوب و صیات کا مطالعہ ہمارے ادبی مورخوں اور محققوں کی خاطر خواہ توجہ حاصل نہ کر سکا۔ بعض ضخیم ادبی تاریخوں میں چند سرسری اشارے تو ملتے ہیں۔ لیکن کوئی مخصوص اور مبسوط کوشش اس ضمن میں نہیں کی گئی۔ اگرچہ حال میں اردو نثر کے ارتقا' اصناف' اسالیب اور دبستانوں کے تعلق سے کئی مستقل تحقیقی مطالعے سامنے آئے ہیں مگر ان میں بھی بالعموم مذکورہ ڈگر ہی پر چلنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ اس خلا کو کم از کم شمالی ہند کی حد تک اور آغاز سے ۱۸۵۷ء تک' ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی زیر نظر تصنیف سے پر کیا ہے۔

اپنے موضوع پر یہ اولین تصنیف ہے' جو اردو نثر کے ارتقا میں علماء کی کاوشوں اور ان کی تصانیف کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم تصنیف کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب علماء کی ان کی وابستگیوں کے حوالے سے ترتیب دیا گیا ہے' جس سے ان کا مجموعی رویہ اور

رجحان بھی سامنے آتا ہے اور اس کے پس منظر میں ان کی تصانیف کی غرض و غایت، نوعیت اور کیفیت بھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر فاضل مصنف نے ہر تصنیف کے موضوع اور مندرجات کے علاوہ اس کے اسلوب، زبان و بیان اور صرفی و نحوی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے اور نمونتہً ہر ایک کے ضروری اقتباسات بھی درج کیے ہیں۔ اس طرح زبان و ادب کے ارتقا میں شمالی ہند (بشمول بہار و بنگال) میں ۱۸۵۷ء تک اردو زبان اور اسالیب کی سمت و رفتار اور نوعیت و کیفیت کے تعین میں علماء کی ان تصانیف کو بھی اب تاریخ زبان و ادب کے مباحث میں ناگزیر حیثیت حاصل رہے گی اور یوں اس سے متعدد خلا پر ہو سکیں گے۔ مجموعی طور پر اکیاسی علما کی ایک سو باون تصانیف اور ان کے مصنفین اس مقالے کا موضوع ہیں، جبکہ ان تصانیف میں سے تیئیس غیر مطبوعہ ہیں اور اس لحاظ سے یہ فاضل مصنف کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ ان غیر مطبوعہ تصانیف میں سے بیشتر تاریخ زبان و ادب میں دریافت و انکشاف کے ذیل میں آتی ہیں اور تاریخ ادب کا دامن جہاں اب ان تصانیف کے ذکر و حوالے سے باثروت ہو رہا ہے --- وہیں ان کے مصنفین کی ایک بڑی تعداد بھی تاریخ ادب میں جگہ پا رہی ہے، جن کے احوال و آثار ادب کے عام ماخذ میں بالعموم ناپید رہے ہیں --- لیکن ان کے لیے اب اس تصنیف کو ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل رہے گی۔

یہ تصنیف، جو فاضل مصنف کے انتقال (نومبر ۱۹۸۳ء) کے بعد منظر عام پر آئی ہے، دراصل ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر جامعہ کراچی نے ۱۹۷۸ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔ اس صورت حال میں کہ جامعات میں اب بہت کم ہی تحقیقی مقالات اعلیٰ معیار کے حامل نظر آتے ہیں، اس مثالی اور منفرد مقالے کی اشاعت سے فی الحقیقت جامعہ کراچی کی نیک نامی

میں اضافہ ہو گا۔ اسے جامعہ میں پیش کردہ مسودے کے مطابق ہی شائع کر دیا گیا ہے۔۔۔ جبکہ فاضل مصنف اگر زندہ رہتے تو ضرور اس پر نظرثانی کرتے اور بہ غرض اشاعت اس کی نوک پلک بھی درست کرتے۔ مصنف کا ایک مختصر پیش لفظ اس میں شامل ہے' جو اب اشاعت کے بعد تشنہ محسوس ہوتا ہے۔ ابتدائی چاروں ابواب مختلف تحریکی اور شخصی نسبتوں اور وابستگیوں کے حامل علماء کے حوالے سے تقسیم کیے گئے ہیں' جیسے باب اول: صاحبزادگان شاہ ولی اللہ اور ان کے ہم عصر علماء باب دوم اور سوم: سید احمد شہید کی تحریک کے علماء باب چہارم: شاہ محمد اسحاق دہلوی کے رفقاء و تلامذہ۔ ان ابواب میں شامل بعض علماء کا تعلق ان کے وابستگان سے واضح نہیں ہوتا۔ نہ ابواب کے آغاز میں ان علما کے باہمی ربط پر روشنی ڈالی گئی ہے' نہ درمیان میں روابط کی نوعیت سامنے آتی ہے۔ ایک عام قاری کو کتاب پڑھتے ہوئے شاید یہ نہ معلوم ہو سکے کہ باب چہارم کے عنوان میں مذکورہ شاہ محمد اسحاق دہلوی کون تھے؟۔

اس کتاب کو ادارہ ثقافت اسلامیہ نے نہایت اہتمام اور خوب صورتی کے ساتھ شائع کیا ہے۔۔۔ لیکن یہ محل نظر ہے کہ اس میں جہاں مصلحت بینی کے کمزور تقاضے کے تحت بعض فقہی مسلک کے حامل افراد کی دل شکنی کے خیال خام سے اس تصنیف میں شامل چند اقتباسات حذف کر دیئے گئے ہیں' وہیں بعض نہایت ضروری علمی تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ مثلاً" اس میں اشاریے کا اہتمام نہیں کیا گیا جو اس قسم کی علمی کتابوں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ آج کی بڑھتی ہوئی علمی ضرورتوں کے پیش نظر اور وقت ضرورت قارئین و محققین کو ان کے وقت کے ضیاع سے بچانے کے لیے ہر ناشر کے لیے یہ لازمی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ہر کتاب میں اشاریہ ضرور شامل کرے۔ تجارتی اداروں کو تو شاید اس کا پابند نہ کیا جا سکے' گو ان پر اس کی اخلاقی ذمے داری عائد ہوتی

ہے---- لیکن سرکاری اداروں کو تو ضرور پابند کیا جانا چاہیے۔ بعض ادارے، مثلاً ''مجلس ترقی ادب'' (لاہور) اور ''مرکزی اردو بورڈ'' (لاہور) اس کا اہتمام کرتے رہے ہیں، لیکن ادارہ ثقافت اسلامیہ، اپنی اہم مطبوعات ''فقہائے ہند'' اور ''سلسلہ کوثر'' کی حد تک بھی اس کا التزام نہ کر سکا! کم از کم اس کتاب میں فہرست مضامین کو فہرست مندرجات کی شکل دے کر ہر مصنف کے نام کے ساتھ اس کی تصنیف یا تصانیف اور متعلقہ ذیلی عنوانات کا اندراج کیا جا سکتا تھا تاکہ اگر قاری کو کسی کتاب کی تلاش ہو تو اسے پوری کتاب پر نظر ڈالنی نہ پڑے۔

ان پہلوؤں سے قطع نظر، کہ جو اس تصنیف کی علمی و تحقیقی قدر و قیمت میں کسی طرح کمی کا سبب نہ ہوں گے، یہ ایک اعلیٰ درجے کا تحقیقی کارنامہ ہے، جو اگر ایک طرف اردو زبان و ادب کی تاریخ کے ایک بڑے خلا کو پر کرتا ہے تو دوسری طرف اردو زبان کی ترقی میں علماء کی شعوری یا غیر شعوری خدمات کو برعظیم کی علمی و تہذیبی تاریخ کی ایک حقیقت کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ اس تصنیف کو حالیہ چند برسوں کے ایک مثالی تحقیقی کارنامے سے تعبیر کرنا چاہیے۔

اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر

ہر دور کا ادب جہاں عصری تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے اور جس میں کسی معاشرے اور قوم کے درد و آرزو، جہد و جستجو کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، وہاں معاشرے پر اثر انداز بھی رہتا ہے۔ اگر ادب کا مطالعہ وسیع تر تہذیبی پس منظر میں کیا جائے تو ادب کے ذریعہ تاریخ، عہد ماضی کے مزاج، کردار اور ہیجانات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اردو ادب میں اس نوعیت کے مطالعہ کا تعلق ہے، حال میں بعض مفید کوششیں ہوئی ہیں۔ ان کوششوں میں ادب کو بالخصوص اس کے تہذیبی، سیاسی، تاریخی، فکری پس منظر میں دیکھنے کا اہتمام ہوا ہے۔ مثلاً" خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر محمد عمر نے اپنے تحقیقی مقالوں میں میر کے سیاسی اور سماجی ماحول کو پیش کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتابیں جرات اور نظیر کے ماحول کا احاطہ کرتی ہیں۔ میر حسن پر ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب بھی اس ضمن میں آتی ہے۔ لیکن یہ تحقیقات بالعموم کسی ایک فرد کو اس کے ماحول میں سمجھنے کی کوششیں تھیں۔ خود ادب، اس کے مزاج، رجحانات، موضوعات اور عوامل و محرکات کا مبسوط تجزیاتی مطالعہ اس کے تاریخی، سیاسی فکری اور تہذیبی پس منظر میں اب تک عام نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کا تحقیقی

مقالہ ''اردو شاعری کا تاریخی و فکری پس منظر'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مقالہ ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' اپنے موضوعات پر مبنی مبسوط تجزیاتی مطالعہ کی مثالیں ہیں۔ لیکن اس مختصر سی فہرست میں اب ایک اہم اضافہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی کتاب ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر'' ہے۔

ڈاکٹر کشفی ''باغ و بہار'' کی تقدیم و ترتیب اور ''جدید ادب کے دو تنقیدی نظریے'' پیش کر کے اپنی تحقیقی گہرائی اور تخلیقی تنقید کا ثبوت فراہم کر چکے ہیں۔ ہمارے عہد کا ادب اور ادیب میں شامل ان کے مضامین سے آج کے اردو ادب میں شخصیات کے تعلق سے اظہار ذات کا ایک نیا معیار اور ذاتی تاثرات کا ایک حسین نقش وضع ہوا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کا تحقیقی مقالہ ہے' جس پر کراچی یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر کشفی کی' اپنے موضوع کو--- بقول رشید احمد صدیقی---- زمان و مکان میں سمیٹنے کی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی ہر تحریر گہرے غور و فکر اور وسیع مطالعہ کے نتیجہ میں ظہور میں آتی ہے۔ زیر نظر کتاب اپنے موضوع کو حیطہ تحریر میں لانے کے لیے مؤرخانہ جستجو' معروضی تجزیے اور عالمانہ طریق کار کی ایک مثال ہے۔

موضوع کے لحاظ سے بنیادی طور پر یہ مطالعہ برعظیم میں مسلم ملت کے دور زوال میں اردو شاعری کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ تجزیہ کا معروض اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ہے۔ تاریخی و سیاسی واقعات کی تفصیل سے قطع نظر جو متعدد عام کتابوں میں مل جاتی ہے' مصنف کی نظر واقعات کے اسباب و علل اور تجزیہ پر مرکوز رہی ہے۔ پہلے اور تیسرے باب میں شامل مندرجات اس کی منفرد مثالیں ہیں۔ یہ بات بلاشبہ' اس بسیط مطالعہ کی

حد تک، پہلی کوشش نظر آتی ہے کہ مصنف نے اپنا تحقیقی منصب ادا کرتے ہوئے اپنے موضوع بحث سے متعلق دور کے مطالعہ وہ تجزیہ میں اس عہد کے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کو بنیادی اور تاریخی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے اور سیاسی و تاریخی پس منظر تحریر کرتے ہوئے واقعات کی ہم عصر تاریخی شہادتوں کو بڑی دقت نظر اور تلاش و جستجو کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پھر مزید یہ کہ دور حاضر کے مورخوں اور ان کی جدید تحقیقات بھی استفادہ میں آئی ہیں۔ اسی سلسلے میں ضمنی طور پر مصنف نے آخری باب میں اردو شاعری پر سیاسی ہیجانات، ادبار اور تحریکات کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

اردو شاعری میں سیاسی و تاریخی واقعات کی نشاندہی کے لحاظ سے دوسرا باب خاصا تفصیلی ہے۔ یہ اپنے دور کے اعتبار سے دکنی شاعری میں قومیت کے عناصر کے تعین سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے احوال و کوائف کے بیان تک محیط ہے۔ مجموعی طور پر دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس میں واقعات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں، بلکہ ان دبستانوں کی شاعری کی مثالوں کے ذریعہ ان کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ مثالوں کے تعین سے مصنف کے اظہار ذات کا بھی ایک نیا معیار وضع ہوا ہے۔ بعض اہم شعرا کے نام، جن کے کلام کو ماحول کے تجزیہ میں ثبوت و مثال کے طور پر شامل کیا گیا ہے، اردو شاعری کی تاریخ کے لیے یا تو نئے نام ہیں یا پھر ان شاعروں کے ساتھ کم از کم یہ بدقسمتی رہی ہے کہ ان کے کلام میں موجود ماحول اور عہد کے سیاسی و تہذیبی اشارات و علائم اب تک عمومیت کے طور پر دیکھے گئے ہیں۔ زیر نظر تحقیقی و تنقیدی تجزیئے میں ایسے شعراء کے کلام کی علامتوں اور اشاروں کی عمومیت پر انحصار نہیں کیا گیا ہے بلکہ تحقیقی گہرائی اور پورے خلوص و دیانت کے ساتھ ان شاعروں کے درد و آرزو کا تعین ان کے کلام کی

روشنی میں کیا گیا ہے اس قسم کی مثالیں مطبوعہ کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام سے بھی اخذ کی گئی ہیں۔

اردو شاعری کے ڈیڑھ سو سال کے تاریخی و سیاسی پس منظر کو جس عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے کتاب کے مطالعہ کے دوران موضوعات و مباحث اور ان کے تجزیہ و تحلیل کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ مقالہ کا عنوان ان پر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کشفی نے مختصر سے مختصر الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہہ دی ہے اس مقالے کے موضوعات میں بالخصوص اردو شاعری میں سیاسی اور تاریخی واقعات کی نشاندہی' اردو شاعری اور تحریک سید احمد شہید' انتزاع سلطنت اودھ اور اردو شاعری' ۱۸۵۷ء اور اردو شاعری' اپنے ماخذ اور تجزیہ و تحلیل کے اعتبار سے ایسی کوششیں ہیں' جنھیں آئندہ ادب و شعر کی تاریخ کو ترتیب دیتے ہوئے کوئی مورخ آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکے گا اور اس کتاب میں جو مباحث زیر بحث آئے ہیں' ان پر اس موضوع کے تحت ایک طویل عرصہ تک نظرثانی و اضافہ کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

حیات اقبال کے چند مخفی گوشے

یہ واقعہ ہے---- اور زیر نظر کتاب کے فاضل مرتب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں جس کثرت سے لکھا گیا ہے اس کے پیش یہ قیاس کرلینا بعید نہیں کہ ان کی زندگی کے تمام گوشے ہمارے سامنے ہیں اور کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا! جبکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ اقبال پر قلم اٹھانے والوں نے بالعموم چراغ سے چراغ جلایا ہے اور نئے' بنیادی اور عصری ماخذ و مصادر کی تلاش و فراہمی' ترتیب و تدوین اور ان سے راست استفادے کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ کیونکہ بنیادی ماخذ تک رسائی دقت نظراور جانفشانی کا تقاضا کرتی ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اقبالیات کے ذخیرے میں نہ بنیادی ماخذ و مصادر کی تلاش و ترتیب کا کام اہتمام اور توجہ سے ہوا ہے اور نہ اقبال کی زندگی کا مطالعہ بالخصوص بنیادی اور عصری ماخذ کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

اقبالیات کے ذخیرے میں یوں تو خاصا اضافہ ہوا ہے اور اس کی مختلف گوشے اصحاب ذوق کی توجہ حاصل کرتے رہے ہیں' لیکن حیات اقبال اور اس کے متعلقات پر بنیادی مصادر کی تلاش و جستجو اور ترتیب و تدوین کی اہمیت کو

بہت کم افراد نے اہمیت دی ہے اور اسی اعتبار سے ایسے ناگزیر کام اقبالیات میں افسوس ناک حد تک کم ہوئے ہیں۔ خود اقبال کی اپنی متنوع تحریروں کی دریافت کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ اس صورت میں ہم عصر صحافت میں' جو اقبال کے تعلق سے "بے پناہ معلومات کا گنجینہ ہے' اقبال کی غیرمدون تحریروں کی تلاش اور اقبال کی زندگی' فکر اور شاعری کے موضوعات پر شائع ہونے والی متنوع تحریروں کی جستجو اور ان کی ترتیب اقبال پر کام کرنے والے افراد اور اداروں کی کماحقہ توجہ حاصل نہ کر سکی۔ اس نوع کے کاموں میں "گفتار اقبال" (مرتبہ محمد رفیق افضل) غالباً" واحد استثنائی مثال ہے' جو ہم عصر صحافت میں اقبال کی شائع ہونے والی تحریروں' تقریروں' بیانات اور ان سے متعلق شذرات پر مشتمل ہے۔ جبکہ اس کا مواد محض "زمیندار" اور "انقلاب" کے ان شماروں سے اخذ کیا گیا ہے' جو اس مجموعے کے مہتمم ادارے ناشر "ادارہ تحقیقات پاکستان" (لاہور) کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اگر اسی مجموعے کا دائرہ دو اخبارات کی مکمل فائلوں تک پھیلا دیا جاتا تو ظاہر ہے یہ مجموعہ اپنی ہمہ گیری اور افادیت میں مزید فائدہ مند ہوتا۔ اس کے باوجود بنیادی اور عصری ماخذ کی تلاش و ترتیب کی یہ ایک مفید اور استثنائی مثال تھی۔ اب اس مثال میں محمد حمزہ فاروقی کے زیر نظر' مجموعے کے ذریعے ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے--- اور کم از کم اس لحاظ سے مکمل بھی ہے کہ یہ "انقلاب" کے اس پورے دور کا احاطہ کرتا ہے جو اس کے اجراء اپریل ۱۹۲۷ء سے اقبال کی رحلت اپریل ۱۹۳۸ء پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد بھی "انقلاب" اکتوبر ۱۹۴۹ء تک جاری رہا' لیکن اقبال کے بارے میں شائع ہونے والی اس بعد کے دور کی تحریریں ضمنی ماخذ کے زمرے میں شمار ہوں گی۔ اس لیے یہ اتنی اہم نہیں جتنی حیات اقبال کے دور میں شائع ہونے والی تحریریں اہم ہیں۔

اس مجموعے کے مرتب نے حیات اقبال کے اس دور کا احاطہ کر کے اپنے کام کو ایک لحاظ سے مکمل کر دیا ہے اور ایک قابل تقلید مثال پیش کی ہے جس کی پیروی کر کے دیگر اہم معاصر اخبارات و جرائد سے اقبال کی اور اقبال کے تعلق سے شائع ہونے والی تحریروں کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "زمیندار"، "پیسہ اخبار" اور اسی نوع کے دیگر ممتاز اخبارات کو اس ضمن میں بنیادی مصادر کی حیثیت دے کر اس نوع کے کام کا دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح حیات و فکر اقبال کے یقیناً" متعدد نئے گوشے سامنے آ سکیں گے۔ اس لحاظ سے محمد حمزہ فاروقی کی اس کاوش کو اقبالیت کے بنیادی ماخذ کی تلاش و ترتیب کے سلسلے کی ایک قابل قدر اور وقیع کوشش قرار دینا چاہیے۔ اس سے فی الحقیقت اقبال کی زندگی، فکر اور شاعری کے متعدد نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور اس سے اگر یکسر مخفی نہ سہی--- دور افتادہ گوشے ضرور سامنے آئے ہیں۔ یہ ضخیم تالیف اقبال کے بارے میں خاصی اہم معلومات کا مجموعہ بن گئی ہے اور اسے ایک ناگزیر ماخذ کی حیثیت حاصل رہے گی۔ یہ مجموعہ جلد اول ہے، جو اقبال کی زندگی اور فکر و فن کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتا ہے، اس کی دوسری جلد اقبال کی سیاسی خدمات اور اس دور کے حالات پر مشتمل ہے (بہ حوالہ دیباچہ، ص: ل)

پیش نظر جلد کل سولہ ابواب کے تحت متنوع عنوانات پر مشتمل ہے، جن کی ترتیب یہ ہے: (۱) فکر و فن اقبال (۲) نقد و نظر (۳) علمی اور تہذیبی مجالس سے وابستگی (۴) اسفار اقبال (۵) معاصرین اور احباب (۶) مولانا حسین احمد سے روابط (۷) علمی اور سماجی سرگرمیاں (۸) کلام اقبال کی ترویج و اشاعت (۹) فکر اقبال سے خوشہ چینی (۱۰) تبلیغ اسلام (۱۱) زندگی کے مختلف پہلو (۱۲) اقبال سے متعلق "افکار و حوادث" کے کالم (۱۳) طالب علم تنظیموں کی

سرپرستی (۱۴) قدر دانئ عالم (۱۵) چراغ آخر شب (۱۶) "صدق و اخلاص و صفا باقی نماند"۔ فاضل مرتب نے ترتیب و تدوین کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر تحریر کا حوالہ یعنی شمارہ نمبر' جلد نمبر' دن' تاریخ' مہینہ اور سال درج کیے ہیں۔ پھر تعلیقات اور حواشی کا اہتمام کر کے اس مجموعے کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ویسے صفحات نمبر اور کالم نمبر کا بھی وہ اہتمام کرتے اور ترتیب کے فطری تقاضوں کے تحت اگر بعض ابواب اور ان کے ذیلی عنوانات کی ترتیب میں قدرے تبدیلی روا رکھتے تو اس مجموعے کے مندرجات کو حیات و شخصیت کے ارتقائی مراحل سے مطابقت دی جا سکتی تھی اور انھیں مزید سائنٹی فک بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً" ابواب کی ترتیب اگر قدرے مختلف حسب ذیل ہوتی تو شاید اسے زیادہ مناسب کہا جا سکتا: (۱) زندگی کے مختلف پہلو (۲) علمی اور سماجی سرگرمیاں (۳) علمی اور تہذیبی مجالس سے وابستگی (۴) اسفار اقبال (۵) معاصرین اور احباب (۶) طالب علم تنظیموں کی سرپرستی (۷) فکر و فن اقبال (۸) کلام اقبال کی ترویج و اشاعت (۹) نقد و نظر (۱۰) تبلیغ اسلام (۱۱) مولانا حسین احمد سے روابط (۱۲) فکر اقبال سے خوشہ چینی (۱۳) قدر دانئ عالم (۱۴) اقبال سے متعلق "افکار و حوادث" کے کالم--- پھر بعض ذیلی عنوانات بھی موجود ابواب کے بجائے دوسرے ابواب کے تحت شامل کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً" اقبال کی تاریخ ہائے وفات نویں باب کے تحت ہے۔ جبکہ اسے سولھویں باب کے تحت ہونا چاہیے تھا۔ صفحات ۳۲۲ سے ۳۲۸ پر جو تعزیتی نظمیں شامل کی گئی ہیں' انھیں بھی آخری باب کے ذیل میں ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۵۵۶ پر غلام رسول مہر کی تحریر کردہ "اقبال کی مختصر سوانح حیات" کو گیارھویں باب: "زندگی کے مختلف پہلو" کے تحت شامل کیا جا سکتا تھا اور صفحہ ۵۵۸ پر دیا جانے والا شذرہ "حضرت علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش" بھی اسی

باب کے تحت شامل کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح پانچویں باب کے تحت "سماجی تعلقات" کو ساتویں باب: "علمی اور سماجی سرگرمیاں" کے تحت ہونا چاہیے تھا۔ گیارھویں باب کے تحت عنوان "کتب و رسائل پر رائے" کو ایک علیحدہ باب یا پانچویں باب کے تحت شامل کرنا مناسب ہوتا۔

ان اشاروں کا مقصد اظہار نقص کے بجائے محض یہ ہے کہ جب اس مستقل اہمیت کے حامل مجموعے کی دوسری جلد شائع ہو تو اس میں مندرجات کی ترتیب کے وقت فطری اور ارتقائی مراحل کے تقاضے بھی پیش نظر رہیں---- تاکہ وہ مجموعہ کوتاہیوں سے یکسر دور رہے۔ کتاب کے آخر میں' اور بالخصوص ایسی کتابوں کے ساتھ اشاریے کا اہتمام اس سے استفادے میں سہولت پیدا کرتا ہے۔ اس کتاب میں اشاریے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ویسے ان باتوں سے قطع نظر' کہ جس سے اس مجموعے کی بنیادی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی' یہ کوشش لائق صد ستائش ہے' جس کی ترتیب و اشاعت کو اقبالیات کے ذخیرے میں مستقل اہمیت کا حامل ناگزیر اور مفید اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

اقبالیات

مولانا غلام رسول مہر ہمارے ان اکابر میں گزرے ہیں، جنھیں ان کی متعدد اور متنوع علمی و ادبی جہات کے ساتھ ساتھ کم از کم تین ادبی و علمی موضوعات پر استناد و معیار کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی سید احمد شہید کی تحریک جہاد، غالب کی شاعری اور مکتوب نویسی اور اقبال کی ہم نشینی اور ان کی شخصیت و شاعری سے نسبت خاص کے طفیل ان کی تعبیر و تشریح جیسے موضوعات پر کوئی معیاری مطالعہ ان کے حوالے اور ان سے استفادے کے بغیر ممکن نہ ہو گا۔

علامہ اقبال سے مولانا مہر کے ذہنی اور بالمشافہ روابط کی مدت کم و بیش تین دہائیوں پر مشتمل تھی، لیکن اس مدت میں تقریباً" دس سال کا عرصہ انھیں علامہ کی صحبت میں قریب قریب روزانہ گزارنے کا موقع ملتا رہا۔ پھر ۱۹۳۱ء میں مولانا مہر جب دوسری گول میز کانفرنس اور بیت المقدس میں موتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے موقع پر سفر کے دوران لندن گئے، تو وہاں سے بیت المقدس اور پھر وطن واپسی تک شب و روز انھیں علامہ کی صحبت نصیب رہی۔ اس سفر کی روداد، جو اولا" "انقلاب" میں شائع ہوئی تھی، اس میں سے علامہ اقبال کے متعلق سفر کے حالات و تفصیلات اخذ کر کے کچھ عرصہ قبل "سفر نامہ

اقبال" کے نام سے محمد حمزہ فاروقی نے مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ خود مولانا مہر نے علامہ سے اپنی نسبتوں اور صحبتوں کا ذکر متعدد مقامات پر' بالخصوص اپنے مکاتیب اور مضامین میں کیا ہے۔

اقبالیات کے ضمن میں مولانا مہر کا کام خاصہ متنوع ہے۔ اقبال کی فکر اور شاعری پر ان کے متعدد مضامین اس بالواسطہ اثر پذیری کا ایک نمونہ ہیں جو علامہ سے ان کی صحبتوں کا نتیجہ تھی۔ اس لحاظ سے مولانا مہر کی تحریر کردہ کلام اقبال کی شرحیں علامہ کی شاعری کے اسرار و رموز کی بالمشافہ تفہیم و تعبیر کے ذیل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اسی لیے مولانا مہر اور عبدالحمید سالک کی زیر ادارت روزنامہ "انقلاب" میں اقبال کی زندگی' شخصیت اور فکر و فن پر شائع شدہ تحریریں اقبالیات کے ضمن میں بنیادی ماخذ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اقبال کی بعض نظموں کے متون اور ان کے زمانہ نزول کے بارے میں مولانا مہر کی وہ یادداشتیں' جن کا اندازہ مولانا مہر کے مرتبہ کلام اقبال "سرود رفتہ" اور دیگر مضامین سے ہوتا ہے' --- اپنی جگہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔

زیر نظر کتاب مولانا مہر کی ان تحریروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے وقتاً" فوقتاً" اقبال کی شخصیت' شاعری اور فکر و فن اور اقبال سے اپنے روابط کے تعلق سے قلم بند کی تھیں۔ یہ ایک مفید منصوبہ تھا' جسے اقبالیات میں ایک گوناگوں اضافہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے لیے مرتب امجد سلیم علوی کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ لیکن اسے مولانا مہر کے تعلق سے اسی ایک کتاب کی حد تک مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ اسے اقبالیات مہر کی ایک جلد قرار دینا چاہیے۔ ابھی اس میں اضافے کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ ایسے مزید مستقل مضامین تلاش کیے جا سکتے ہیں' جو اس جلد میں شامل نہیں کیے جا سکے۔ مثلاً" "القرآن" (لائل پور)

کے ''اقبال نمبر'' میں مولانا مہر کا مضمون ''اقبال کا فقر'' جو فاضل مرتب کی نظر سے شاید اوجھل رہا۔ محمد حمزہ فاروقی کا مذکورہ سفرنامہ بھی ایسی ہی ایک مثال ہے، جس کی رودادیں یا ان کا حوالہ اور اندراج اقبالیات مہر کے ضمن میں ضروری ہے۔ اسی طرح محمد حمزہ فاروقی نے حال میں ''حیات اقبال کے چند مخفی گوشے'' کے نام سے جو ضخیم مجموعہ مرتب کیا ہے، وہ روزنامہ ''انقلاب'' میں اقبال کی شخصی، سماجی، سیاسی زندگی، شاعری اور فکر اور دیگر متنوع موضوعات پر شائع شدہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ان تحریروں میں مولانا مہر کے تحریر کردہ اداریوں شذروں، رودادوں وغیرہ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ تحقیق کے بعد مولانا مہر کی تحریر کردہ ایسی تمام تحریریں مزید جلدوں میں مرتب کی جانی چاہییں۔ زیر نظر جلد میں کم از کم ایک ایسا اشاریہ بھی مرتب ہو جانا چاہیے تھا جس سے اندازہ ہو سکتا کہ مولانا مہر نے اقبالیات کے ضمن میں کیا کیا تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن ان معروضات سے قطع نظر ''اقبالیات'' مفید اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے اقبال کے دیگر ہم نشینوں اور ہم صحبت اہل قلم کی اقبال کے حوالے سے مستقل تحریروں کو یکجا کرنے کی تحریک پیدا ہو گی اور اس طرح اقبالیات میں نئے اور مفید گوشوں کا اضافہ ہو سکے گا۔

نوادراتِ ادب

ڈاکٹر معین الدین عقیل

الوقار پبلی کیشنز
۵۰- لوئر مال لاہور

۳۶۲

جہاتِ جہدِ آزادی

معین الدین عقیل

الوقار پبلی کیشنز
۵۰- لوئر مال لاہور

الوقار پبلیکیشنز کی اہم مطبوعات

(۵۰-لوئر مال لاہور)

۱- مجموعہ تنقیدات از : پروفیسر آل احمد سرور	مرتبہ : عاصمہ وقار		۶۵۰/-
۲- نقد غالب	مرتبہ : پروفیسر مختارالدین احمد		۲۵۰/-
۳- کلیات ولی	مرتبہ : پروفیسر نورالحسن ہاشمی		۳۲۵/-
۴- کلیات ممنون	مرتبہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان		۴۳۰/-
۵- اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	از : ڈاکٹر حنیف کیفی		۴۳۰/-
۶- نقد عبدالحق	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۲۹۰/-
۷- بابائے اردو' خدمات اور فرمودات	از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۲۹۵/-
۸- لطائف غیبی' از غالب	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۹۰/-
۹- غزل' غالب اور حسرت' از :رشید احمد صدیقی مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن			۱۲۰/-
۱۰- نقوش غالب	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۲۸۰/-
۱۱- دیوان غالب (نسخہ خواجہ)	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۴۵۰/-
۱۲- بازیافت غالب	از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۱۹۵/-
۱۳- فورٹ ولیم کالج' از : پروفیسر سید وقار عظیم مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن			۱۸۰/-
۱۴- تحقیق نامہ غالب	مرتبہ : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۳۵۰/-
۱۵- غالب پیمائی	از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۲۸۰/-
۱۶- اردو ڈرامہ --- تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ	از : پروفیسر سید وقار عظیم		۳۹۵/-

محمد اقبال مجددی

۱۷-انجمن پنجاب کے مشاعرے	از : عارف ثاقب	۲۹۰/-
۱۸- بیسویں صدی کے منتخب افسانے	مرتبہ : ڈاکٹر معراج نیر	۲۸۰/-
۱۹- بیسویں صدی کے بیس افسانے	مرتبہ : ڈاکٹر معراج نیر	۲۸۰/-
۲۰-اب دریچوں کو نہ بند رکھنا کبھی (شاعری)	از : جمیل صبا	۱۲۰/-
۲۱- اقبال سب کے لئے	از : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۳۸۰/-
۲۲-اردو نثر کا فنی ارتقاء	از : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۲۹۵/-
۲۳- اردو شاعری کا فنی ارتقاء	از : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۳۹۵/-
۲۴-خود نوشت اور تنقید خود نوشت	مرتبہ : ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۲۱۰/-
۲۵- پاکستانی زبان وادب	از : ڈاکٹر معین الدین عقیل	۳۲۵/-
۲۶-نوادرات ادب	از : ڈاکٹر معین الدین عقیل	۲۹۵/-
۲۷-جہات جہد آزادی	از : ڈاکٹر معین الدین عقیل	۲۲۰/-
۲۸- تنہا چاند (پروین شاکر فکر و فن)	از : عالیہ جلیل شاہ	۱۸۰/-
۲۹-غالب شناسی اور نیاز و نگار	مرتبہ : ڈاکٹر سلیم اختر	۲۶۰/-
۳۰-اقبال شناسی اور نیاز و نگار	مرتبہ : ڈاکٹر طاہر تونسوی	۲۲۰/-
۳۱-ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار	مرتبہ : ڈاکٹر طاہر تونسوی	۱۹۵/-
۳۲-نظیر حسنین کی علمی اور ادبی خدمات	از : سعدیہ ناز	۱۸۰/-
۳۳-اعتبارات (شعری تنقید)	از : ڈاکٹر نیر صمدانی	۱۹۵/-
۳۴-تقاریر سربراہان پاکستان (اولین خطبات)	مرتبہ : لیاقت علی چوہدری	۱۳۰/-
۳۵-مکتوبات اقبال (بنام چوہدری محمد حسین)	مرتبہ : پروفیسر ثاقف نفیس	۹۰/-
۳۶-مہک (شعری مجموعہ)	از : ڈاکٹر وسیم کتان	۳۰۰/-
۳۷-ادبی جائزے	از : پروفیسر نظیر صدیقی	۱۵۰/-
۳۸- درد کا سورج (شعری مجموعہ)	از : ڈاکٹر محمد خاں اشرف	۱۰۰/-
۳۹- رومانویت اور ادب میں رومانوی تحریک	از : ڈاکٹر محمد خاں اشرف	۱۹۵/-
۴۰-غالبیات جہات و جستجو	از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	
۴۱-غالب آشنائی	از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	

ڈاکٹر مُعین الدین عقیل کی چند علمی و ادبی کُتب :

- "کلام رنجور عظیم آبادی" (رنجور عظیم آبادی کے نادر و غیر مطبوعہ کلام کی اولین اشاعت) مطبوعہ : پٹنہ (بھارت)
- "بیتی کہانی" (اُردو کی اولین نسوانی خودنوشت)، مطبوعہ : حیدر آباد
- "پاکستان میں اُردو تحقیق : معیار اور موضوعات"، مطبوعہ : کراچی
- "پاکستان میں اُردو اَدب : محرکات اور رجحانات کا تشکیلی دور"، مطبوعہ : کراچی
- "کلامِ نیرنگ" (میر غلام بھیک نیرنگ کے حالات و کلام)، مطبوعہ : کراچی
- "پاکستان میں اُردو غزل"، مطبوعہ : رانچی (بھارت)
- "اقبال اور جدید دُنیائے اسلام : محرکات، رجحانات اور مسائل"، مطبوعہ : لاہور
- "تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ"، مطبوعہ : کراچی
- "مسلمانوں کی جدوجہد آزادی : محرکات، رجحانات اور مسائل"، مطبوعہ : لاہور
- "دکن اور ایران : سلطنت بہمنیہ اور ایران کے علمی و تمدنی روابط"، مطبوعہ : کراچی
- "ایک نادر سفرنامہ : دکن کے اہم مقامات کے احوال و کوائف"، مطبوعہ : کراچی
- "تحریکِ آزادی اور مملکت حیدر آباد"، مطبوعہ : کراچی
- "تحریکِ پاکستان کا تعلیمی پس منظر"، مطبوعہ : لاہور

الوقار پبلی کیشنز
۵۰- لوئر مال لاہور

پاکستانی زبان و ادب

مسائل و مناظر

ڈاکٹر مُعین الدین عقیل